تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

928.9549 Zikria, Dr. Khawaja Mohammad
Akbar Al'h Aabadi : Tehqiqi-o-
Tanqidi Motal'a / Dr. Khawaja
Mohammad Zikria.- Lahore : Sang-e-
Meel Publications, 2003.
391p.
1. Sawaneh. 2. Urdu Adab -
History. I. Title.

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ سنگ میل پبلی کیشنز/مصنف سے باقاعدہ
تحریری اجازت کے بغیر کہیں بھی شائع نہیں کیا جا سکتا اگر اس قسم کی
کوئی بھی صورتحال ظہور پذیر ہوتی ہے تو قانونی کارروائی کا حق محفوظ ہے

2003.
نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
سے شائع کی۔

ISBN 969-35-0512-3

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall) P.O. Box 997 Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 7220100-7228143 Fax: 7245101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com
Chowk Urdu Bazar Lahore. Pakistan. Phone 7667970

زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور

ترتیب

پیش لفظ

انگریزوں کی حکومت برصغیر پر تقریباً دو سو سال تک رہی - اس عرصے میں کیا کچھ نہیں ہوا: حکومت گئی، خوشحالی رخصت ہوئی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خود اعتمادی جاتی رہی - ایک طرف انگریزوں کی طاقت تھی، دوسری طرف پروپیگنڈہ اور تیسری طرف پالیسی - اس سہ طرفہ حملے نے برصغیر کے باشندوں کو پہلے لوٹا مارا، پھر نگاہوں کو خیرہ کیا اور آخر میں ذہنوں کو مسخر کرلیا - نتیجہ یہ ہوا کہ اب لوگ تھے اور یورپ کی قصیدہ خوانی --- یورپ نے دنیا کو تہذیب سکھائی ہے، نئی ایجادات نے انسانی زندگی کے مصائب کم کر دیے ہیں اور جدید علوم نے ذہنوں کو جلا بخشی ہے وغیرہ وغیرہ - چنانچہ لوگ یہ سمجھنے لگے کہ اگر انگریز ہندوستان میں نہ آتے تو ہم قرون مظلمہ میں زندگی بسر کر رہے ہوتے - سڑکیں، ریلیں، تار برقی اور ٹیلیفون وغیرہ ہماری زندگیوں میں داخل نہ ہوتے تو ہماری حالت کتنی قابل رحم ہوتی!

یہ سب دلائل تصویر کا ایک رخ ہیں، اور چونکہ لوگوں کو سرسری نظر سے دیکھنے پر اکبر کے ہاں ان چیزوں کا خاکہ اڑایا ہوا نظر آتا ہے اس لیے وہ سمجھتے ہیں کہ اکبر نئی ایجادات کی مخالفت کے مجرم ہیں، گویا رجعت پسند اور زمانے کے خلاف چلنے والے ہیں - یہی بعض نقادوں کے نزدیک اکبر کا المیہ ہے مگر یہ المیہ اتنا اکبر کا نہیں جتنا ان نقادوں کا ہے - انہوں نے اپنی نصابی کتابوں میں یہی کچھ پڑھا تھا کہ انگریزی حکومت کے ثمرات بے پناہ ہیں، اور آج تک اسی کی تکرار کرتے چلے جاتے ہیں - حاکم قوموں کے مزاج سے واقف ہیں اور نہ محکوموں کی نفسیات سے آگاہ لیکن خفا ہوتے ہیں اکبر پر -

انگریزوں نے برصغیر میں وہی کچھ کیا جو فاتح کیا کرتے ہیں - بقول کارلائل ایک قوم دوسری قوم پر صرف اپنے مفادات کے حصول کی غرض سے حکومت کیا کرتی ہے - چنانچہ انگریز بھی اس قاعدے سے مستثنیٰ نہیں تھے - انہوں نے جی بھر کر استحصال کیا، بے شمار دولت سمیٹی، ہندوستان کی

صنعت وحرفت کو تباہ کیا' حتیٰ کہ ڈھاکے میں ململ بنانے والے بافندوں کے انگوٹھے کاٹ ڈالے- غرض اس خوش حال ملک کو بالکل کنگال کر دیا- استحصال کے بعد حکمت عملی کا دور شروع ہوا- لوگوں کو تعلیم دی گئی مگر سائنس اور ٹیکنالوجی کی مفید تعلیم نہیں بلکہ آرٹس کی تعلیم جس سے لوگ ملازمتیں تو حاصل کر سکتے تھے مگر ملک اور قوم کے لیے زیادہ مفید نہیں ہو سکتے تھے-

یہ سچ ہے کہ ہندوستان میں انگریزوں نے سڑکیں بنائیں' ریل کی پٹڑیاں بچھائیں' تار برقی کا سلسلہ جاری کیا وغیرہ' مگر ان سب ''برکات'' کے اصل مقاصد کچھ اور ہی تھے- ضمناً لوگوں کو کچھ سہولتیں بھی میسر آ گئیں- درحقیقت یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ ہندوستان کے طول وعرض سے خام مال تیز رفتاری سے بندرگاہوں تک منتقل کیا جا سکے- اس کے علاوہ بغاوت کی صورت میں یا جنگ کے زمانے میں افواج اور اسلحے کی نقل وحمل اور رابطے میں آسانی ہو- اگر یہ سب عوام کے فائدے کے لیے ہوتا تو سڑکوں اور ریلوں کے اس وسیع نظام کے باوجود قحطوں سے اتنے لوگ نہ مرتے- ریلیں اور سڑکیں اگر انسانی جانوں کا اتلاف نہیں روک سکتیں تو بیکار محض ہیں-

یہ سوچ کس قدر غلط ہے کہ انگریز ہندوستان کے حکمران نہ بنتے تو نئی ایجادات یہاں نہ آتیں- آخر یہ ایجادات ان ملکوں میں بھی تو پہنچ گئی تھیں جہاں انگریز کبھی حکمران نہیں ہوئے تھے- یہ درست ہے کہ یورپ سائنس اور ٹیکنالوجی میں بہت ترقی کر گیا تھا لیکن اس ترقی سے مستفید ہونے کا صحیح طریقہ یہ تھا کہ ہم یہ ہنر سیکھتے اور خود ان ایجادات پر دسترس حاصل کرتے مگر ہم نے قومی عزت ووقار کے منافی طریقہ اختیار کیا- سیکھا تو کچھ نہیں البتہ چند افراد بزور زر ان اشیاء کو تصرف میں لانے لگے- اکبر کہتے ہی رہ گئے:

عزم کر تقلید مغرب کا ہنر کے زور سے
لطف کیا جو لد لیے موٹر پہ زر کے زور سے
غیر ملکوں میں ہنر کو سیکھ' تکلیفیں اٹھا
روکتے ہیں وہ اگر اپنے اثر کے زور سے

کیا یہ جدید ایجادات کی مخالفت ہے؟ جی نہیں- یہاں تو زوردار طریقے سے اس بات کی وکالت کی گئی ہے کہ ''صاحب'' کا ہنر سیکھو' البتہ یہ کہا گیا ہے کہ محض لباس اور بنگلے میں ان کی نقالی نہ کرو- کیا اس سے زیادہ صحیح کوئی اور نظریہ ہو سکتا تھا؟ مگر قوم ''صاحب'' کے ہنر کو حاصل کرنے کی بجائے اس کی نقالی پر مستعد ہو گئی- اکبر کے تیس چالیس سال بعد اقبال نے بھی وہی کچھ کہا جو اکبر پہلے کہہ چکے تھے:

شرق را از خود برد تقلیدِ غرب
باید ایں اقوام را تنقید غرب
محکمی او را نہ از لادینی است
نے فروغش از خطِ لاطینی است
قوتِ افرنگ از علم و فن است
از ہمیں آتش چراغش روشن است
حکمت از قطع و بریدِ جامہ نیست
مانعِ علم و ہنر عمامہ نیست
علم و فن را اے جوانِ شوخ و شنگ
مغز می باید نہ ملبوسِ فرنگ

مگراس کے باوجود اکبر رجعت پسند قرار دیے گئے ؎

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبیست

نقطۂ نظر کی یہی غلطی اکبر کے بیشتر نقادوں کے ہاں موجود ہے- اکثر نے اکبر کو تعمق نظر سے پڑھا ہی نہیں بس مزاحیہ اسلوب سے گمراہ ہوگئے ہیں جو بدقسمتی سے اکبر کی مجبوری تھی کہ انگریزوں کے انتہائی جبروت کے اس دور میں ان پر براہ راست وار کرنا ممکن نہیں تھا- یہ زمانہ وہ تھا جب کانگرس کا وجود تھا' نہ مسلم لیگ کا- گاندھی تھے' نہ شوکت علی و محمد علی:

نشان شوکت و گاندھی کجا بود
کہ اکبر صرفِ کشفِ ماجرا بود

اس لیے اس زمانے میں بیسویں صدی کا سا باغیانہ لہجہ اختیار کرنا کسی کے بس میں نہ تھا- سرسید جیسے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ انگریزوں کی مخالفت کرنا ''ہیجڑوں کی طرح تالیاں بجانے'' کے مترادف ہے مگر اکبر نے لوگوں کو متنبہ کرنے کا ایک عمدہ طریقہ سوچا' اگرچہ قوم نے اسے ہنسی مذاق ہی سمجھا اور اب تک سمجھ رہی ہے- غرض اکبر کی شاعری مقصدی تھی- سنجیدہ اور اہم مقاصد کی حامل- مثلاً انگریزوں کی معاشرتی نقالی سے قوم کو باز رکھنا' ان کے ہنر سیکھنے پر مائل کرنا اور احساس کمتری دور کر کے خود اعتمادی حاصل کرنا وغیرہ وغیرہ- مگر جب مرض کو مرض ہی تصور نہ کیا جاتا ہو تو علاج کی طرف کون توجہ دے سکتا ہے؟ لوگ تھے کہ انگریزی لباس اور سامانِ آرائش پر مٹے جاتے تھے:

ہم کو سائے پر جنوں، وہ دھوپ میں مصروف کار
مس پہ ہے اپنی نظر اور سیم ان کے ہاتھ میں

اکبر نے آج سے پون صدی پہلے جن امراضِ قومی کی نشان دہی کی تھی وہ اب بھی بدستور موجود ہیں - وہی تعلیم کا انداز ہے، وہی کلرک سازی کے کارخانے ہیں، وہی مغرب کی نقالی ہے اور وہی ہنر سیکھنے سے غفلت ہے - یہی وجہ ہے کہ حصولِ آزادی کے بعد بھی ہم دنیا میں کوئی اہمیت اور حیثیت حاصل نہیں کر سکے -- معیشت کا انحصار دوسروں پر ہے اور معاشرت میں تقلید عام ہے - اکبر آج بھی کہہ رہا ہے:

لطف کیا جو لد لیے موٹر پہ زر کے زور سے

لیکن کون سنتا ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ ہم ذہنی طور پر اب بھی مغرب کے غلام ہیں - اکبر جس قدر راہم اپنے دور میں تھا اتنا ہی آج بھی ہے کیونکہ ہمارے قومی امراض اب تک وہی ہیں - اکبر کی اہمیت اس سے زیادہ ہے - وہ اپنے دور کی تاریخ بھی ہے - بقول رشید احمد صدیقی:

> ''انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز (تقریباً پچاس سال تک) کی ہماری پوری داستان: حوصلہ و ہوس کی، الفت و آویزش کی، پیش قدمی و پسپائی کی، شور و سکوت کی اور سود و زیاں کی اکبر کی شاعری میں جلوہ گر ہے - کہیں خفی، کہیں جلی، کہیں شگفتہ، کہیں حزیں، لیکن ہر جگہ دلنشیں - اس عہد کے سیاسی شعور کو سمجھنے کے لیے اکبر کے کلام سے ہر طرح کی مدد لی جا سکتی ہے - شاید اتنی قیمتی مدد کہیں اور سے حاصل بھی نہیں ہو سکتی -''

اکبر پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے مگر ڈھنگ کی چیزیں بہت کم ہیں - نظریاتی اختلافات سے قطع نظر بیشتر نقاد اپنے نقطۂ نظر کو ثابت کرنے کے لیے کلام اکبر کی زمانی ترتیب کا بھی لحاظ نہیں رکھتے اور تقدیم و تاخیر کر کے اپنی بات ثابت کر ڈالتے ہیں - بہت سے حضرات مزاحیہ اشعار کو یوں سمجھنا سمجھانا چاہتے ہیں گویا یہ سنجیدہ کلام ہے - جہاں اکبر نے اپنا نام لے کر کسی پر طنز کی ہے اسے اکبر ہی کے خلاف استعمال کیا گیا ہے - غرض عجیب و غریب تنقیدی مضامین دیکھنے میں آئے - اس انبار میں پروفیسر رشید احمد صدیقی اور عبدالماجد دریابادی کے مضامین بسا غنیمت ہیں - میں نے اکبر کے ذہنی پس منظر کے بعد ان کے نظریات کی اہم کڑیوں کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے - اس سے میرا مقصد بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ اکبر کو صحیح تناظر میں رکھ کر سمجھا سمجھایا جائے - اکبریات کے تحقیقی پہلو بھی

کچھ کم الجھن کا باعث نہیں تھے- تاریخ پیدائش، ملازمتیں، ریٹائرمنٹ، خطاب خان بہادری غرض اس طرح کی کئی سوانحی تفصیلات اختلافات کا شکار تھیں- ان تمام تناقضات کو دور کرنے کی حتی المقدور سعی کی گئی ہے-

دوران تحقیق اکبر پر بہت سا نیا مواد ملا- نیشنل میوزیم کراچی سے اکبر کے تقریباً دو ہزار غیر مطبوعہ مکاتیب اور بعض متفرق تحریریں دستیاب ہوئیں- اکبر کے پوتے جناب سید محمد مسلم رضوی نے بھی بعض نایاب دستاویزات دکھائیں- اکبر کے مضامین کچھ تو ''علی گڑھ میگزین'' کے ''اکبر نمبر'' اور کچھ انتخابات ''اودھ پنچ'' سے حاصل ہوئے- تقریباً بیس مضامین ''اودھ پنچ'' کی فائلوں سے ملے- رسالہ ''زمانہ'' اور ''مخزن'' وغیرہ سے بھی اکبر کے کچھ تنقیدی مضامین ہاتھ آئے- اس طرح پینتالیس مضامین اکٹھے ہو گئے ہیں- ان سے مضامین اکبر کا ایک دلچسپ مجموعہ مرتب ہو سکتا ہے-

آخر میں کچھ بزرگوں اور دوستوں کا شکریہ مجھ پر واجب ہے- یہ کتاب بنیادی طور پر میرا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے- نگران مقالہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار صاحب نے بدقت نظر سارا مسودہ دیکھا تھا- ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر سہیل بخاری (مرحوم) احسان دانش (مرحوم) پروفیسر قیوم نظر (مرحوم) اور مشفق خواجہ نے متعدد امور میں بہت مفید مشورے دیے تھے- محمد حیات سیال (مرحوم) رفیع الدین ہاشمی، اکرام چغتائی، یونس جاوید، چوہدری محمد صدیق، حنیف شاہد، محمد شفیع (سابق لائبریرین گورنمنٹ کالج لاہور) نے فراہمی کتب میں بہت مدد کی تھی میں ان سب کا شکر گزار رہوں گا-

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن مجلس ترقی ادب لاہور نے شائع کیا تھا اس میں طباعت کی متعدد اغلاط رہ گئی تھیں- دوسرا ایڈیشن سنگ میل پبلشرز نے چھاپا- چونکہ وہ ''مجلس'' ہی کے نسخے کا عکس تھا اس لیے اس میں بھی تمام اغلاط اسی طرح موجود تھیں- اب یہ ایڈیشن نظر ثانی اور تصحیح اغلاط کے بعد شائع ہو رہا ہے- ضخامت بھی کچھ کم کر دی گئی ہے- اشعار کی متعدد مثالیں خارج کر دی گئی ہیں- مجھے توقع ہے کہ اب یہ کتاب پہلے سے کچھ زیادہ مفید ثابت ہوگی-

خواجہ محمد زکریا

سابق پرنسپل پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور-

۲۵ ستمبر ۲۰۰۲ء

باب اول

حالات زندگی

خاندان

اکبر سید گھرانے کے فرد تھے۔ ان کا شجرۂ نسب محفوظ ہے۔(۱) ان کا سلسلہ نسب چھپن واسطوں سے سیدنا امام رضا تک پہنچتا ہے ان کا خاندان عرب سے ایران میں آباد ہوا۔ وہاں سے ان کے ایک بزرگ، جن کا نام سید علی عرب تھا اور جو نیشاپور میں رہتے تھے، ۱۲۴۴ع میں (جو سلطان شمس الدین التمش کے دور حکومت کا آخری سال ہے) وارد ہند ہوئے۔(۲) ہندوستان میں وہ کہاں مقیم ہوئے؟ اس بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ اکبر کے پردادا میر محمد زمان ضلع سیتاپور میں رہتے تھے اور فوج میں صوبے دار تھے۔(۳) میر محمد زمان کے بیٹے سید فضل محمد، داؤد نگر ضلع گیا میں آباد تھے۔(۴) غالباً وہ زمیندار تھے۔ ان کے بھائی فضل الدین احمد زیادہ مشہور تھے۔ وہ صدر دیوانی کلکتہ میں رئیسوں کے مقدمات کی پیروی کیا کرتے تھے۔ جب صدر دیوانی کلکتہ سے الہ آباد منتقل ہوئی تو وہ بھی الہ آباد چلے گئے۔ ان کی وجہ سے سارا خاندان الہ آباد میں بس گیا۔(۵)

سید فضل محمد (اکبر کے دادا) کے تین بیٹے تھے: واصل علی، وارث علی اور تفضل حسین(۶) وارث علی سورام ضلع الہ آباد میں تحصیلدار رہے۔(۷) واصل علی کے بارے میں کچھ معلومات نہیں ہیں۔ تفضل حسین علم و فضل میں ممتاز، درویش صفت اور صوفی منش تھے۔ ابتدا میں نائب تحصیلدار تھے، بعد میں ملازمت ترک کر دی تھی۔(۸)

اکبر کے خاندان کے افراد کو دنیوی شان و شکوہ حاصل تھا۔(۹) جاگیرداری بھی تھی اور عہدے بھی، اس زمانے میں یہ دونوں چیزیں بہت کم لوگوں کو حاصل تھیں۔ ان کے بزرگوں کو تحصیل علم کا شوق تھا۔ سید تفضل حسین عربی اور فارسی کے عالم تھے۔ اس کے علاوہ ریاضی میں مہارت رکھتے تھے(۱۰) اور تصوف سے لگاؤ۔ وہ اپنے والد سید فضل محمد کے شیعہ عقائد کو چھوڑ کر سنی ہو گئے تھے۔ ان کا انتقال شعبان ۱۳۰۳ھ مطابق مئی ۱۸۸۵ع

میں ہوا۔ اس وقت اکبر کی عمر چالیس برس تھی۔(۱۱)

ان کے خاندان کا شجرہ میر محمد زمان سے اکبر تک یوں بنتا ہے:

میر محمد زمان

سید فضل محمد　　　　سید فضل الدین احمد

واصل علی　　وارث علی　　تفضل حسین

اکبر حسین　　(اکبر الہ آبادی)　　اکبر حسن

اکبر کی پیدائش

سید تفضل حسین کے دو بیٹے ہوئے۔ بڑے بیٹے اکبر حسین (جو اس مقالے کا موضوع ہیں) اور چھوٹے بیٹے اکبر حسن۔(۱۲) اکبر حسین۔ جو اکبر الہ آبادی کے نام سے مشہور ہیں، ۱۲۶۱ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کا سال پیدائش بالاتفاق یہی ہے اور اس کے قطعی ثبوت بھی موجود ہیں۔ ان کے فرزند عشرت حسین کے بقول ان کا تاریخی نام خورشید عالم تھا۔(۱۳) حسن نظامی نے ان لفظوں میں اس تاریخی نام کی تصدیق کی ہے:

"خورشید عالم نام کا حضرت اکبر نے مجھ سے بھی ذکر فرمایا تھا اور کہا تھا کہ تاریخ ایسے آدمی سے نکلوانی چاہیے جو ذی علم اور ذی فہم ہونے کے ساتھ ہمدرد بھی ہو۔"(۱۴)

"خورشید عالم" سے حروف ابجد کے حساب سے بارہ سو اکسٹھ اعداد برآمد ہوتے ہیں۔(۱۵)

عشرت حسین نے مزید لکھا ہے:

"۱۲۶۱ھ ہفتے کے دن، عید کے مہینے میں ـــــ حضرت قبلہ کی ولادت ہوئی۔"(۱۶)

اس جملے میں دو باتیں بالخصوص توجہ طلب ہیں۔ اول یہ کہ عید کے مہینے سے کیا مراد ہے؟ شوال یا ذوالحجہ۔ چونکہ عید الفطر ہی کو عام طور پر بغیر کسی سابقے یا لاحقے کے عید کہا جاتا ہے، جبکہ عید قربان کی تخصیص عیدالاضحیٰ وغیرہ کے اضافے سے کی جاتی ہے، اس لیے ماہ شوال کو ماہ ولادت سمجھنا چاہیے۔ دوم یہ کہ ہفتے کا دن یوم پیدائش تھا مگر ایک ماہ میں عموماً چار ہفتے آتے ہیں، اس لیے یہ شوال کا کون سا شنبہ (ہفتہ) تھا؟ یہ اندازہ لگانا ممکن نہیں۔ کیونکہ کسی سوانح نگار نے اس کی وضاحت نہیں کی۔ گویا اکبر کی تاریخ پیدائش تو

معلوم نہیں، البتہ یوم پیدائش ہفتہ، شوال کا مہینہ اور سال ۱۲۶۱ھ تھا۔
اب سوال یہ ہے کہ سنہ عیسوی کے حساب سے سال پیدائش کیا بنتا ہے؟ اصل دقت یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ اب تک جتنی تحریریں اس سلسلے میں موجود ہیں وہ متفقہ طور پر ۱۸۴۶ء عیسوی کو سال پیدائش قرار دیتی ہیں۔ بعض تحریروں میں تاریخ اور مہینے کا بھی تعین کر دیا گیا ہے اور ۱۶ نومبر ۱۸۴۶ء کو اکبر کی پیدائش کا دن قرار دیا گیا ہے۔ مثالیں :

"حیات اکبر۔" کے حاشیئے میں ملا واحدی نے ۱۶ نومبر ۱۸۴۶ء لکھا ہے۔(۱۷)
"روح اکبر" مصنفہ عبدالجلیل : "سید اکبر حسین قصبہ بارہ میں ۱۶ نومبر ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے۔"(۱۸)
"تاریخ ادب اردو" مترجمہ (سکسینہ) محمد عسکری : "۱۶ نومبر ۱۸۴۶ء تاریخ ولادت ہے۔"(۱۹) "ہسٹری آف اردو لٹریچر" : محمد صادق :

"Born in Bara, 16th November 1846." (۲۰)

سید بشیر حسین "علی گڑھ میگزین" کے "اکبر نمبر" میں لکھتے ہیں : "حضرت اکبر ۱۶ نومبر ۱۸۴۶ء کو بمقام بارہ ضلع الہ آباد عالم وجود میں آئے۔(۲۱) ان کے علاوہ متعدد کتابوں میں تاریخ اور مہینہ تو نہیں لکھا گیا مگر سال پیدائش ۱۸۴۶ء ہی قرار دیا گیا ہے، مثلاً مندرجہ ذیل کتابوں میں :

"لسان العصر اکبر الہ آبادی" مصنفہ اصغر حسین نظیر لدھیانوی۔(۲۲) "بزم اکبر" مصنفہ قمرالدین بدایونی۔(۲۳) "تاریخ ادبیات پنجاب یونیورسٹی"(۲۴) "فرہنگ عامرہ" مرتبہ عبداللہ خویشگی(۲۵)، "گل رعنا" مصنفہ عبدالحی(۲۶) وغیرہ۔ صرف ایک کتاب یعنی "اکبر الہ آبادی" مصنفہ طالب الہ آبادی میں سال پیدائش ۱۸۴۰ء تحریر کیا گیا ہے۔(۲۷) مگر یہ کتابت کی غلطی ہے کیونکہ چند صفحات کے بعد مصنف نے ۱۸۴۶ء کو سال ولادت تسلیم کیا ہے۔(۲۸)

گویا ان تمام مصنفین نے یہ باتیں تسلیم کی ہیں کہ (الف) اکبر شوال کے مہینے میں ہفتے کے روز ۱۲۶۱ھ کو پیدا ہوئے۔ (ب) عیسوی کے حساب سے ان کی تاریخ پیدائش ۱۸۴۶ء ہے۔ مگر تعجب اس بات پر ہے کہ کسی لکھنے والے نے یہ نہیں دیکھا کہ ہجری اور عیسوی سنین میں مطابقت بھی ہے یا نہیں؟ میں نے جب سال ہجری کو عیسوی میں تبدیل کیا تو معلوم ہوا کہ شوال ۱۲۶۱ھ عیسوی کے حساب سے اکتوبر ۱۸۴۵ء بنتا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے :

یکم محرم ۱۲۶۲ھ = ۳۰ دسمبر ۱۸۴۵ء۔
یکم ذوالحجہ ۱۲۶۱ھ کو = ۳۰ نومبر ۱۸۴۵ء (تقریباً)۔
یکم ذیقعدہ ۱۲۶۱ھ کو = ۳۰ اکتوبر ۱۸۴۵ء (تقریباً)۔
یکم ذیقعدہ ۱۲۶۱ھ کو = یکم اکتوبر ۱۸۴۵ء (تقریباً)۔
یکم شوال ۱۲۶۱ھ کو = یکم اکتوبر ۱۸۴۵ء (تقریباً)۔

اکبر کی پیدائش چونکہ شوال کے مہینے میں ہوئی اور ۱۲۶۱ھ میں شوال اور اکتوبر کے مہینے تقریباً ساتھ ساتھ چلتے رہے اس لیے اکتوبر ۱۸۴۵ عیسوی اکبر کا ماہ و سال ولادت ہوا۔(۲۹) غالباً نومبر ۱۸۴۶ء غلط عمل تقویم کا نتیجہ ہے۔ مگر تعجب اس بات پر ہے کہ جب شوال کی صحیح تاریخ معلوم ہی نہیں تو نومبر کی کوئی قطعی تاریخ کس طرح متعین کر لی گئی؟

بعض شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ خود اکبر ۱۸۴۵ء ہی کو اپنا سال ولادت قرار دیتے تھے۔ مثلاً "کلیات اکبر" جلد اول (جو اکبر کی زیر نگرانی شائع ہوئی) میں دور اول کی غزلیات سے پہلے یہ عبارت لکھی ہے: "دور اول ۱۸۶۲ء تا ۱۸۷۵ء (سترہ سے تیس سال عمر تک کی غزلیں)"

یعنی ۱۸۶۲ء میں ان کی عمر سترہ سال تھی۔ اس لحاظ سے ان کا سال پیدائش ۱۸۶۲ء نفی ۱۷ = ۱۸۴۵ عیسوی بنتا ہے۔ اسی طرح ۱۸۷۵ء میں اگر عمر تیس سال ہو تو بھی سال ولادت ۱۸۷۵ء نفی ۳۰ = ۱۸۴۵ء نکلتا ہے۔

۱۸۴۵ء کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ عشرت حسین (جو اکبر کے بعد سنین اکبر کے سلسلے میں سب سے زیادہ مستند ہیں) لکھتے ہیں: شروع ۱۸۵۹ء میں جب بنسن نامی مجسٹریٹ نے ایک واقعے کے بعد انہیں ملازمت دی، ان کی عمر چودہ سال تھی۔(۳۰) ۱۸۵۹ء میں سے چودہ گھٹائے جائیں تو ۱۸۴۵ء حاصل ہوتا ہے۔

اب تک ہمیں صرف ایک حوالہ ایسا مل سکا ہے جس میں اکبر کا سال ولادت ۱۸۴۵ء قرار دیا گیا ہے۔ سر عبدالقادر لکھتے ہیں:

"Born at Bara in the U. P in 1845" (۳۱)

اس حوالے کو دوسرے حوالوں پر اس وجہ سے فوقیت حاصل ہے کہ سر عبدالقادر کے اکبر سے گہرے مراسم تھے۔ نیشنل میوزیم کراچی سے سر عبدالقادر کے دو خطوط بنام اکبر مجھے ملے ان میں سے ایک خط میں انہوں نے اپنی محولہ بالا کتاب کے لیے اکبر سے ان کے حالات زندگی طلب کئے ہیں۔(۳۲) ہو سکتا ہے کہ انہیں یہی عیسوی سنہ لکھ کر بھیجا گیا ہو یا ہجری سنہ کو انہوں نے از خود عیسوی میں درستی کے ساتھ تبدیل کیا ہو۔

اس تمام بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اکبر کا سال پیدائش قمری اعتبار سے ۱۲۶۱ھ ہے۔ چونکہ ان کا ماہ ولادت شوال ہے، اس حساب سے شمسی تقویم کے مطابق وہ اکتوبر ۱۸۴۵ء میں پیدا ہوئے۔ پیدائش کی صحیح عیسوی تاریخ کا تعین نہیں کیا جا سکتا کیونکہ شوال کی قطعی تاریخ معلوم نہیں ہے۔

وطن

اکبر کے مقام پیدائش کے متعلق بیشتر ماخذ میں اتفاق رائے ہے۔ تقریباً سبھی اہم لکھنے والے بارہ ضلع الہ آباد کو ان کا مقام پیدائش قرار دیتے ہیں۔ سر عبدالقادر کا حوالہ ابھی پیش کیا گیا ہے۔ عبد الحی(۳۳)، سید عشرت حسین(۳۴)، محمد یحیٰی تنہا(۳۵)، عبدالجلیل(۳۶) وغیرہم نے یہی لکھا ہے کہ وہ بارہ میں پیدا ہوئے مگر بعض سوانح نگاروں کو کچھ غلط فہمی بھی ہو گئی ہے۔ شفق عماد پوری نے لکھا ہے:

"جناب سید اکبر حسین ضلع الہ آباد کے قصبے نارہ میں پیدا ہوئے۔"(۳۷)

محمد نصیر ہمایوں لکھتے ہیں:

بمقام باڑہ (جہاں ان کے چچا تحصیلدار تھے)—— پیدا ہوئے۔"(۳۸)

قمرالدین بدایونی رقم طراز ہیں:

"ضلع الہ آباد میں بارہ ایک مشہور قصبہ ہے۔ سید حسین علی اور سید عبداللہ، جو تاریخ میں بادشاہ گر کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں، اسی بستی کی خاک نے پیدا کیے تھے۔"(۳۹)

مگر یہ تینوں آرا صحیح نہیں ہیں۔ اکبر کا مولد نہ تو باڑہ ہے اور نہ ہی نارہ۔ اسی طرح "بارہ" کا تعلق سادات بارہہ سے بھی نہیں ہے۔ طالب الہ آبادی ان غلط فہمیوں کا ازالہ ذیل کے الفاظ میں کرتے ہیں:

نور کا ٹکڑا—— الہ آباد کے مفصل میں ایک نہایت معمولی سے موضع میں، جس کا نام بارہ ہے، ظاہر ہوا۔ الہ آباد سے کچھ ہٹ کر شہر سے بارہ میل کے فاصلے پر دوآبہ میں بارہ کے نام سے مشہور ہے۔ تحصیل بھی اسی نام سے ہے۔ سر عبدالقادر اور محمد نصیر ہمایوں نے قومی کتب خانہ لاہور سے "رقعات اکبر" شائع کیے ہیں، اس میں یہ مقام باڑہ غلط ہے۔ اسی طرح "کلام اکبر الہ آبادی" کے عنوان سے ایک مختصر سا گلدستہ شفق عماد پوری نے مرتب کیا ہے انہوں نے ستم ظریفی سے کام لیا ہے۔ سوچتے ہوں گے کہ پنجاب والوں کے یہاں ڈ اور ڑ

کی زیادتی ہے اس لیے باڑہ ہو گیا تو ہم اہل زبان ہیں۔ اسم معرفہ میں حد صنائع نقاط کیوں صرف کریں ۳۸ ڈگری کا فرق ہو گیا اور بارہ کا نارہ ہو گیا ہے۔ یا غالباً نوح ناروی کے طوفان میں شفق صاحب بھی کھو گئے ہوں گے اور اکبر کو بھی ناروی ہی سمجھے ہوں گے۔ افسوس ہے کہ تذکرہ نویس حضرات اپنی ذمہ داریاں ذرا بھی محسوس نہیں کرتے۔"(۴۰)

حیات اکبر میں بھی بعض الجھنوں کو مندرجہ ذیل الفاظ میں صاف کیا گیا:

"یہ بارہ ضلع الہ آباد میں ہے۔ سادات بارہ (باہرہ) والا بارہ نہیں ہے۔ کچھ لوگ حضرت اکبر کا سلسلہ نسب بادشاہ گروں (سید حسین علی اور سید عبداللہ) کے خاندان سے ملاتے ہیں۔ سادات بلگرام سے تو کچھ نسبت ہے مگر سادات بارہ سے نہیں ہے۔ ایک صاحب نے بارہ کی جگہ نارہ لکھ دیا ہے جہاں کے نوح ناروی ہیں۔ نوح صاحب ضرور حضرت اکبر کی خدمت میں بہت حاضر ہوتے تھے لیکن نارہ سے حضرت کا کچھ تعلق نہیں۔"(۴۱)

غرض اکبر کا مولد قصبہ بارہ ہے جو الہ آباد سے بارہ میل کے فاصلے پر ہے۔ اکبر تو بارہ میں پیدا ہوئے مگر ان کے باپ دادا کا تعلق صوبہ بہار سے تھا۔ "حیات اکبر" کے مختلف اوراق میں یہ بات تفصیل سے درج کی گئی ہے اور اس سلسلے میں جو بہت سے شواہد پیش کیے گئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بزرگ داؤد نگر ضلع گیا صوبہ بہار (اس وقت صوبہ بنگال) سے ترک وطن کر کے الہ آباد میں آباد ہوئے تھے۔(۴۲) معلوم نہیں سید عشرت حسین نے کس بنا پر داؤد نگر کو ضلع شاہ آباد میں ظاہر کیا ہے؟ وہ لکھتے ہیں:

"حضرت قبلہ کو ان کے والدین اول داؤد نگر ضلع شاہ آباد لے گئے جہاں سید فضل محمد صاحب (اکبر کے دادا) کا قیام تھا۔"(۴۳)

مگر یہ لکھنا درست نہیں کہ داؤد نگر ضلع شاہ آباد میں ہے۔ اس قصبے کے متعلق "امپیریل گزیٹیر آف انڈیا" میں یہ الفاظ درج ہیں:

Daudnagar : A town in the Aurangabad sub- division of Gaya district, Bengal, situated in 25- 3, N and 84. 24' E, on the right bank of Son river."(۴۴)

اس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ داؤد نگر ضلع گیا کا قصبہ ہے۔ عشرت حسین کو یہ غلط فہمی غالباً اس لیے ہوئی ہے کہ ضلع شاہ آباد کی مشرق حد "گیا" سے ملتی ہے۔

بچپن اور تعلیم

اکبر کا بچپن بارہ کے علاوہ داؤد نگر اور سورام وغیرہ میں بسر ہوا- اکبر کے دادا داؤد نگر میں مقیم تھے ان کے والدین انہیں وہیں لے گئے' جہاں ان کے ختنے ہوئے اور بسم اللہ کی تقریب ہوئی-(۴۵) اسی زمانے میں ان کے والدین کو ان کے چچا سید وارث علی تحصیلدار کی بیٹی کی شادی میں شرکت کے لیے سورام ضلع الہ آباد جانا پڑا- یہاں کچھ مدت تک ان کا قیام رہا- سوام میں اکبر نے "راہ نجات"(۴۶) نامی ایک کتاب پڑھنی شروع کی-(۴۷) اکبر کے والد علم ریاضی کے ماہر تھے- اکبر کو انہوں نے زبانی حساب سکھایا- جمع' تفریق' ضرب' تقسیم اور اربعہ متناسبہ میں وہ بچپن ہی سے طاق ہو گئے-(۴۸) جملہ خواتین کو ہدایت تھی کہ خط اکبر سے لکھوایا کریں- اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ نو سال کی عمر میں روانی سے خط لکھنے لگے- اس زمانے میں انہیں داستانیں پڑھنے کا شوق ہوا- چنانچہ "الف لیلہ" اور "قصہ حاتم طائی" وغیرہ پڑھیں-(۴۹)

۱۸۵۶ ع میں' جب اکبر کی عمر گیارہ سال تھی' ان کے والدین الہ آباد میں آکر آباد ہو گئے-(۵۰) اس زمانے میں لوگ انگریزی تعلیم سے اجتناب کرتے تھے مگر اکبر کے خاندان کے کئی افراد پہلے سے سرکار انگریزی کے ملازم تھے' اس لیے ان کے والدین کو اس تعلیم سے وحشت نہ تھی- چنانچہ انہیں الہ آباد کے مشن سکول میں داخل کرا دیا گیا-(۵۱) لیکن یہاں انہوں نے ابھی ایک سال سے زیادہ تعلیم حاصل نہ کی تھی کہ پورا ملک ۱۸۵۷ ع کے عظیم ہنگامے کی لپیٹ میں آ گیا- ۱۸۵۸ ع میں انگریز دوبارہ ملک پر پوری طرح قابض ہو گئے مگر اکبر سے مشن سکول ہمیشہ کے لیے چھوٹ گیا- اس کی تفصیل یہ ہے کہ "قبل غدر ایک گاؤں سے تیس روپے ماہوار آمدنی تھی- غدر نے یہ آمدنی بند کر دی-"(۵۲) اس وقت کے تیس روپے آج کل کے کئی ہزار روپے کے برابر تھے-(۵۳) چنانچہ ان کے والدین تنگ دست ہو گئے اور انہیں دوبارہ مشن سکول میں نہ بھجوا سکے-

اس وقت تک انہوں نے انگریزی کی ایک دو کتابیں پڑھی تھیں- گھر پر کچھ فارسی عربی اور ریاضی میں بھی استعداد بہم پہنچائی تھی- پھر کچھ مدت تک مولوی محمد فاروق چریا کوٹی کے درس میں بھی شرکت کی تھی-(۵۴) اکبر کے حصول تعلیم کا یہ تمام زمانہ محض چار پانچ برسوں تک محیط ہے- انہوں نے اس کے بعد بھی ذاتی مطالعہ ہمیشہ جاری رکھا اور وفات تک مختلف علوم کی دقیق کتابوں کے مطالعے میں منہمک رہے- سید عشرت حسین لکھتے ہیں:

"حضرت قبلہ نے مسلسل مطالعے سے کتنی قابلیت بڑھائی' اس کا اندازہ عربی' فارسی اور انگریزی کی ان کتابوں سے ہو سکتا ہے جو حضرت قبلہ کے کتب خانے

خانے میں موجود ہیں۔ حضرت قبلہ تلاش روزگار میں بھی مطالعہ کرتے رہے اور روزگار کے زمانے میں بھی مطالعہ کرتے رہے اور پنشن لینے کے بعد بھی مطالعہ کرتے رہے۔ سکول سے الگ ہو کر حضرت قبلہ نے کلکتہ یونیورسٹی کی انٹرنس تک کی انگریزی کتابیں پڑھیں۔ سائنس، جغرافیہ اور تاریخ کی طرف بھی توجہ کی، بنیاد یوں پڑی، پھر ضرورت اور رغبت کے مطابق روز بروز علم میں ترقی ہوتی گئی۔"(۵۵)

اکبر الہ آبادی کے غیر مطبوعہ مکاتیب کا جو وسیع ذخیرہ نیشنل میوزیم کراچی میں میری نظر سے گزرا ان سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ وہ آخری عمر میں مشکل سے مشکل موضوع پر انگریزی کتابیں پڑھ سکتے تھے۔ علاوہ ازیں عربی وغیرہ کی استعداد بڑھانے کے لیے انہوں نے ملازمت سے سبکدوشی تک ایک مولوی صاحب کو رکھ چھوڑا تھا۔ ان کے مکاتیب اور اشعار سے بہت سی ایسی شہادتیں ملتی ہیں جن سے ان کے شوق مطالعہ اور تبحر علمی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کا علم اردو شعرا کے کلام سے لے کر ہیگل اور برگساں جیسے فلسفیوں کی تصانیف تک پھیلا ہوا ہے۔ اس سلسلے میں طالب الہ آبادی کی رائے ہے:

"مجلس شعراء میں، جب کبھی حاجت ہوتی، اساتذہ فن کے فارسی اور اردو کلام سے بہت سی سندیں پیش کر دیا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ آتش اور ناسخ جن اشعار کی وجہ سے آتش و ناسخ ہوئے ہیں وہ میرے ناخنوں پر ہیں۔

آخری عمر میں مل اور سپنسر وغیرہ کی کتابوں کا عمیق مطالعہ کرنے لگے تھے اور ان کے مطالب پر آزادی سے گفتگو اور تبادلہ خیالات کر لیا کرتے تھے۔"(۵۶)

اس کی مزید تصدیق اکبر کی بعض تحریروں اور خطوں سے ہوتی ہے۔ انہوں نے ولفرڈ سکاون بلنٹ کی کتاب "فیوچر آف اسلام" کا اردو میں ترجمہ کیا ہے جس سے انگریزی زبان میں ان کی قابلیت ظاہر ہوتی ہے۔ ان کے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ فلسفے اور مذہب پر انہوں نے انگریزی کتابوں کا وسیع مطالعہ کیا ہے۔ اس طرح کے جملے جابجا ملتے ہیں:

"میں خوش ہوا کہ آپ برکلے کا ترجمہ کر رہے ہیں--- ہم تو، اور ہم کیا قریباً وہ سب جن کو ہم نے جانا ہے، برکلے کی تقریر کو صحیح و دلنشین پاتے ہیں۔ ہمارے تصوف کی کامل تائید ہے۔"(۵۷)

"آخری کتاب مسٹک فلاسوفی کی(۵۸) نکول نے، جو آکسفورڈ میں پروفیسر ہے، حال ہی میں شائع کی ہے۔ کثرت میں وحدت، وحدت میں کثرت ثابت کی

ہے۔" (۵۹)

"۱۹۱۳ء میں برگساں کا ایکسپوزیشن شائع ہوا ہے۔ میرا دل تو اب لگتا نہیں، کہاں تک ذہن کو قلابازیاں کھلاؤں۔ افلاطون سے لے کر کانٹ، ہیگل اور بکسلے تک سب کا عروج و زوال دیکھا۔ لفاظیاں اور خیال آرائیاں ہیں۔ برگساں کی بھی عمر ہے۔ جو دلنشین ہو جائے وہی سب کچھ ہے۔" (۶۰)

یہ آرا کسی ایسے شخص ہی کی ہو سکتی ہیں جو نہ صرف انگریزی سے بخوبی واقف ہو بلکہ حضرات فلاسفہ کے خیالات پر حاوی ہو۔(۶۱) یعنی اکبر اگر مغرب کے نظریات کا مخالف اور اس کے مرعوبین کا ناقد تھا تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ یہ ایک نیم خواندہ شخص کے احساس کمتری کا اظہار تھا بلکہ یہ ایک ایسے شخص کی رائے تھی جو ان نظریات کو پڑھ کر ان کی لاطائل بحثوں، تخیلی موشگافیوں اور لفظی بھول بھلیوں سے تنگ آ کر کسی ایسے نظم و ضبط کی تلاش میں تھا جو انسان کو مطمئن اور آسودہ کر سکے۔

ملازمتیں

اکبر کو اوائل عمر ہی سے تلاش روزگار میں سرگرداں ہونا پڑا۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، ۱۸۵۷ء تک ان کے والد کو ایک گاؤں سے تیس روپے ماہوار کی آمدنی تھی، مگر جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد یہ سہارا چھن گیا اور یوں اکبر دوبارہ سکول نہ بھجوائے جا سکے۔ ناموافق حالات میں والدین نے محسوس کیا کہ تعلیم دلانے کے بجائے ملازمت کرانی چاہئے۔ ۱۸۵۸ء سے ملازمت کی تلاش شروع کی۔ پہلے پہل کچھ عارضی ملازمتیں ملیں مگر ان کے درمیان بیکاری کے وقفے بھی تسلسل سے آتے رہے۔ دس سال اسی طرح گزر گئے۔ ان دس سالہ عارضی ملازمتوں کی کیفیت کچھ اس طرح ہے۔

پہلے منصفی گیٹ گنج (الہ آباد) میں اقبال دعویٰ لکھتے رہے۔ پھر انہیں ایک وکیل کے سپرد کیا گیا کہ محرری سیکھ جائیں مگر اس نے سہارا نہ دیا۔ پھر ایک شخص علی حسین نامی، جو اکبر کے والد کا دوست، محلہ دار اور فوجداری عدالت کا پروانہ نویس تھا، انہیں پروانہ نویسی سکھانے لگا۔ سب سے پہلے ایک ہندو نائب پروانہ نویس کے ایک ہفتے کی رخصت پر چلے جانے سے اکبر اس کی جگہ سات روز کے لیے ملازم ہوئے۔ پھر بنسن مجسٹریٹ الہ آباد نے ایک اتفاقی واقعے کے سبب انہیں اپنے ساتھ کام پر لگانا چاہا مگر ابھی باضابطہ ملازم نہ ہوئے تھے کہ بنسن کا تبادلہ ہو گیا۔ پھر ایک اور اتفاق کے باعث(۶۱) اسی طرح کی عارضی ملازمت حاصل کی۔(۶۲)

اس ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد اکبر تلاش معاش میں فتح پور (ہسوہ) پہنچے۔ گھر سے دور تھے۔ طرح طرح کی تکلیفیں سہیں مگر روزگار کا بندوبست نہ ہوسکا' ناکام واپس لوٹے۔(۶۳)

۱۸۶۳ء میں بھی اگرچہ ایک عارضی ملازمت ہی ملی لیکن وہ پہلے کی ملازمتوں سے بہتر تھی۔(۶۴) ان دنوں ایسٹ انڈیا ریلوے' دریائے جمنا پر پل بنوا رہی تھی جس کے لیے پتھر کشتیوں کے ذریعے مرزا پور سے آتا تھا۔ ٹھیکیدار کو پتھروں کی پیائش اور تعداد کی گنتی کے لیے ایک مناسب شخص درکار تھا' چنانچہ اکبر پندرہ روپے ماہوار پر ملازم ہوگئے۔ جمنا کا پل مکمل ہوا تو پھر بے روزگار ہوگئے۔

اب انہوں نے ریلوے میں بطور کلرک ملازمت حاصل کی اور الہ آباد سٹیشن پر بیس روپے ماہوار کے نوکر ہوگئے۔ ۱۸۶۶ء تک وہیں رہے۔(۶۵) اس کے بعد قسمت نے پلٹا کھایا اور روز بروز ترقیاں کرنے لگے۔ اس کا سلسلہ یوں شروع ہوا۔

اکبر کو عدالتوں میں پروانہ نویسی وغیرہ کرتے ہوئے قانون سے کچھ شغف ہو چلا تھا۔ خیال آیا کہ وکالت کا امتحان دیا جائے۔ "اس زمانے میں یہ قاعدہ تھا کہ وکالت کا امتحان جو کوئی درجہ اول میں پاس کرتا اس کو ہائی کورٹ میں پریکٹس کی اجازت ملتی تھی' جو درجہ دوئم میں پاس کرتا وہ سیشن ججی تک کے مقدمات لے سکتا تھا اور جو تیسرے درجے میں کامیاب ہوتا تھا وہ صرف وکیل منصفی ہوتا تھا۔"(۶۶) اکبر نے ۱۹۶۷ء میں یہ امتحان دیا۔(۶۷) اس وقت تک انگریزی میں مہارت نہ رکھتے تھے' چنانچہ تیسرے درجے میں کامیاب ہوئے۔ وکالت کا زبانی امتحان لینے والے بورڈ میں ایک انگریز رونسن شامل تھا جسے فارسی سے بہت لگاؤ تھا۔ وہ اکبر کے جوابوں سے بہت متاثر ہوا اور ان سے فارسی پڑھنی شروع کی اور اکبر نے اس کے ماتحت وکالت شروع کر دی۔

۱۹۶۸ء یا ۱۸۶۹ء میں اسی رونسن کی سفارش سے تحصیل میجا ضلع الہ آباد میں نائب تحصیلدار کی عارضی اسامی ملی مگر کچھ عرصے کے بعد تخفیف میں آگئے۔ دوبارہ وکالت شروع کی۔ یہاں ولیم ٹرول جج (خفیفہ) سے ان کے تعلقات اچھے ہوگئے۔ اسی دوران ٹرول ہائیکورٹ کا رجسٹرار مقرر ہوا تو اس نے سفارش کر کے انہیں چیف جسٹس کا مسل خواں بنوا دیا۔ یہ واقعہ ۱۸۷۰ء کا ہے۔ یہاں تین سال جم کر کام کیا۔(۶۸) وکلا کی بحثیں سننے اور مسل خوانی کے فرائض محنت سے انجام دینے کا فائدہ یہ ہوا کہ نہ صرف انہیں قانون میں مہارت ہوگئی بلکہ انگریزی کی قابلیت بھی بڑھ گئی۔ چنانچہ اکبر کو خیال ہوا کہ اب میں ہائی کورٹ کی وکالت کا امتحان دے سکتا ہوں۔ غرض ۱۸۷۳ء میں امتحان دیا اور کامیاب رہے۔ بہت بڑی

تعداد میں لوگوں نے یہ امتحان دیا تھا جن میں سے کل چار پانچ ہی آدمی کامیاب ہوئے تھے۔

یہاں سے ترقی کا راستہ صاف ہوگیا۔ انہوں نے ہائی کورٹ میں وکالت شروع کر دی اور سات برس تک الہ آباد، گونڈہ، گورکھپور اور آگرہ میں وکالت کرتے رہے۔ یہ زمانہ نسبتاً فراغت اور خوش حالی میں بسر ہوا۔ بطور وکیل انہیں خوب شہرت ملی۔ رفقائے کار اور ججوں نے حوصلہ افزائی کی۔(۶۹) اسی زمانے سے ان کی شاعری کی حدود میں وسعت پیدا ہونی شروع ہوئی۔ اس کے علاوہ انہوں نے "اودھ پنچ" وغیرہ میں نثری مضامین کا سلسلہ شروع کیا۔

۱۸۸۰ء میں حالات تبدیل ہوگئے۔ انگریزی داں وکیلوں اور بیرسٹروں کا تانتا بندھ گیا اور قدیم وکلا کے ہاں کام بہت کم آنے لگا۔ بہت سے اردو وکلا نے منصفی وغیرہ کے عہدے قبول کر لیے۔ اکبر نے بھی دل برداشتہ ہو کر منصفی کے لیے درخواست دے ڈالی۔ یہاں سے ان کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔

ان کی جوڈیشل سروس کا آغاز ۲۶ نومبر ۱۸۸۰ء سے ہوا جب وہ مرزا پور میں تین ماہ کے لیے قائم مقام منصف مقرر ہوئے۔(۷۰) اس کے بعد مارچ ۱۸۸۱ء میں بیس دن کے لیے ہمیرپور میں قائم مقام منصف اور اپریل ۱۸۸۱ء میں بجنور کے قائم مقام منصف مقرر ہوئے۔ ۶ مئی سے یہیں مستقل منصف بنا دئے گئے اور درجہ سوم سے درجہ دوم میں ترقی ملی۔ ۳ ستمبر ۱۸۸۱ء کو ان کا تبادلہ خورجہ ضلع بلند شہر میں کر دیا گیا۔

نومبر ۱۸۸۲ء میں سر سید احمد خاں اور مولوی سمیع اللہ خاں نے حکام سے کہہ کر ان کا تبادلہ علی گڑھ میں کروا دیا(۷۱) جہاں ان کا قیام ۱۸۸۸ء تک رہا۔ یہاں ان کی ملاقاتیں سرسید احمد خاں اور دوسرے عمائدین سے ہوتی رہتی تھیں۔ انہوں نے نئی تعلیم کے اس مرکز کو بہت قریب سے دیکھا۔ اس کی خوبیوں اور خامیوں کے وہ عینی شاہد تھے۔ انہیں سر سید احمد خاں سے کوئی ذاتی دشمنی نہ تھی۔ اگر انہوں نے علی گڑھ کے نظام تعلیم سے اختلاف کیا تو یہ اصولی بات تھی ورنہ سر سید اور دوسرے مصلحین سے ان کے ذاتی تعلقات ہمیشہ نہایت خوشگوار رہے۔ علی گڑھ میں قیام کے دوران ۲۲ ستمبر ۱۸۸۴ء کو انہیں منصف درجہ اول بنا دیا گیا۔

۱۰/ اپریل ۱۸۸۸ء کو انہیں قائم مقام سب جج درجہ سوم کے عہدے پر ترقی دے کر علی گڑھ سے غازی پور بھیج دیا گیا جہاں چند دن کے بعد وہ مستقل جج ہوگئے۔ لیکن غازی پور انہیں پسند نہ تھا۔ یہاں کی شدید گرمی کو وہ برداشت نہ کر پاتے تھے، چنانچہ انہوں نے

ہائی کورٹ کو درخواست دی کہ مجھے الہ آباد بھیج دیا جائے۔ سید محمود نے، جو ہائی کورٹ کے جج تھے، اس سے اتفاق نہ کیا۔(۴۷) تاہم ۲ مئی ۱۸۸۹ء کو الہ آباد کے بجائے ان کا تبادلہ کانپور میں کر دیا گیا جو الہ آباد سے زیادہ دور نہیں ہے۔ ۱۵ نومبر ۱۸۹۰ء کو انہیں مزید ترقی ملی اور وہ سب جج درجہ دوم ہوگئے۔ سب ججی کے علاوہ اکبر کانپور میں ۳ دسمبر سے ۱۸ دسمبر ۱۸۹۰ء تک ڈسٹرکٹ اور سیشن جج کے عہدے کے بھی انچارج رہے۔

۴ مئی ۱۸۹۲ء کو انہیں ترقی دے کر قائم مقام جج خفیفہ بنا دیا گیا اور تقرر آگرے میں ہوا۔ ۲۲ اگست ۱۸۹۲ء کو عدالت خفیفہ کی ججی کے ساتھ انچارج ڈسٹرکٹ اور سیشن جج آگرہ بھی رہے۔ ۳۱ اگست ۱۸۹۲ء کو کانپور کی سب ججی پر واپس ہوئے۔ ۲۴ اکتوبر ۱۸۹۲ء کو کانپور میں انچارج ڈسٹرکٹ اور سیشن جج رہے۔ ۲۰ اگست ۱۸۹۳ء کو الہ آباد کے تقرر کی خواہش پوری ہوئی اور انہیں قائم مقام جج عدالت خفیفہ مقرر کیا گیا مگر چند ماہ کے بعد ۱۷ مارچ ۱۸۹۴ء کو عدالت خفیفہ آگرہ کے مستقل جج بنا کر بھیجے گئے۔ ۱۱ مئی ۱۸۹۴ء کو جھانسی کے قائم مقام ڈسٹرکٹ اور سیشن جج ہوئے۔ اسی سال ۱۳ دسمبر کو الہ آباد واپس ہوئے اور عدالت خفیفہ کے قائم مقام جج مقرر کیے گئے۔ ۵ اپریل ۱۸۹۵ء کو جونپور میں قائم مقام ڈسٹرکٹ اور سیشن جج کا عہدہ سنبھالا۔ ۲۳ دسمبر ۱۸۹۵ء کو عدالت خفیفہ آگرہ کے جج مقرر ہوئے۔ ۲۹ اپریل ۱۸۹۶ء کو گونڈہ کے ڈسٹرکٹ اور سیشن جج مقرر ہوئے لیکن غالباً شدید گرمی کی وجہ سے ناخوش رہے، جیسا کہ کلیات اکبر (جلد اول) کے ایک شعر سے ظاہر ہے:

اب تلک گونڈے سے امید رہائی نہیں کچھ
لیجئے ہوگئی ختم آج تو جولائی بھی

مگر جب رہائی نہ ہو سکی تو ۱۵ ستمبر سے ۱۶ نومبر تک میڈیکل سرٹیفکیٹ پر دو ماہ کی رخصت لے لی۔ ۱۷ نومبر ۱۸۹۶ء کو رخصت کے ختم ہونے پر آگرے میں عدالت خفیفہ کے جج بنا دیے گئے۔ ۱۳ مارچ ۱۸۹۹ء کو بنارس کے قائم مقام ڈسٹرکٹ اور سیشن جج ہوئے۔ ۱۶ اپریل ۱۸۹۹ء کو الہ آباد میں عدالت خفیفہ کے جج مقرر ہوئے۔ اسی سال پہلے مین پوری اور پھر الہ آباد میں قائم مقام ڈسٹرکٹ اور سیشن جج ہوئے۔ ۲۴ اکتوبر ۱۸۹۹ء کو ایک مرتبہ پھر عدالت خفیفہ الہ آباد کے جج رہے۔ ۱۹۰۰ء میں مرزا پور کے ڈسٹرکٹ اور سیشن جج ہوئے مگر چھ ماہ کے بعد پھر الہ آباد واپس بھیج دیے گئے۔ ۵ مئی ۱۹۰۱ء کو سہارنپور کے قائم مقام ڈسٹرکٹ اور سیشن جج رہے۔

۲ ستمبر سے ۲۱ نومبر ۱۹۰۱ء تک رخصت لی۔ ۲۲ نومبر کو پھر الہ آباد کی عدالت خفیفہ کی ججی ملی۔ یکم مئی ۱۹۰۲ء کو دوسری بار جونپور کے قائم مقام ڈسٹرکٹ اور سیشن جج ہوئے۔ ۸

اگست ۱۹۰۲ء کو پھر وہی الہ آباد تھا اور وہی عدالت خفیفہ کی ججی۔ یہیں دسمبر ۱۹۰۳ء کو ریٹائر ہوئے۔(۷۳)

سید عشرت حسین رقم طراز ہیں:

"جون پور میں دوسری بار سیشن ججی کر رہے تھے کہ ہائی کورٹ کی ججی کا نمبر آگیا۔ ججی کے واسطے وزیر ہند کو اور بھی نام بھیجے گئے تھے لیکن حضرت قبلہ کا نام مقدم تھا۔ سر جیمس لاٹوش لیفٹیننٹ گورنر یو پی نے حضرت قبلہ سے استصواب کیا۔ حضرت قبلہ نے فرمایا:

آنکھوں کی معذوری روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ ہائی کورٹ کی ججی کیا، سیشن ججی کے بھی قابل نہیں رہا ہوں۔ مجھے تو اب پنشن عنایت کیجئے۔"(۷۴)

نیشنل میوزیم کراچی سے اکبر کا ایک خط بنام عشرت ملا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعات قدرے مختلف ہیں۔ اس خط کا ضروری حصہ یہ ہے:

"اتوار کے دن ۶ بجے صبح کو بستی پہنچا، آرام کیا۔ وہ باتیں یاد آئیں کہ ۱۸۹۵ء میں جب میں یہاں تھا اور میری تقرری عہدہ ججی ہائی کورٹ کی تجویز ولایت میں پیش ہوئی تھی تو صدہا خطوط مبارکباد کے چلے آتے تھے اور میں اپنی حالات پر نظر کر کے کچھ گھبراتا سا تھا۔ انہیں روزوں تم بھی یہاں آئے تھے۔ جناب والدہ صاحبہ زندہ تھیں۔ میں بھی تندرست تھا۔ اب وہ سب باتیں خواب و خیال ہیں۔(۷۵)

اس خط سے صاف ظاہر ہے کہ اکبر کی ہائی کورٹ کی ججی کی تجویز ۱۸۹۵ء میں پیش ہوئی تھی۔ اس وقت جونپور میں ان کا پہلا تقرر ہوا تھا اکبر کے علاوہ اور لوگوں کو بھی اس بات کی توقع تھی کہ وہ ہائی کورٹ کے جج بنا دیے جائیں گے مگر انہیں جج نہ بنایا گیا۔ اس کی وجہ معلوم نہیں۔ اس خط سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اکبر نے آنکھوں کی معذوری کی وجہ سے انکار نہیں کیا۔ آنکھوں کی معذوری کے سبب انکار کرنے کا واقعہ اور ہے۔ وہ بھی اکبر کے ایک غیر مطبوعہ خط سے معلوم ہوتا ہے جس کا اقتباس یہ ہے:

> "اس وقت کچہری میں بیٹھا ہوں۔ پونے تین کا وقت ہے۔ کام تو ختم کر چکا ہوں لیکن آج بار کی طرف سے بطور یادگار کے گروپ لیا جائے گا۔ جملہ وکلا اور برسر آوردہ افسرز ہوں گے اور صاحب جج ضلع نے بھی براہ مہربانی شرکت منظور فرمائی ہے۔ مسٹر ڈیگ فوٹوگرافر ہوں گے۔ چار بجے کا وقت مقرر ہے۔ شاید میں تم کو لکھ چکا ہوں کہ ان لوگوں کا ارادہ یہ بھی ہے کہ آئل پینٹ تصویر لے کر کمرہ عدالت میں مستقل یاد کے طور پر لگا دیں۔ رخصتی ایڈریس تو اس وقت دیا جائے گا جب میں آخری اجلاس کروں گا۔ تم کو تعجب ہوگا کہ ۱۶ نومبر تاریخ

معینہ کو میں کیوں نہ ریٹائر ہوگیا- بے شک یہی ہونا چاہیے تھا- معمول یہی ہے کہ پیشتر سے انتظام کر دیا جاتا ہے لیکن ہائی کورٹ نے آخر وقت تک انتظام نہیں کیا- خیال کیا جاتا ہے کہ اس وجہ سے انتظام نہیں کیا کہ میں گورنمنٹ سے توسیع کی خواہش کروں، لیکن سال گزشتہ میں لیفٹیننٹ گورنر صاحب سے صاف طور پر کہہ چکا کہ آئندہ توسیع پر اصرار نہ کروں گا- لہٰذا میں نے مناسب نہ سمجھا کہ ان سے کچھ کہوں، کیونکہ میرا ہی بیان سن کر انہوں نے حکم قطعی صادر کیا تھا- شکایت چشم کی حالت نے بھی جرات نہ دلائی- لہٰذا میں نے گورنمنٹ سے کچھ نہیں کہا- قید و پابندی مجھے دشوار ہے، جج میرے لیے اب بار ہے- نتیجہ یہ ہوا کہ عین تاریخ پر انتظام کیا گیا لہٰذا میرے سکسیسر بابو مختار صاحب شاید آخر ماہ حال میں آسکیں گے- مجھ کو اس وقت تک کام کرنے کا حکم ہے- خیر پندرہ بیس دن کی اور توسیع ہے-"(۷۶)

اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہائی کورٹ کے جج نہ بن سکے مگر انہوں نے ملازمت جاری رکھی- چند سال بعد ان کی صحت جواب دے گئی اور ضعف بینائی کا بھی غلبہ ہوا تو ان کا جی نوکری سے اچاٹ ہوگیا- انؒ کے ایک اور غیر مطبوعہ خط سے معلوم ہوا ہے کہ وہ ۱۰ دسمبر ۱۹۰۳ء تک ریٹائر نہیں ہوئے تھے- لکھتے ہیں "چارج ابھی تک نہیں ہوا-"(۷۷)

ریٹائر ہونے سے قبل اکبر کو جوڈیشل خدمات کے عوض سرکار نے "خان بہادر" کا خطاب دیا- اس کی تاریخ کے متعلق بھی اکبر کے سوانح نگاروں میں اختلاف پایا جاتا ہے- قمرالدین بدایونی نے تحریر کیا ہے:

۱۹۰۷ء میں گورنمنٹ نے جوڈیشل خدمات کے صلے میں خان بہادری کا خطاب عطا کیا-"(۷۸)

قمرالدین بدایونی سنین کے معاملے میں خاصے لاپروا ہیں- اس سنہ کا معاملہ بھی یہی ہے مگر بہت سے لوگوں نے نقل در نقل سے کام لے کر اسی سنہ کو رائج کر دیا ہے- مثلاً اصغر حسین نظیر لدھیانوی(۷۹) اور ڈاکٹر محمد صادق (۸۰) وغیرہ نے اسی سنہ کو صحیح سمجھ لیا ہے-

اس کے برعکس بیشتر لکھنے والے یہ رائے رکھتے ہیں کہ انہیں یہ خطاب ۱۸۹۸ء میں ملا- ان میں سید عشرت حسین،(۸۱) طالب الہ آبادی(۸۲) اور یحییٰ(۸۳) تنہا وغیرہ شامل ہیں- سید عشرت حسین اس معاملے میں سب سے زیادہ مستند ہیں کیونکہ اکبر کا تمام ریکارڈ انہی کے پاس رہتا تھا- اکبر ایک غیر مطبوعہ خط میں عشرت حسین کو لکھتے ہیں:

"تم کو میرے خطاب خان بہادر کے عطا ہونے کی تاریخ معلوم ہو گی یا معلوم ہو سکے گی- ذرا زحمت اٹھا کر کارڈ پر لکھ کر محشر صاحب کو لکھنؤ روانہ کر دو-" (۸۴)

اس بنا پر یہ سمجھنا درست ہوگا کہ سنین وغیرہ کے سلسلے میں اکبر کو عشرت پر اعتماد تھا' اس لیے عشرت نے عطائے خطاب کا جو سنہ درج کیا ہے اس کے درست ہونے میں کلام نہیں- عشرت نے اکبر کی جوڈیشل سروس کے نقشے میں' جس کا حوالہ پہلے آچکا ہے- خطاب خان بہادری کے عطا ہونے کی تاریخ ۲۱ مئی ۱۹۹۸ء قرار دی ہے- "علی گڑھ میگزین" کے اکبر نمبر میں سید زاہد حسین نے بھی یہی تاریخ از خود لکھی ہے-(۸۵) ظاہر ہے کہ وہ اس غیر مطبوعہ جوڈیشل سروس کے نقشے سے واقف نہیں ہو سکتے تھے اور چونکہ دونوں ماخذ میں سنہ کے علاوہ مہینہ اور تاریخ میں بھی کوئی اختلاف نہیں اس لیے اس کی درستی میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا-

اکبر انصاف پسند اور ماہر قانون جج تھے- ان کے بعض عدالتی فیصلے بڑے مشہور ہوئے- اس سلسلے میں عشرت لکھتے ہیں :

"حضرت قبلہ کی عدالت میں ضلع مظفر نگر کے چند افسران پولیس کے خلاف مقدمہ دائر تھا- مظفر نگر ضلع سہارنپور کی سیشن ججی کے ماتحت ہے- گورنمنٹ چاہتی تھی کہ ملزموں کو سزا دی جائے- مسٹر راؤز' جو بعد میں ہائی کورٹ کے جج ہوئے' گورنمنٹ کی طرف سے وکیل تھے- حکام ضلع نے زور ڈالا اور رؤسائے ضلع نے لیفٹیننٹ گورنر کا منشا بتایا- کلکٹر نے حضرت قبلہ اور سپرنٹنڈنٹ پولیس کو ڈنر ایک ساتھ کھانے کی اپنے ہاں دعوت دی- حضرت قبلہ نے عذر کر دیا کہ دوران مقدمہ سپرنٹنڈنٹ پولیس کے ساتھ کھانا کھانا ٹھیک نہیں ہے- اس مقدمے کی شہادتیں جو حضرت قبلہ نے قلمبند فرمائی تھیں وہ فل سکیپ کے چھ سو صفحوں پر آئی تھیں- عشا کی نماز پڑھ کر مقدمے کا فیصلہ لکھنے بیٹھے- لکھتے لکھتے سوچا کہ تھوڑی دیر سو رہوں- گھڑی دیکھی تو نماز فجر کا وقت تھا- اٹھے' نماز پڑھی اور پھر لکھنے بیٹھ گئے- خیر ملزموں کو سزا دینے کی بجائے بری کر دیا- ہل چل مچ گئی- کمشنر نے فوراً مسل طلب کی' اوپر تک پہنچائی لیکن فیصلہ پڑھ کر سب چپ رہ گئے- ایک دفعہ فیصلے کے بعد اس مقدمے کے متعلق حضرت قبلہ اور چیف سیکرٹری کی باتیں ہوئیں- حضرت قبلہ نے فرمایا : میرے سامنے شیطان کو بھی کوئی خاص الزام لگا کر پیش کیا جائے گا تو میں اس خاص الزام کی ضرور

تحقیقات کروں گا۔ شیطان جان کر شیطان کو خاص الزام کا مجرم قرار نہیں دوں گا۔"(۸۶)

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اکبر کے جوڈیشل فیصلے کتنے اہم ہوں گے۔ خوش قسمتی سے ان کا ایک عدالتی فیصلہ مجھے دستیاب ہوگیا ہے۔ یہ ان کی قانونی مہارت کا ثبوت ہے۔ علاوہ ازیں اسلوب نثر کے اعتبار سے بھی دلچسپ ہے۔ عدالتی فیصلے کو ادبی چیز بنا دینا اکبر ہی کا حصہ ہے۔ اس فیصلے کی پوری نقل ضمیمہ نمبرا میں ملاحظہ کیجئے۔(۸۷)

جوانی اور شادیاں

اکبر ترقیوں پر ترقیاں پاتے رہے مگر ابتدا سے ان کی ذاتی زندگی بڑی ناہموار اور نا آسودہ سی رہی۔ ان کی پہلی شادی بالکل چھوٹی عمر میں ہوئی۔ ۱۸۵۹ء میں جب ان کی عمر چودہ سال تھی انہیں شادی کے بندھن میں باندھ دیا گیا۔(۸۸) الہ آباد سے تین کوس کے فاصلے پر اسرادی کلاں نامی گاؤں کے ایک زمیندار کی لڑکی خدیجہ خاتون کے ساتھ ان کی شادی ہوئی۔ قمرالدین بدایونی لکھتے ہیں:

"پہلی شادی پندرہ برس کے سن میں ماں باپ نے ایک قصباتی ہم کفو سنی لڑکی خدیجہ خاتون سے کر دی جو اکبر سے عمر میں چار سال بڑی تھی۔"(۸۹)

مگر یہ بات درست نہیں ہے۔ خدیجہ خاتون اکبر سے بڑی نہیں تھی۔ "حیات اکبر" (مصنفہ عشرت حسین) کے اصل غیر مطبوعہ مسودے میں ان کی شادی کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ مبنی بر حقیقت ہے مگر مطبوعہ "کتاب" میں کسی نے اس میں ردو بدل کر دیا ہے۔ سید عشرت حسین کے ہاتھ سے لکھے ہوئے مسودے میں اس شادی کا ذکر مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا گیا ہے:

"افسوس ناک شادی: ۱۸۵۹ء میں جبکہ وہ ہنوز نابالغ تھے، ان کی شادی کر دی گئی جو بالکل بے جوڑ تھی۔ لڑکی چودہ پندرہ برس کی بانو تھی۔"(۹۰)

۱۸۵۹ء میں اکبر کی عمر بھی چودہ سال سے کم نہ تھی۔ گویا خدیجہ خاتون اکبر کی ہم سن تھی۔ چونکہ یہ شادی بچپن میں ان کی مرضی کے خلاف ہوئی تھی اور بعد میں ان کا معاشرتی رتبہ بہت بلند ہوگیا اس لیے، جیسا کہ دنیا کا دستور ہے، وہ اس بیوی سے نباہ نہ کر سکے۔

اسی زمانے سے اکبر نے الہ آباد میں کوٹھوں پر جانا شروع کیا۔ ان کے استاد وحید الدین وحید طوائفوں سے رسم و راہ رکھتے تھے۔ وحید کے بارے میں قمرالدین بدایونی لکھتے

ہیں:

"الہ آباد کی کوئی حسین اور خوش گلو طوائف ایسی نہ تھی جس کے ہاں نہ جاتے ہوں۔ بلا کے حسن دوست تھے لیکن بدکاری سے کوسوں دور۔ امامن، نصیبن اور ببن کے ہاں زیادہ جاتے تھے۔ ۲۵ سال کے سن میں پندرہ سالہ(۹۱) اکبر کو ساتھ لیے ہوئے ہاتھ کی ایک انگلی کا ناخون دانتوں میں چباتے ہوئے ببن کے کوٹھے پر چلے جا رہے ہیں۔" (۹۲)

قمرالدین بدایونی نے وحید و اکبر کے ان مہ وشوں سے تعلقات کی تفصیل مہیا کی ہے۔ اکبر نے خود بھی اسے تسلیم کیا ہے: کہتے ہیں:

میری لائف لکھو ایام جوانی کے سوا
سب بتا دوں گا تمہیں اقتد و دانی کے سوا

اکبر کو موسیقی سے بہت دلچسپی تھی۔ وہ ستار بجا لیتے تھے۔ ان کے اشعار میں راگ راگنیوں اور سازوں کے نام کئی جگہ آئے ہیں غالباً یہی شوق انہیں اس بازار میں لے گیا اور ان کے طویل قیام کا باعث ہوا۔

قرائن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۷۵ء کے قریب قریب یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔ اس کے ختم ہونے کی وجہ بظاہر یہ ہوئی کہ ان کی شادی ایک طوائف بوٹا جان سے ہوگئی۔ "حیات اکبر" کے قلمی مسودے میں عشرت حسین لکھتے ہیں:

"جب عقد ثانی کی صلاح خود اہل خاندان نے پیش کی اور اکبر کے والدین نے بھی دیکھا کہ بغیر اس کے چارہ نہیں اور گھر آباد ہوتا نظر نہیں آتا تو زوجہ اولیٰ نے بھی اجازت دی لیکن یہ کہا کہ کوئی طوائف یا بیرونی عورت ہو کہ برادری میں دعویٰ برابری کا نہ کر سکے۔ یہ بالکل بے وقوفی کی بات تھی لیکن اکبر کے لیے کیا مشکل تھی ــــ ایک کم عمر نوخیز طوائف سے عقد کر لیا لیکن بہت جلد اس کا انتقال ہوگیا۔" (۹۳)

اس دوسری شادی کی کچھ تفصیل "اکبر نامے" کے ایک مضمون "تائبہ کی موت" میں موجود ہے۔ اس میں سے چند جملے یہ ہیں:

"مریضہ کو یقین مرض الموت کا ہو جاتا ہے اور مسلمان گھرانے کی پیدائش اب رنگ دکھاتی ہے۔ خواہش نکاح کی پیش کرتی ہے اور عین اس کے مرض الموت کے بستر پر، جب نفس کی لذتوں کا کوئی بھی لگاؤ نکاح میں باقی نہیں رہ جاتا، وہ سید اور سید زادہ اسے اپنے عقد زوجیت میں باقاعدہ لے آتا ہے۔ شہر کے ایک

چشتی بزرگ کے ہاتھ پر کم سن مومنہ توبہ کرتی ہے اور گناہوں سے دھل دھلا پاک صاف کلمہ توحید پڑھتی ہوئی جولائی ۱۸۷۶ء میں جنت کے سفر پر روانہ ہو جاتی ہے۔"(۹۴)

معلوم نہیں کہ عبدالماجد کے بیان میں کس حد تک صداقت ہے کیونکہ اس کی مطابقت عشرت حسین کی تحریر کے ساتھ نہیں ہے۔ بہرحال اکبر الہ آبادی کو بوٹا جان کی وفات سے بہت صدمہ ہوا۔ بوٹا جان کی وفات کا رنج اور اس سے لگاؤ اکبر کے اس موقعے پر لکھے ہوئے مرثیے سے ظاہر ہے جس کا مطلع یہ ہے:

آں نوبہار خوبی ماہ دو ہفتہ من
در نوبہار عمرش رفت از فضائے ہستی

اسی سال یعنی ۱۸۷۶ء کے ماہ نومبر میں اکبر کی تیسری شادی ہوئی۔ اس وقت وہ الہ آباد ہائی کورٹ کے وکیل تھے۔ یہ شادی الہ آباد کے ایک شخص میر امداد حسین کی لڑکی فاطمہ صغریٰ سے ہوئی جو خوش رو اور خوش سلیقہ تو تھی مگر زیادہ پڑھی لکھی نہ تھی۔(۹۵) شادی کے فوراً بعد سوکنوں کے جھگڑے شروع ہوگئے اور جیسا کہ قاعدہ ہے پہلی بیوی ہمدردیاں حاصل کرنے میں ناکام رہی۔ چنانچہ اکبر نے اسے چالیس روپے ماہوار کے عوض الگ کر دیا۔

پہلی بیوی سے اکبر کے دو بیٹے ہوئے: نذیر حسین اور عابد حسین' دونوں کی تعلیم و تربیت ڈھنگ سے نہ ہوئی۔ ان کے اکبر کے ساتھ تعلقات نہایت کشیدہ تھے۔ قمر الدین بدایونی لکھتے ہیں:

"باہر تو باہر خاص الہ آباد کے رہنے والے اکثر لوگ نہیں جانتے کہ یہ لوگ لسان العصر خان بہادر سید اکبر حسین صاحب جج کی اولاد ہیں۔"(۹۶)

"نذیر حسین عرف بدل میاں لاولد رہے۔ عابد حسین کے ایک فرزند عاشق حسین ہوئے— نذیر حسین گو جوان تھے لیکن افکار و امراض کے باعث بوڑھے معلوم ہوتے تھے — گلی چلتے مرگی کے دورے سے گرتے تھے۔ راہ گیر از راہ خدا ترسی اٹھا لاتے تھے۔"(۹۷)

قمر الدین نے نذیر حسین اور عابد حسین کو گڈمڈ کر دیا ہے۔ سید بشیر حسین "علی گڑھ میگزین" کے اکبر نمبر میں لکھتے ہیں:

"واقعہ یہ ہے کہ نذیر حسین صاحب پر مرگی کے دورے کبھی نہیں پڑتے تھے۔ وہ چھریرے بدن کے خوش رو جوان تھے۔ ہاں عابد حسین پر مرگی کے دورے پڑتے تھے۔ نذیر حسین صاحب لاولد نہیں تھے۔ ان کے لڑکے کا نام عاشق حسین تھا

جن کو عابد حسین کا لڑکا بتایا گیا ہے۔"(۹۸)

بشیر حسین، اکبر کے قریبی عزیز تھے۔ انہوں نے قمرالدین بدایونی کی اغلاط کی جانب جو اشارے کیے ہیں، ان کی تصدیق اکبر الہ آبادی کے غیر مطبوعہ خطوط سے بھی ہوتی ہے۔ اکبر نے کسی خط میں نذیر حسین کا ذکر نہیں کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس وقت تک وفات پا چکے تھے۔ البتہ بعض خطوط میں عابد حسین کا ذکر آتا ہے۔ ایک خط میں عشرت کو لکھتے ہیں:

"عابد کو جنون ہوگیا ہے۔ کوٹھڑی میں چار دن بند رہے۔"(۹۹)

اس سے قطعی طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ نذیر حسین نہیں البتہ عابد حسین ذہنی مریض تھے۔ ان واقعاتی غلطیوں سے قطع نظر ایک بات بالکل واضح ہے کہ اکبر کا سلوک ان سے اچھا نہ تھا۔ خواجہ حسن نظامی نے اس سلسلے میں ایک چشم دید واقعہ بیان کیا ہے:

"میں اس بات کو جانتا تھا کہ حضرت اکبر کی پہلی بیوی سے بھی کچھ اولاد تھی مگر اس اولاد کی نسبت مجھے کچھ زیادہ معلومات نہیں تھیں۔ حضرت اکبر کی وفات سے چند مہینے پہلے کا ذکر ہے کہ حضرت اکبر نے مجھے الہ آباد میں بلایا اور الہ آباد کے چند نامور علما اور مشائخ اور رؤسا کو "عشرت منزل" کے صحن کے کمرے میں جمع کیا۔ مکان کے کونے میں ایک نوجوان کو دیکھ کر کہا "یہ کون ہے؟" لوگوں نے کہا: "یہ آپ کے پوتے عاشق حسین ہیں۔" یہ سن کر حضرت اکبر کو غصہ آگیا اور فرمایا "یہ کیوں آئے ہیں؟" ان کو میں نے نہیں بلایا تھا۔ ان سے کہو ابھی چلے جائیں۔" چنانچہ عاشق حسین فوراً چلے گئے اور دوسرے لوگ بھی واپس چلے گئے۔ تب حضرت اکبر نے فرمایا "ان سب کو میں نے سب کچھ دے دیا۔ اس کے بعد بھی ان کے خرچ کا خیال رکھتا ہوں اور دیتا رہتا ہوں۔ پھر بھی یہ لوگ عشرت منزل اور عشرت میاں کے دوسرے حقوق میں مداخلت کرنا چاہتے ہیں۔"(۱۰۰)

حسن نظامی نے اس واقعے کو بہت کچھ اکبر کے حق میں بنانے کی کوشش کی ہے مگر اکبر کے بھانجے سید زاہد حسین کے فرزند سید بشیر حسین لکھتے ہیں:

"اکبر نے اپنی پہلی بیوی اور اس کی اولاد کے ساتھ جس ظلم اور بے انصافی کو روا رکھا، اس کے متعلق جو کچھ کہا جائے وہ کم ہے۔ کوتوالی سے پچھم کی جانب ایک وسیع میدان تھا جس میں جگہ جگہ قبریں تھیں۔ وہاں مرغ لڑائے جاتے تھے۔ وہ زمین خریدی جا چکی تھی۔ کوٹھی تعمیر ہوئی۔ مرغ خانے سے اس مقام کا

نام عشرت منزل ہوا۔ مگر یہ غریب مع اپنے دونوں لڑکوں کے چک پر رہتی تھیں۔ خدیجہ بی بی کا انتقال ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو ہوا۔ تازیست عشرت منزل میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں ملی۔ چند عجیب عبرت ناک واقعات پیش آئے جن کا ذکر بے سود اور خموشی بہتر ہے۔"(۱۰۱)

حقیقت یہ ہے کہ ناپسندیدہ اور الگ کی ہوئی بیوی کی اولاد شوہر کے لیے نفسیاتی مسئلہ بن جاتی ہے۔ یہی کیفیت اس سلسلے میں اکبر کی تھی۔

شاعری کا آغاز

اکبر نے شعر گوئی کا آغاز گیارہ برس کی عمر میں کیا۔ طالب الہ آبادی سید زاہد حسین کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ اکبر کے چچا وارث علی نے اسی عمر میں اکبر کا امتحان لیا تھا' یعنی ایک مصرعے پر گرہ لگانے کے لیے کہا تھا۔ اس امتحان میں اکبر کامیاب رہے۔(۱۰۲) اس کے بعد اکا دکا شعر کہتے رہے ہوں گے لیکن اس کی مثالیں ہمارے سامنے موجود نہیں۔ کلیات اکبر جلد اول سے معلوم ہوتا ہے کہ سترہ برس کی عمر سے اکبر ایسے شعر کہنے لگے تھے جو کلیات میں شامل ہو سکیں۔ ۱۸۷۰ء سے ۱۸۷۲ء کے درمیان وحید الدین وحید کے شاگرد ہوئے۔(۱۰۳) وحید کا سلسلہ تلمذ بشیر کے ذریعے خواجہ حیدر علی آتش سے جا ملتا ہے۔ (۱۰۴) آتش ایک سیلانی مزاج اور درویش صفت شاعر تھے اور وحید کا مزاج بھی ایسا ہی تھا۔ بشیر' آتش کے مشہور شاگردوں میں تو شمار نہیں ہوتے' پھر بھی بعض تذکروں میں ان کا ذکر ملتا ہے۔ اکبر کے زمانے میں الہ آباد کا شعری ماحول کسی بھی نوجوان کے دل میں ذوق شعر فہمی اور شوق شعر گوئی پیدا کرنے کے لیے کافی تھا۔ ہر طرف مشاعروں کی نشستیں جمتی تھیں۔ طرحی اور غیر طرحی مشاعرے ہوتے تھے۔ فی البدیہہ شعر کہے اور کہلوائے جاتے تھے۔ مسابقت کے جذبے سے شعرا بہتر سے بہتر شعر کہنے کی کوشش کرتے تھے۔ اکبر شروع شروع میں ایسی غزلیں کہتے تھے جو مسابقت کے اس ماحول میں شعرا کو داد دینے پر مجبور کر سکیں۔ مگر رفتہ رفتہ ان کے دل سے اس شاعری کی وقعت کم ہوتی گئی۔ زمانہ تیزی سے بدل رہا تھا۔ خود اکبر کے شعور میں بھی پختگی آ رہی تھی۔ معاشرتی مرتبے' مطالعے' تجربے اور مطمئن گھریلو زندگی نے انہیں دل کی دنیا سے باہر نکالا اور حالات کو تجزیاتی نظر سے دیکھنے پر مائل کیا۔ تیسری شادی کے بعد سے' یعنی ۱۸۷۷ء کے لگ بھگ' انہوں نے وحید و بشیر و آتش و ناسخ کا انداز غزل گوئی تقریباً ترک کر دیا اور اب ان کی غزلوں میں تیزی سے قومی اور سیاسی علامات شامل ہونے لگیں۔ اسی زمانے سے انہوں نے معاشرتی اصلاح کی غرض

سے مضامین بھی لکھنے شروع کیے۔ طالب الہ آبادی نے لکھا ہے:

"میری تحقیق یہ بتاتی ہے کہ اکبر نے ۱۸۷۴ء سے ۱۸۸۰ء تک ا۔ ح۔ الہ آبادی کے نام سے مضامین لکھے ہیں۔"(۱۰۵)

مگر یہ بات درست نہیں ہے۔ اکبر کے ۱۹۰۸ء تک کے نثری مضامین "علی گڑھ میگزین" کے اکبر نمبر میں دوبارہ چھاپ دئے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں مضمون نویسی کا آغاز ۱۸۷۷ء سے ہوا نہ کہ ۷۴ء سے۔(۱۰۶) ۱۸۷۴ء میں تو ابھی اودھ پنچ کا اجرا بھی نہیں ہوا تھا۔

۱۸۸۰ء کے لگ بھگ اکبر الہ آباد سے باہر کی دنیا میں آنے جانے لگے تھے۔ وہ بسلسلہ ملازمت مختلف شہروں میں رہنے لگے۔ الہ آباد کی محفلیں تو ختم ہوئیں مگر مختلف شہروں کی علمی اور ادبی مجالس کے ساتھ اکبر کا رابطہ رہتا تھا۔ ۱۸۸۲ء میں جب ان کا تبادلہ علی گڑھ میں ہوا تو وہاں کی علمی اور ادبی فضا کی وجہ سے اکبر کے ادبی مشاغل میں بھی اضافہ ہوا اور وہ پہلے سے زیادہ تصنیف و تالیف کی طرف مائل ہوئے۔ اس زمانے میں انہوں نے بلنٹ کی کتاب "فیوچر آف اسلام" کا ترجمہ کیا۔ بعدازاں جب مسٹر بلنٹ ہندوستان آئے اور یہاں مختلف مقامات پر خطاب کیے تو اکبر نے ان کی تقاریر کو بھی اردو میں منتقل کیا۔

اسی زمانے میں اردو ہندی نزاع شروع ہوا۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی اس تنازعے کی ہندوستان میں ابتدا ہوچکی تھی مگر جب سر انٹنی میکڈانل یوپی کا گورنر مقرر ہوا تو اس میں نئی جان پیدا ہوئی۔ گورنر مذکور ہندی کا زبردست حامی تھا۔ اس کے ایما سے اردو دشمنی کا آغاز ہوا اور ہندی کی حمایت اور اردو کے مخالفت میں مضمون چھپنے لگے۔ ان کا اصل مقصد مسلمانوں کو ہندوؤں کے مقابلے میں گرانا تھا۔ چنانچہ اکبر نے اردو ہندی کے نزاع پر ایک کتابچہ لکھا جو ۱۹۰۰ء میں "ایک مسلمان واقف کار کی رائے" کے نام سے شائع ہوا۔ (۱۰۷)

بیسویں صدی کے آغاز کے قریب قریب انگریزی معاشرت کے اثرات ہندوستان پر خاصے گہرے پڑنے لگے تھے۔ انگریزی زبان کا ذخیرہ الفاظ زبانوں پر چڑھ گیا تھا۔ لباس اور رہن سہن میں بھی انگریزوں کا تتبع کیا جانے لگا تھا۔ ہندوستان کے لوگ اپنی روایات کو مغربی تہذیب کے مقابلے میں کمتر سمجھنے لگے تھے۔ یہ سب باتیں اکبر پر شاق گزرتی تھیں۔ اس زمانے میں ان کا کلام طنز و ظرافت کے ذریعے ہندوستان کے لوگوں بالخصوص مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے مقاصد سے بھرپور ہے۔ انہوں نے درآمدی نظریات، لباس، رہن سہن اور تہذیب پر تنقید کر کے لوگوں کا احساس کمتری دور کرنے کی کوشش کی

ہے۔

ریٹائر ہونے کے بعد اکبر کی زندگی گوشہ نشینی میں بسر ہوئی۔ کثرت امراض اور صدمات نے ان کے بڑھاپے کو تلخ بنا دیا تھا اور پھر وفات تک عوارض و صدمات نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ اس قدر پریشانیاں برداشت کیں کہ مزید حوصلہ نہ رہا۔ چنانچہ انہوں نے تصوف میں پناہ لی۔ اکبر زندگی کے آخری بیس برسوں میں بالکل صوفی صافی اور تن بہ تقدیر ہوگئے تھے۔ احباب ملنے جلنے آجاتے تھے اور ان سے گفتگو کر کے وہ جی بہلا لیتے تھے۔ دوستوں' عزیزوں اور نیاز مندوں کے ساتھ خط و کتابت کا سلسلہ جاری تھا۔ عام طور پر دوچار سطروں سے زیادہ خط نہیں لکھتے تھے اور ان میں بھی اکثر امراض اور حوادث روزگار کا ذکر آجاتا تھا۔ بہرصورت ان کی زندگی کا یہ دور بھی واقعات سے بالکل خالی نہیں ہے' بلکہ اس کے بارے میں ہماری معلومات زیادہ صحیح ہیں کیونکہ ان واقعات کا ذکر ان کے خطوط میں موجود ہے۔

اکبر یہ سوچتے تھے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد ان کی زندگی پرسکون ہو جائے گی مگر مگر فی الحقیقت متعدد پریشانیاں ان کی منتظر تھیں۔ عشرت حسین نے لکھا ہے:

> "۱۹۰۳ء سے ۱۹۰۷ء تک کے پانچ سال ہمارے خاندان پر بہت نازک گزرے۔ حضرت قبلہ کی بینائی روز بروز خراب ہوتی جاتی تھیں۔ پنشن لے لینے کے سبب تنخواہ صرف ساڑھے تین سو رہ گئی تھی۔ اخراجات کا وہی حال اور پھر میرا ولایت کا خرچ۔"(۱۰۸)

اکبر ۱۹۰۷ء میں آنکھ کا آپریشن کرانے کی غرض سے کلکتے گئے جہاں ڈاکٹر مینارڈ نے اپریشن کیا۔ اپریشن کامیاب رہا اور جو معذوری بسبب ضعف بینائی کے پیدا ہوگئی تھی دور ہوئی۔(۱۰۹) ۱۹۰۷ء ہی میں اکبر کی دوسری پریشانی بھی ختم ہوئی بلکہ کوشش سے ختم کی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اپنے بیٹے عشرت حسین کو انہوں نے مجبوراً انگلستان بھجوایا تھا۔ عشرت حسین اولاً دو برس کے لیے گئے تھے مگر ایک برس کی مزید اجازت طلب کی جو مل گئی۔ ۱۹۰۲ء میں انہوں نے لاٹرائی پوس کے امتحان کا پہلا حصہ پاس کیا۔ ۱۹۰۴ء میں دوسرے درجے کے امتحان میں بیٹھے مگر کامیاب نہ ہوئے۔ دسمبر ۱۹۰۴ء میں یہ امتحان تو پاس کر لیا مگر اب یورپ میں ان کا دل اس قدر لگ گیا کہ ہندوستان جانے کا ارادہ ترک ہوا۔ انگلستان میں تلاش معاش کی متعدد کوششیں کیں مگر کامیابی نہ ہوئی۔ اکبر پنشن لینے کے سبب زیادہ ہی زیر بار ہوگئے تھے' اس لیے انہوں نے عشرت کو بار بار ہندوستان واپس آنے کے لیے لکھا' مگر جب عشرت نے کوئی پروا نہ کی تو خرچ بھیجنا بند کر دیا۔ مجبوراً ۱۹۰۷ میں عشرت الہ

آباد واپس ہوئے۔ اس سے اکبر کا ایک اور بڑا بوجھ دور ہوا۔

ابھی دو تین ہی برس سکون سے گزرے تھے کہ اکبر کو ایک بڑا حادثہ پیش آیا۔ ۲۴ اکتوبر ۱۹۱۰ء کو اکبر کی تیسری بیوی یعنی والدہ عشرت حسین وفات پا گئیں۔ اکبر کو ان سے بہت محبت تھی۔ کسی بھی دیرینہ رفیق سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ جانے کا غم ناقابل برداشت ہوتا ہے اور پھر محب و غم گسار کی جدائی! اس حادثے کا ذکر ان کے خطوط میں کئی جگہ ہوا ہے:

"قطع نظر دلی صدمے اور ابتری انتظام خانہ داری کے، جس کی اصلاح کچھ نہیں ہو سکتی، میرے لیے بڑی مصیبت یہ ہے کہ ایک چھوٹا لڑکا گیارہ سال کی عمر کا اب میرے ذمے ہے۔ وہ اپنی ماں سے بے حد مانوس تھا۔ اس کے سبب سے بہت کچھ آزادی جاتی رہی۔" (۱۱۰)

ابھی اس حادثے سے پوری طرح سنبھلنے نہ پائے تھے کہ ۵ جون ۱۹۱۳ء کو یہ لڑکا بھی جس کا نام ہاشم تھا بہ عمر ۱۳ سال وفات پا گیا۔ یہ صدمہ اس عمر میں اکبر کے لیے ناقابل برداشت تھا اور اگر اس صدمے کو جھیل کر بھی وہ چند سال اور زندہ رہے تو اس کی وجہ محض "ذوق تصوف" تھا جس کی وجہ سے وہ اس عقیدے پر راسخ ہو چکے تھے کہ "ہر کام میں خدا کوئی مصلحت پوشیدہ رکھتا ہے۔" ہاشم کی وفات پر اپنے احباب کو انہوں نے جو خطوط لکھے ہیں وہ اس طرح کے ہیں۔ میرزا ہادی عزیز لکھنوی کو لکھتے ہیں:

"میرے معین اور ہمدرد! خدا آپ کو تندرست رکھے! آپ کس طرح اس خبر کو سننے کو تیار ہوں گے کہ میرے نور نظر، زندگی کے سہارے ہاشم نے ۵ جون کو دنیا سے رحلت کی۔ بیس دن علیل رہا۔ چیچک نکل کر دانے ڈھل گئے تھے، لیکن پھر تپ آئی اور بالآخر سرسام ہو گیا۔ جو حالات موجود تھے، ان سے آپ آگاہ ہیں۔ اسی لڑکے سے گھر تھا۔ وہ میرے سانچے میں ڈھل رہا تھا۔ بہت کچھ ترقی کی تھی۔ افسوس کہ چودھویں سال میں یہ ماہ پارہ غروب ہو کر نظر کو تیرہ و تار کر گیا۔ میں زیادہ نہیں لکھ سکتا۔ ایسے ہونہار بچے کا اٹھ جانا اور میرا بالکل دل شکستہ ہو جانا اس کی توضیح کے لیے مذہبی فلسفے میں بہت تعمق چاہیے۔ میں اس وقت مضطرب ہوں۔ ضبط تو کر رہا ہوں لیکن ابا ابا کی آواز کانوں میں گونجتی ہے۔ اس لڑکے نے شعر اور اردو لٹریچر میں بہت بصیرت حاصل کر لی تھی۔" (۱۱۱)

میرزا سلطان احمد کو لکھتے ہیں:

"مرحوم بچے کے ساتھ جو تھوڑی سی حلاوت زندگی باقی تھی، وہ بھی جاتی رہی۔ مجھ پر گویا ایک شدید آپریشن ہوا اور خار تعلق دنیا نکل گیا لیکن خود آپریشن کا

زخم قیامت ہے۔"(۱۱۲)

شاعری میں بھی اس صدمے کا بے ساختہ اظہار ہوا ہے۔ یہ شعر کس قدر دردناک ہے:

مایوس ہوں باغ عالم میں' امید سے یاری چھوٹ گئی
جس پیڑ کو سینچا سوکھ گیا جس شاخ کو باندھا ٹوٹ گئی

ان حوادث کے بعد اکبر کی صحت بالکل جواب دے گئی اور کئی قسم کے امراض حملہ آور ہوئے۔ عمر کے آخری آٹھ سال انہوں نے آرزوئے مرگ میں گزارے۔ بہت آزردہ رہتے تھے۔ احباب کے نام جو خطوط انہوں نے اس زمانے میں لکھے ہیں' ان میں تواتر کے ساتھ ضعف بدن اور کثرت امراض کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس زمانے کے بیشتر خطوط چونکہ موجود ہیں' اس لیے ان برسوں میں ان کی جو بدنی اور ذہنی کیفیتیں تھیں' ان سے قاری بخوبی آگاہ ہو جاتا ہے:

"میں دنیا سے اس قدر دل برداشتہ ہوگیا ہوں کہ شاید اتنا نہ ہونا چاہیے۔ سبب یہ ہے کہ تعلقات منقطع ہیں۔ طول امل کا وقت نہیں۔ عبرت و فنا پیش نظر ہے۔ میری ایک نو تصنیف غزل کا شعر ہے:

دنیا کی کیا حقیقت اور ہم کو کیا تعلق
وہ کیا ہے اک جھلک ہے' ہم کیا ہیں اک نظر ہیں"(۱۱۳)

(۹ مارچ ۱۹۱۴ء)

"یہاں گرمی بہت ہوتی ہے۔(۱۱۴) دہرہ دون کے لیے اٹھا۔ پہلی منزل ۹ مارچ کو لکھنؤ میں ہوئی۔ وہاں ایسا بیمار ہوگیا کہ بہ مجبوری ۱۷ مارچ کو پھر الہ آباد واپس آیا۔ ہنوز اچھا نہیں ہوں۔ اس عمر میں ان آلام میں کیا اچھا رہ سکتا ہوں۔ خدا کی کچھ مصلحت ہوگی کہ زندہ ہوں۔"(۱۱۵)

(۶ اپریل ۱۹۱۴ء)

"میرے مغموم دل کی حالت میں اب کیا تغیر ہو سکتا ہے۔ اس شعر سے میرا حال ظاہر ہوگا:

ان مصائب میں بھی مایوس نہیں ہوں اکبر
قید ہستی سے رہائی کی خوشی باقی ہے"(۱۱۶)

"تین چار دن ہوئے میں نماز عشاء کو کھڑا ہوا تو کھڑا نہ رہ سکا۔ دماغ میں پریشانی اور اعضا میں سنسناہٹ محسوس ہوئی۔ کہا کہ بیٹھ کر پڑھوں گا لیکن بیٹھ بھی نہ سکا' لیٹ گیا۔ ایک بجے کے قریب آنکھ لگ گئی۔ حزین و زار تو ہوں ہی۔ گرمی کی شدت طرہ۔ دوسرے دن پھر دورہ ہوا' تیسرے دن پھر مگر خفت کے ساتھ۔ لیکن گرمی اتنی ہوئی کہ الامان۔ کہتا تھا کہ فوراً دہرہ دون چلا جاؤں یا کیا کروں۔ مشتاق زندگی نہیں رہا لیکن تکالیف سے بہرحال پناہ مانگتا

ہوں۔"(۱۱۷)
(۱۸ جون ۱۹۱۴ ع)

"ابر رحمت آیا اور سماں بدل دیا۔ وہ تکلیف خارجی گرمی کی جاتی رہی، لیکن صفرائے مخترقہ کا ہیجان ہو گیا ہے۔ فم معدہ پر اختلاج محسوس ہوتا ہے، تبخیر بہت ہوتی ہے، ضعف ہے، دل مایوس ہے۔ کچھ مدد نہیں ملتی۔ ایک قدرتی مشین ہے چلی جاتی ہے:

اب میری زندگی میں نہیں نور انبساط
یہ شمع جل رہی ہے مگر ہے بجھی ہوئی"(۱۱۸)

(۱۸ جون ۱۹۱۴ ع)

"کیا بتاؤں کس عالم میں رہتا ہوں۔ ہر روز دس پانچ مرتبہ ایک شعلہ حسرت سینے میں مشتعل ہو کر دل جلاتا اور مجھ کو تڑپاتا ہے۔ خودکشی ناجائز اور زندگی بے حلاوت۔ خدا سے امید مغفرت رکھتا ہوں۔ یہی زندگی کا سہارا ہے۔(۱۱۹)
(۱۴ جنوری ۱۹۱۵ ع)

"میں مہمان چند روزہ ہوں۔ حواس تو رخصت ہو چکے ہیں۔ زندگی بھی پا بر کاب ہے۔(۱۲۰)
(۳ جنون ۱۹۱۵ ع)

"ڈیڑھ مہینے تک میں دانتوں اور مسوڑھوں کے ورم و درد میں مبتلا رہا۔ سخت تکلیف اٹھائی۔ کھانا دشوار، پینا مشکل، نماز میں دقت، سجدہ اشاروں سے کرتا رہا۔ اب کچھ افاقہ ہے۔ زندگی سے اکتا گیا ہوں لیکن اس کی مرضی۔(۱۲۱)
(۹ جولائی ۱۹۱۵ ع)

"میں علالت وغم و ترددات کے سبب سے اس قدر افسردہ رہتا ہوں کہ زندگانی بار ہے۔"(۱۲۲)
(۵ دسمبر ۱۹۱۵ ع)

"اس تمنا میں کہ حور(۱۲۳) کے نکاح کے وقت وہاں موجود ہوں کل میں الہ آباد سے روانہ ہوا۔۔۔ ریل چلی اور ہم خوش تھے کہ دوپہر کو خواجہ صاحب کے ساتھ کھانا کھاتے ہوں گے اور نیدھا(۱۲۴) حور کی بلائیں لیتی ہو گی۔۔۔ مجھ کو غیر معمولی قبض کی شکایت تھی۔ فتح پور پہنچ کر کچھ غذا ہوئی۔ پھر لیٹ رہا۔ کچھ آگے بڑھ کر احتباس ریاح اور ناتوانی اعصاب سے اس قدر شدت سے بے چین ہوا کہ حواس مختل ہو گئے۔ کانپور میں بہ مجبوری اتر پڑا۔(۱۲۵)
(۲۶ اکتوبر ۱۹۱۶ ع)

"طبیعت اچھی نہیں رہتی۔ ہمہ تن تبخیر سوداوی ہوا جاتا ہوں۔(۱۲۶)
(۸ مئی ۱۹۱۷ ع)

"عشرت پکھری گئے ہیں۔ دوپہر کا وقت ہے۔ سناٹا ہے، پریشان اور تند ہوائیں چل رہی ہیں۔ لیکن ساتھ ہی درد سر بھی ہے، داغ دل بھی تازہ ہو گئے ہیں۔ عبرت قضا کا سبق پیش نظر ہے۔(۱۲۷)
(۲۱ فروری ۱۹۱۸ ع)

بائیس دن سے بیمار ہوں۔ غذا ترک ہے۔ کھا ہی نہیں سکتا۔ سینے پر ہیجان تبخیرات سے کبھی

کبھی دم رکنے لگتا ہے- نزلہ ہوا تھا- بلغم بگڑ گیا- ڈاکٹر معالج ہیں- حسن نظامی صاحب کو تار دے کر بلایا- عشرت کے اہل و عیال آ گئے ہیں- دل برداشتہ ہوں' لکھنا بار ہے-(۱۲۸)

(۱۹ نومبر ۱۹۱۸ ع)

"بیس دن سے بائیں پاؤں میں درد ہو گیا ہے- چلنا دشوار ہے- ہنوز کوئی تدبیر سود مند نہ ہوئی- شاید جراحت کی ضرورت پڑے- انقباض خاطر کی حد نہیں- اس کے بہت سے اسباب ہیں-(۱۲۹)

(۱۱ فروری ۱۹۱۹ ع)

"عمر ۷۵ سال' آلام ایسے' عوارض کا یہ حال کہ ۱۸ گھنٹے باوقات مختلف تکلیف دہ احساس بوجہ ضعف اعصاب کے ہوا کرتا ہے اور سمجھتا ہوں کہ نزع قریب ہے- ہم نشینوں کو یہ حالت نہیں معلوم ہوتی ہے-(۱۳۰)

(۱۵ اپریل ۱۹۱۹ ع)

"میں اس وقت سخت بیمار ہوں- دانت کا درد دو دن کے بعد رخصت ہو گیا ہے- زکام شروع ہوا' تین دن جاری رہا لیکن اس کے بعد شدید اعضا شکنی بخار کے بعد رہی- اب تین دن سے نہ بھوک ہے نہ پیاس- دوران سر اس قدر کہ دو قدم چلنا دشوار ہے- ایک خفقان کی سی صورت ہے- ناتوانی کی حد نہیں-(۱۳۱)

(۲۷ اگست ۱۹۱۹ ع)

"میں اس عمر میں ایسی تکلیفیں اٹھا رہا ہوں کہ تعجب ہوتا ہے کہ پھر حواس واپس آ جاتے ہیں- درد سر' تبخیر سوداوی اور ضعف مثانہ• اور شدت اوہام سے بہت تکلیف اٹھا رہا ہوں-(۱۳۲)

(۱۵ اکتوبر ۱۹۱۹ ع)

"اپنا کیا حال لکھوں- جس قدر میں زندگی سے تنگ ہوں' زندگی کو اس کا اندازہ نہیں' ورنہ میرے ساتھ ہمدردی کرتی اور ختم ہو جاتی-(۱۳۳)

۲۷ اگست ۱۹۲۱ ع)

اس خط کے صرف تیرہ دن بعد ان کا انتقال ہو گیا- یہ اقتباسات جو ان کے خطوں سے نقل کیے گئے ہیں' یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ اکبر کے آخری چند برس کن جسمانی اور ذہنی تکالیف میں بسر ہوئے- کسی اور کو اس قدر عارضے لاحق ہوتے تو وہ دنیا سے بالکل بے تعلق ہو جاتا' مگر اکبر اتنے باہمت تھے کہ اس حالت میں بھی احباب کے خطوط کے جواب لکھتے رہتے تھے- ذرا افاقہ ہوتا تو دوستوں سے ملاقات کے لیے دور دراز کا سفر کرنا بھی گوارا فرما لیتے- اس کے علاوہ اخبار میں اگر کوئی ناگوار بحث ان کے متعلق چھڑ جاتی تو مختصر جواب ارسال فرما دیتے- دوستوں کے علمی اور ادبی استفسارات کا جواب اس حالت میں بھی دینا اپنا فرض سمجھتے تھے-

"انتخاب اشعار کا مسئلہ پیچیدہ ہے- میرا یہ خیال ہے کہ مجموعہ تذکرہ شعرا نہ ہو بلکہ مجموعہ اشعار ہو- شاعر کا نام اور پتہ نام کے لیے ہو- اردو کے اشعار بھی

داخل ہوں- زیادہ تر تصوف اور اخلاق کیونکہ یہی چیز اس کو ممتاز کرے گی- فارسی میں صائب، حزیں، بیدل، خاقانی، عرفی وغیرہ وغیرہ کو لیں- اشعار بہت دقیق نہ ہوں یا کہیں کہیں توضیح کر دی جائے- اردو میں انیس، دبیر، آتش، ناسخ، حالی شاد وغیرہ ہیں- میرے دیوان میں بھی غالباً ان کو بہت اشعار مل جائیں گے-"(۱۳۴)

"مدتیں گزریں میں نے جسمانی آرام اور تکلیف اور دلی خوشی اور رنج کا مضمون پیش نظر رکھ کر یہ خیال کیا تھا کہ آرام اور رنج کا ساتھ ہو سکتا ہے- یہ کوئی نازک خیالی نہ تھی لیکن اس بنیاد پر سلسلہ مضمون چل نکلا تھا اور پورا نہ ہوا اور میں اور کاموں میں الجھ گیا- اس ضمن میں پلیژر، پین اور چند دیگر الفاظ کے متعلق کچھ نوٹ کیے تھے- "الہلال" میں یہ بحث دیکھ کر میں نے بغیر زیادہ غور کیے ایک خط ایڈیٹر صاحب کو لکھ دیا جس کو انہوں نے چھاپ دیا- جہاں کانکریٹ آئیڈیاز نہیں ہیں وہاں ایک زبان کے ایک لفظ کے مقابلے میں دوسری زبان میں کوئی لفظ پایا جانا، جو بلحاظ تمام شیڈس آف مینگ کے بالکل مطابق ہو، بہت مشکل ہے-(۱۳۵)

"ترجمہ کرنے والے کو اس زبان میں، جس میں ترجمہ کیا جائے، زیادہ تجربہ چاہیے کیونکہ بہ نسبت سمجھنے کے سمجھانا مشکل ہے- لیکن میں دیکھتا ہوں کہ آپ زبان عربی کے قواعد سے بیگانہ نہیں ہیں، لہٰذا ان پر ہر طرح اطمینان ہے- مجھ کو بہت شبہہ ہے کہ یہ الفاظ جن کو ہم جمع کرتے ہیں کبھی وہ زندگی پائیں گے جو مغربی فلسفیانہ الفاظ کو حاصل ہے-(۱۳۶)

"Pain اور Pleasure کا ترجمہ دکھ سکھ بہت اچھا ہے لیکن یہ الفاظ اس انجمن میں بے وقعت ہیں-(۱۳۷)

"اتفاقاً مولوی حمیدالدین صاحب سے ملاقات ہوئی- وہ فرماتے تھے کہ Prestige کا ترجمہ 'دھاک' صحیح ہے- میں نے کچھ کہا نہیں لیکن یہ خیال آیا شاید رعب میں بھی مطلب پورا ہو جاتا ہے- میں تو اردو میں مفہوم کے اعتبار سے سطوت کو پاکیزہ لفظ سمجھتا ہوں البتہ 'خود تاثری' کی ترتیب صحیح نہ معلوم ہوئی- یائے توصیفی میں اسم صفت بڑھاتے ہیں- 'خود متاثری' البتہ ہو سکتا ہے- بعد استعمال غیر مانوس نہ رہے گا-(۱۳۸)

"Prestige کے لیے ایک لفظ وقار، رات میرے ذہن میں آیا، لیکن صرف اردو

بول چال میں یہ لفظ اس آئڈیا کے قریب ہے: تمہارا وقار جاتا رہا- تمہارا بڑا وقار ہے- 'حظ' کا ٹھیک اوپوزٹ ٹرم مجھ کو سوائے 'حرمان' کے کوئی نہیں ملتا- لیکن حرمان میں Pain کا آئڈیا صریحی نہیں ہے- اردو میں مایوسی کے معنی میں شعراء کی زبان پر ہے- 'یاس و حرمان' غالباً کہہ سکتے ہیں-(۱۳۹)

اس طرح کی علمی بحثوں سے قطع نظر عمر کے آخری چند برسوں انہیں ایک شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا- رسالۂ تہذیب نسواں لاہور نے کلام اکبر پر اعتراضات کئے خصوصاً اکبر کے جو اشعار عورت اور پردے کے متعلق ہیں ان کے پیش نظر اکبر کو رجعت پسند تعلیم نسواں کا مخالف اور خدا جانے کیا کیا کچھ قراد دے ڈالا-(۱۴۰) اکبر کی عمراب ختم ہو رہی تھی- انہوں نے اس کا بہت معمولی نوٹس کیا اور بحث کو اس پر ختم کر دیا:

شعر اکبر کو سمجھ لو یادگار انقلاب
یہ اسے معلوم ہے ٹلتی نہیں آئی ہوئی

ان آخری برسوں کی افسردہ دل شکستہ اور بجھی بجھی زندگی کے ساتھ کئی برسوں تک اکبر کو موت کا انتظار کرنا پڑا- آخر موت کا وقت معین آپہنچا' چنانچہ ۶ محرم ۱۳۴۰ھ مطابق ۹ ستمبر ۱۹۲۱ع کو انہوں نے الہ آباد میں وفات پائی- وفات کی کچھ تفصیلات خواجہ حسن نظامی نے اپنے مضمون میں تحریر کی ہیں:

"جمعے کے دن گیارہ بجے میں الہ آباد پہنچا- اس وقت حضرت کے فرزند عشرت حسین کے سوا کوئی احباب و اقربا میں سے موجود نہ تھا- حضرت گاؤ تکیے ک کے سہارے لیٹے تھے- آنکھیں نیم باز تھیں- پتلیاں اوپر کو چڑھ چکی تھیں- ناک کا بانسہ ڈھل گیا تھا- آخری پسینہ آ رہا تھا- پاؤں سمٹے ہوئے تھے- میں قریب بیٹھا تو عشرت میاں نے کہا خواجہ صاحب دلی سے آئے ہیں- اس کا جواب نہ دیا- میں نے ہاتھ کو اٹھا کر چوما اور آنکھوں سے لگایا- جب بھی بظاہر انہیں خبر نہ ہوئی- اس کے بعد میں حزب البحر آواز سے پڑھنے لگا اور جب یہ فقرہ پڑھا نعم الرب ربی و نعم الحسب حسبی (اچھا خدا میرا خدا اور اچھا ٹھکانا میرا ٹھکانا) عین اللہ ناظرۃ الینا (خدا کی آنکھ ہماری طرف دیکھ رہی ہے) تو ہاتھ سے کچھ اشارہ سا کیا- میں نے ان فقروں کی تکرار کی- حزب البحر کے بعد میں کلمہ پڑھنے لگا اور جب میں نے پڑھا "لا موجود الا اللہ" تو حضرت کے ہاتھوں میں رعشے کی سی جنبش ہوئی اور میں نے دیکھا کہ ہونٹوں کو بھی جنبش ہے- کچھ پڑھ رہے ہیں- رفتہ رفتہ سانس ہلکا ہونے لگا اور تین بجنے میں تین منٹ باقی تھے کہ سانس ختم ہو گیا اور زندگی پوری ہوئی- اناللہ و انا الیہ راجعون-(۱۴۱)

حواشی

۱- یہ شجرہ نسب اکبر کے پوتے سید محمد مسلم رضوی کے پاس موجود ہے رضوی صاحب نے مجھے دکھایا تھا۔
۲- حیات اکبر، ص ۴۵ (حاشیہ از محمد واحدی)
۳- حیات اکبر، ص ۴۴
۴- حیات اکبر، ص ۴۹
۵- حیات اکبر، ص ۴۷
۶- بزم اکبر، ص ۱۵
۷- اکبر الہ آبادی، ص ۳۱
۸- اکبر الہ آبادی، ص ۳۱
۹- دیکھیے اکبر الہٰ آبادی، مصنفہ طالب، ص ۳۱- ۳۲
۱۰- اکبر الہ آبادی، ص ۳۲
۱۱- اکبر الہ آبادی، ص ۳۲
۱۲- اکبر حسن اپریل ۱۹۰۱ع میں فوت ہوئے- ادب سے انہیں بھی بہت دلچسپی تھی- اکبر الہ آبادی کی ایک مشہور نظم آب لوڈور میں ان کا ذکر اس طرح آیا ہے:

یہ کہتے ہیں اب مجھ سے بھائی حسن
کہ میں بھی ہوں اس بحر میں غوطہ زن

اکبر ایک خط میں عشرت کو لکھتے ہیں "حسن کا انتقال ایک بہت ہی سخت اور غیر معمولی واقعہ ہے" (غیر مطبوعہ خط نیشنل میوزیم کراچی، محررہ ۲۵ اپریل ۱۹۰۱)
۱۳- حیات اکبر، ص ۴۶
۱۴- حیات اکبر، ص ۴۶ (حاشیہ حسن نظامی)
۱۵- خورشید عالم کے اعداد: خ = ۶۰۰، و = ۶، ر = ۲۰۰، ش = ۳۰۰، ی = ۱۰، د = ۴، ع = ۷۰، الف = ۱، ل = ۳۰، م = ۴۰ (کل اعداد = ۱۲۶۱)
۱۶- حیات اکبر، ص ۴۵
۱۷- حیات اکبر، ص ۴۵ (حاشیہ از ملا واحدی)
۱۸- روح اکبر، ص ۷
۱۹- تاریخ ادب اردو، ص ۴۲۹
۲۰- ہسٹری آف اردو لٹریچر، ص ۳۰۴
۲۱- علی گڑھ میگزین، ص ۶۰
۲۲- لسان العصر اکبر الہ آبادی، ص ۵
۲۳- بزم اکبر، ص ۱۵

۲۴- تاریخ ادبیات پنجاب یونیورسٹی' ص ۱۳۸ (اردو ادب' جلد چہارم)
۲۵- فرہنگ عامرہ' ص ۷۱۶
۲۶- گل رعنا' ص ۴۸۶
۲۷- اکبر الہ آبادی' ص ۲۸
۲۸- اکبر الہ آبادی ص ۳۴
۲۹- اس بحث کے لیے مندرجہ ذیل کتاب سے مدد لی گئی ہے :

The Muslim and Christian calenders by Freeman and grenville.

۳۰- حیات اکبر' ص ۶۰ تا ۶۲
۳۱- Famous Urdu poets and writers, Lahore: 1947, p.106
۳۲- غیر مطبوعہ خط' مخزونہ قومی عجائب خانہ' کراچی' نمبر این- ایم ۱۴/۷۸- ۱۹۵۸-
۳۳- گل رعنا' ص ۴۸۶-
۳۴- حیات اکبر' ص ۴۵-
۳۵- مراۃ الشعراء' ص ۵۹ (ج ۲)-
۳۶- روح اکبر' ص ۷-
۳۷- کلام اکبر الہ آبادی' ص ۳-
۳۸- رقعات اکبر' ص ۹-
۳۹- بزم اکبر' ص ۱۵-
۴۰- اکبر الہ آبادی' ص ۲۸-
۴۱- حیات اکبر' ص ۴۶-۴۵ (حاشیہ از محمد واحدی)-
۴۲- اس سلسلے میں "حیات اکبر" کے مندرجہ ذیل صفحات ملاحظہ ہوں ۴۷ تا ۵۵ اور ۲۲۹ نیز ۲۳۲-
۴۳- حیات اکبر' ص ۴۹-
۴۴- Imperial Gazeteer of India, Volume xi, page 199
۴۵- حیات اکبر' ص ۴۹-
۴۶- یوسف سلیم چشتی رقم طراز ہیں "میں نے بھی اپنے بچپن میں یہ کتاب پڑھی تھی- اس کی قیمت صرف ۳ پائی یعنی ایک پیسہ تھی"- (شرح تلمیحات و شرح مشکلات اکبر' صفحہ ظ)-
۴۷- حیات اکبر' ص ۵۰-
۴۸- حیات اکبر' ص ۵۱-
۴۹- حیات اکبر' ص ۵۲-
۵۰- حیات اکبر' ص ۵۴-
۵۱- حیات اکبر' ص ۵۴-

۵۲- حیات اکبر، ص ۵۹-
۵۳- ۱۸۵۷ ع سے قبل گندم روپے کی ایک من تھی- (اکنامک ہسٹری آف انڈیا مصنفہ مکرجی)-
۵۴- اکبر الہ آبادی، ص ۳۵-
۵۵- حیات اکبر، ص ۷۰-
۵۶- اکبر الہ آبادی، ص ۳۶-
۵۷- مکاتیب اکبر، ص ۵۵ (بنام عبدالماجد دریابادی)-
۵۸- جس کتاب کی طرف اشارہ ہے اس کا نام Religion and Reality ہے-
۵۹- مکاتیب اکبر، حصہ دوم، ص ۶۱ (بنام عبدالماجد دریا بادی)-
۶۰- ایضاً ص ۷۵-
۶۱- نیشنل میوزیم کراچی میں ان کے انگریزی خطوط موجود ہیں جو انہوں نے اپنے فرزند سید عشرت حسین کو انگلستان بھیجے تھے- ان کی کل تعداد سوا دو سو ہے- یہ خطوط انگریزی زبان سے ان کی واقفیت کا ناقابل تردید ثبوت ہیں- ان کی مثالیں ضمیمہ ۳ میں درج کی گئی ہیں- (م- ز)-
۶۲ ان دونوں واقعات کی تفصیل 'حیات اکبر' میں، ص ۶۰ تا ۶۴ پر موجود ہے-
۶۳- حیات اکبر، ص ۶۵-
۶۴- بزم اکبر، ص ۴۱-
۶۵- بزم اکبر، ص ۴۰-
۶۶- اکبر الہ آبادی: طالب الہ آبادی، ص ۴۸-
۶۷- "حیات اکبر" میں اس کا سنہ ۱۸۷۶ع تحریر ہے طالب نے لکھا ہے: ۱۸۶۶ع کے قریب خیال آیا کہ وکالت کا امتحان دے دو" (اکبر الہ آبادی: صفحہ ۴۸)- قمربدایونی نے بزم اکبر میں ۱۸۶۷ع لکھا ہے (صفحہ ۴۰)- بظاہر یہی صحیح معلوم ہوتا ہے- حیات اکبر میں بعد کے واقعات کے سنین ۱۸۶۸ع اور ۱۸۶۹ع لکھے ہوئے ہیں- اس سے خیال ہوتا ہے کہ سہو کتابت سے ۱۸۶۷ء کی بجائے ۱۸۷۶ء لکھا گیا ہے- دونوں سنین میں محض ۶ اور ۷ کے ہندسوں کی جگہ تبدیل ہوئی ہے- ایسی غلطی جلدی میں لکھتے وقت مصنف یا کاتب سے ہونی ممکن ہے- (م- ز)-
۶۸- بزم اکبر، ۴۰-
۶۹- حیات اکبر، ص ۸۴-
۷۰- نیشنل میوزیم کراچی سے مجھے اکبر کی ایک بیاض ملی ہے جس میں ان کی جوڈیشل سروس کا مکمل نقشہ مع تواریخ و سنین درج ہے- یہ سید عشرت حسین کا لکھا ہوا معلوم ہے- ان کی ملازمت کے سنین کے سلسلے میں اسی نقشے کو بنیاد بنایا گیا ہے- یہ نقشہ ضمیمہ ۲ میں ملاحظہ ہو-

۷۱- حیات اکبر، ص ۸۶-
۷۲- حیات اکبر، ص ۸۷-
۷۳- یہ تمام سنین مذکورہ بال نقشے کی بنیاد پر تحریر کیے گئے ہیں-
۷۴- حیات اکبر، ص ۹۴-
۷۵- خط مخزونہ نیشنل میوزیم کراچی، محررہ ۷ مئی ۱۹۰۲ع نمبر این ایم ۳۱/ ۱۳۱- ۱۹۵۸-
۷۶- اکبر کا غیر مطبوعہ خط بنام عشرت، مخزونہ ۱۹ نومبر ۱۹۰۳ع، محررہ نیشنل میوزیم کراچی، نمبر ایم ایم- ۱۴/ ۷۰- ۱۹۵۸-
۷۷- خط محررہ ۱۰ دسمبر ۱۹۰۳ع، مخزونہ نیشنل میوزیم کراچی، نمبر این ایم- ۱۴/ ۷۰- ۱۹۵۸-
۷۸- بزم اکبر، ص ۴۳-
۷۹- لسان العصر اکبر الہ آبادی، ص ۷-
۸۰- تاریخ ادبیات، جلد چہارم (اردو)، ص ۱۳۸-
۸۱- ملاحظہ ہو ضمیمہ نمبر ۲-
۸۲- اکبر الہ آبادی ۳۸۷-
۸۳- مراۃ الشعرا، ص ۵۹ (جلد دوم)-
۸۴- اکبر کا غیر مطبوعہ خط بنام عشرت، محررہ ۸ ستمبر ۱۹۱۷ع مخزونہ نیشنل میوزیم کراچی، نمبر این- ایم ۵۶/ ۱۰۹- ۱۹۵۸-
۸۵- علی گڑھ میگزین، اکبر، نمبر، ص ۶۳-
۸۶- حیات اکبر، ص ۹۳-
۸۷- نیشنل میوزیم کراچی میں اکبر کے کاغذات سے یہ فیصلہ ملا ہے- نمبر این- ایم ۲۰۰- ۱۹۵۹-
۸۸- حیات اکبر، ص ۴۲-
۸۹- بزم اکبر، ص ۲۰-
۹۰- مسودہ حیات اکبر مخزونہ نیشنل میوزیم کراچی نمبر این- ایم ۱۹۹- ۱۹۵۸-
۹۱- وحید کا سال ولادت ۱۸۲۹ع کے قریب ہے- اکبر ۱۸۴۵ع میں پیدا ہوئے- اس اعتبار سے دونوں کی عمروں میں تقریباً پندرہ سولہ سال کا تفاوت ہے-
۹۲- بزم اکبر، ص ۳۳-
۹۳- مسودہ حیات اکبر، مخزونہ نیشنل میوزیم کراچی، مطبوعہ حیات اکبر میں سے ملا واحدی نے یہ واقعہ خارج کر دیا ہے-
۹۴- اکبر نامہ، عبدالماجد دریا بادی، ص ۱۷۶- ۱۷۸-
۹۵- فاطمہ صغریٰ اکبری بیگم کے نام سے مشہور ہوئیں انہوں نے اپنے بیٹے عشرت کے نام جو خطوط لکھے ہیں نیشنل میوزیم کراچی میں محفوظ ہیں، ان میں معمولی معمولی لفظوں کی

املا بھی غلط ہے۔

۹۶۔ بزم اکبر' ص ۲۴۔

۹۷۔ بزم اکبر' ص ۲۴۔

۹۸۔ علی گڑھ میگزین' اکبر نمبر' ص ۵۶۔

۹۹۔ غیر مطبوعہ خط بنام عشرت' محررہ ۷ دسمبر ۱۹۱۵ع' مخزونہ نیشنل میوزیم کراچی نمبر این۔ ایم ۳۰/ ۸۷۔ ۱۹۵۸۔

۱۰۰۔ حیات اکبر' ص ۲۹ (حاشیہ از حسن نظامی)۔

۱۰۱۔ علی گڑھ میگزین' اکبر نمبر' ص ۶۴۔

۱۰۲۔ اکبر الہ آبادی' ص ۳۸۔

۱۰۳۔ اکبر الہ آبادی' ص ۴۰ (وحید کے متعلق تفصیل پانچویں باب میں ہے۔

۱۰۴۔ اکبر الہ آبادی' مصنفہ طالب الہ آبادی' ص ۴۱۔

۱۰۵۔ اکبر الہ آبادی' ص ۴۷۔

۱۰۶۔ تفصیل باب ششم میں ملاحظہ ہو۔

۱۰۷۔ اکبر نے مکاتیب اکبر بنام عبدالماجد (ص ۶۸) میں اس کا سنہ تصنیف ۱۸۹۸ع یا ۱۸۹۹ع قرار دیا ہے۔ مزید لکھا ہے کہ میں ان دنوں مرزا پور میں جج تھا۔ ان کے سروس ریکارڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۹۰۰ع میں مرزاپور کے جج تھے۔ (ملاحظہ ہو ضمیمہ ۲)۔

۱۰۸۔ حیات اکبر' ص ۱۰۸۔

۱۰۹۔ ڈاکٹر مینارڈ کی مہارت جراحی کے متعلق انہوں نے ایک نظم کہی ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے:

ڈاکٹر مینارڈ ہیں اپنے ہنر میں لا جواب
ہاتھ ان کا برق ہے نشتر شعاع ماہتاب

۱۱۰۔ مکتوبات اکبر بنام مرزا سلطان احمد' ص ۳۲۔

۱۱۱۔ مکاتیب اکبر بنام مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی' ص ۸۶۔

۱۱۲۔ مکتوبات اکبر بنام مرزا سلطان احمد' ص ۵۷۔

۱۱۳۔ اکبر کے شب و روز' ص ۱۵۳۔

۱۱۴۔ الہ آباد مراد ہے جہاں سے یہ خط لکھا گیا ہے۔

۱۱۵۔ اکبر کے شب و روز' ص ۱۵۴۔

۱۱۶۔ ایضاً' ص ۱۵۶۔

۱۱۷۔ اکبر کے شب و روز' ص ۱۵۸۔ ۱۵۹۔

۱۱۸۔ ایضاً' ص ۱۵۹۔

۱۱۹۔ ایضاً' ص ۱۷۳۔

۱۲۰۔ ایضاً' ص ۱۷۷۔

۱۲۱- ایضاً، ص ۱۷۹-
۱۲۲- اکبر کے شب و روز، ص ۱۸۳-
۱۲۳- حور بانو خواجہ حسن نظامی کی صاحبزادی جن سے اکبر اپنے مرحوم بیٹے ہاشم کی شادی کرنا چاہتے تھے-
۱۲۴- اکبر کی ایک خادمہ کا نام-
۱۲۵- اکبر کے شب و روز، ص ۱۹۱، ۱۹۲-
۱۲۶- ایضاً، ص ۱۹۹-
۱۲۷- ایضاً، ص ۲۰۵-
۱۲۸- اکبر کے شب و روز، ص ۲۲۹-
۱۲۹- ایضاً، ص ۲۳۹-
۱۳۰- ایضاً، ص ۲۴۱-
۱۳۱- ایضاً، ص ۲۵۱-
۱۳۲- ایضاً، ص ۲۵۵-
۱۳۳- اکبر کے شب و روز، ص ۲۷۳-
۱۳۴- مکتوبات اکبر بنام سلطان احمد، ص ۴۲-
۱۳۵- خطوط مشاہیر، ص ۴۱-
۱۳۶- ایضاً، ص ۵۰-
۱۳۷- ایضاً، ص ۵۳-
۱۳۸- خطوط مشاہیر، ص ۵۴-
۱۳۹- ایضاً ص ۵۵-
۱۴۰- بعض تحریریں ایک خاتون بی اکرم صاحبہ کے نام سے شائع ہوئیں- معلوم نہیں یہ نام حقیقی تھا یا فرضی (م- ز)-
۱۴۱- رسالہ زمانہ، ستمبر ۱۹۲۱ع، مضمون خواجہ حسن نظامی-

باب دوم

پس منظر

اکبر الہ آبادی کو لسان العصر کا لقب دیا گیا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے عصری رجحانات کو زبان دی ہے۔ شعرا کے مطالعے کے لیے ان کے پس منظر کا مطالعہ ناگزیر ہوتا ہے خصوصاً پس منظر کے وسیع مطالعے کے بغیر اکبر کا مطالعہ ممکن ہی نہیں۔ وہ لسان العصر ہی نہیں، ماضی اور مستقبل کی بھی زبان تھے۔ ان کے ہاں انگریزوں کے ہندوستان میں آنے سے پہلے کی خوش حالی کا ذکر ہے اور انگریزوں کی لوٹ کھسوٹ کی داستان بھی۔ پھر انگریزی نظام کے باعث معاشرتی سطح پر ہونے والی زبردست تبدیلیوں کی تفصیل مہیا کی گئی ہے اور لوگوں کی قلب ماہیت کا واضح نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ اقدار کی تبدیلی پر نوحہ خوانی کی گئی ہے، روزمرہ کے سیاسی واقعات پر ردعمل ظاہر کیا گیا ہے اور معاصر تحریکوں کی کارگزاریوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ غرض کلام اکبر میں ہندوستان کی نصف صدی کے سیاسی، معاشرتی، تہذیبی اور معاشی حالات شرح و بسط سے بیان کر دیے گئے ہیں۔

مغل سلطنت کا زوال

اگرچہ اکبر کی پیدائش کے وقت بظاہر آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر دلی کا حکمران تھا لیکن تمام انتظام سلطنت شاہ عالم ثانی کے زمانے سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھوں میں منتقل ہو چکا تھا۔(۱) ہندوستان میں ابتری اور بدحالی کا دور اورنگ زیب کی وفات سے شروع ہوا۔ اورنگ زیب عالمگیر نے پیرانہ سالی کے باوجود محنت، بہادری اور جفاکشی کے ساتھ ملک کو ایک وحدت میں جکڑے رکھا مگر اس کے جانشینوں میں سے کسی میں یہ خصوصیات موجود نہیں تھیں۔ اورنگ زیب کے بعد یکے بعد دیگرے معظم، جہاندار شاہ، فرخ سیر، رفیع الدرجات، رفیع الشان، محمد شاہ، احمد شاہ، عالمگیر ثانی، شاہ عالم ثانی، اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر تخت نشین ہوئے اور انہوں نے پورے ڈیڑھ سو برس (۱۷۰۷ تا ۱۸۵۷) حکومت کی۔

یہ مدت کم نہیں ہے، لیکن ان میں سے ایک بادشاہ بھی ایسا نہ تھا جو مرکز گریز رجحانات کی بیخ کنی کر کے ملک کو اپنے عظیم اجداد کے انداز میں متحد رکھ سکتا۔ غرض ایک طرف تو مختلف صوبیدار خود مختار ہوتے گئے اور دوسری طرف دلی پر مرہٹوں، جاٹوں، روہیلوں وغیرہ کی حرص و آز نے ستم توڑے۔ رہی سہی کسر نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے نکال دی جنھوں نے دلی میں خون بہایا، قتل و غارت کا بازار گرم کیا، دولت سمیٹی اور چلتے بنے۔ یوں سلطنت کی بنیادوں کو بالکل کھوکھلا کر گئے۔

یورپی اقوام کی آمد

ادھر شمال میں یہ سلسلہ جاری تھا، ادھر ہندوستان کے ساحلوں کو تسخیر کرنے والی یورپی اقوام اندرون ملک داخل ہو کر اپنی سلطنت کو برابر وسیع کرتی جا رہی تھیں۔ ہندوستان کی ریاستیں اتنی منقسم، منتشر اور کمزور تھیں کہ ایک بھی ان کا مقابلہ نہ کر سکی۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ہندوستان کے ساحلوں پر چار یورپی قومیں بغرض تجارت آئیں۔ سب سے پہلے پرتگالی، پھر ولندیزی، اس کے بعد فرانسیسی اور آخر میں انگریز۔

پرتگالیوں نے پندرہویں صدی کی آخری دہائی میں ہندوستان کا بحری راستہ دریافت کیا۔ ۸ جولائی ۱۴۹۷ء کو واسکوڈے گاما اپنے ساتھیوں کے ہمراہ لزبن کی بندرگاہ سے روانہ ہوا اور ۱۷ مئی ۱۴۹۸ء کو کالی کٹ کے شمال میں آٹھ میل کے فاصلے پر واقع ایک قصبے میں لنگر انداز ہوا۔(۲) اس کے بعد مختلف اوقات میں بہت سے پرتگالی یہاں آئے۔ اس وقت ہندوستان میں دلی کی مرکزی سلطنت لودھی خاندان کے قبضے میں تھی اور سکندر لودھی(۳) تخت نشین تھا۔ مگر اس سے قبل ہی سلطان محمد تغلق کی عجیب و غریب اصلاحات کی وجہ سے بنگال، دکن اور گجرات مرکز سے کٹ چکے تھے۔ دکن میں 'بہمنی' وجے نگر، کوچین اور کالی کٹ کی سلطنتیں قائم تھیں۔ کالی کٹ، جہاں پہلے پہل پرتگالی آئے، ایک ہندو سلطنت تھی جس کے بادشاہوں کا موروثی لقب زمورن تھا۔ یہاں پرتگالیوں نے تجارت شروع کی۔ انھوں نے عربوں کو، جن کے قبضے میں ایشیا اور افریقہ کے ساحل کی تجارت تھی، شکستیں دے کر ہندوستان کی تجارت سے بے دخل کر دیا اور ساحلی علاقوں پر اپنی تجارتی کوٹھیاں قائم کر لیں۔ مگر انھوں نے اندرون ملک قبضہ کرنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ پرتگال ایک چھوٹا سا ملک ہے۔ ہندوستان جیسے وسیع ملک پر قبضہ کرنا اور اسے برقرار رکھنا ان کے لیے ناممکن تھا، اس لیے انھوں نے اپنے آپ کو تجارت تک محدود رکھا۔ وہ ہندوستان کے ساحلی علاقوں میں عیسائیت پھیلانے کے لیے بھی کوشاں رہے۔ وہ جبر اور ظلم سے تبدیلی مذہب کو

جائز سمجھتے تھے۔ علاوہ ازیں انہوں نے یہاں کے بہت سے باشندوں کو اغوا کر کے غلام بنایا۔ تجارت میں بھی ان کے ہاں زبردستی روا تھی۔ موقع ملتا تو دوسری قوموں کے تجارتی جہازوں کو لوٹ لیتے' اشیاء کی من مانی قیمتیں مقرر کرتے اور راجاؤں کے ساتھ غرور سے پیش آتے۔ بیشتر یورپی مورخ بھی' جو مسلمانوں کے مقابلے میں اپنے ان ہم مذہب افراد سے زیادہ ہمدردی رکھتے ہیں' کہیں کہیں ان کے مظالم کا ذکر کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ واسکوڈے گاما اور اس کے ساتھیوں کا ایک غیر انسانی اور بہیمانہ واقعہ کیمرج ہسٹری میں یوں مذکور ہے:

"A rich muslim pilgrim-vessal on its way to India from the red-sea was intercepted by da Gama's fleet, plundered and sunk; there were many women and children on board; but to these no mercy was shown; and we actually read that da Gama watched horrors of the scene through a port hole, merciless and unmoved.(4)

ظاہر ہے یہ جہاز تجارتی نہ تھا۔ حج سے واپس آنے والے افراد کا تھا جن میں عورتیں اور بچے تھے۔ لیکن ان یورپی تاجروں کے ہاں سرے سے کوئی اخلاقی ضابطہ ہی موجود نہ تھا۔ ان کی درندگی اس حد تک پہنچی ہوئی تھی کہ وہ ایسے واقعات سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ یہ سلوک مسلمانوں کے ساتھ تھا۔ ہندوؤں کے ساتھ بھی رویہ مختلف نہ تھا۔ کالی کٹ کے ہندو راجہ نے انہیں مراعات دی تھیں(۵) اور کوچین کے ہندوؤں نے انہیں اس وقت تحفظ دیا جب ہندوستان سے ان کی مستقل بے دخلی کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا(۶) وجے نگر کی ہندو سلطنت نے ان کی سرگرمیوں سے مطلق تعرض نہیں کیا (۷) مگر گوا پر تسلط قائم کرنے کے بعد جب وہ ہندوؤں کو تبدیلی مذہب پر مجبور نہ کر سکے تو ان کے خلاف طاقت کا مظاہرہ کیا اور ان کے مندروں کو مسمار کر دیا۔ ڈوڈول لکھتے ہیں:

"After the arrival of Franciscan Missionaries in 1517, Goa Had become the centre of an immense propaganda, and already in 1540, by the order of the King of protugal, all the Hindu Temples in the island of Goa had been destroyed. The inquisition was introduced into Goa in 1560."(8)

قتل و غارت اور لوٹ مار کے سلسلے میں تاریخ میں نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کو بہت

بدنام کر دیا گیا ہے مگر پرتگالیوں کے کارنامے ان سے کسی طرح کم نہیں۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ خصوصاً قابل ذکر ہے۔ سندھ کے بادشاہ نے پرتگالی مقبوضات کے گورنر فرانسسکو بیریتو (تقرر ۱۵۵۵ء) کو ایک مہم میں مدد کے لیے بلایا لیکن اس کے پہنچنے پر چونکہ مدد کی ضرورت نہ رہی' اس لیے مدد لینے سے انکار کر دیا گیا۔ مگر وہ اتنے سنہرے موقع کو کیسے گنوا دیتا۔

On his being ref-used, Barreteo landed his men, entered the city and in his rage killed over 8000 people and loaded his vessal with one of the richest booties ever taken in India.(9)

پرتگالیوں کے ان مظالم کی وجہ سے ہندوستان کے لوگ ان سے بدظن ہو گئے۔ چونکہ یورپ کے لوگوں کے متعلق یہ ہندوستانیوں کا پہلا تجربہ تھا اس لیے ساحلوں اور اندرون ملک یورپیوں کے ظلم و جور' لوٹ مار اور بددیانتی اور بد اخلاقی کی داستانیں پھیل گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی' بالخصوص اردو ادبیات میں' مشرق کے مقابلے میں مغرب کی اس قدر مذمت کی گئی ہے۔ مشرق کے عرب تاجروں نے لوگوں کو اخلاق سے رام کیا تھا مگر مغرب کے تاجروں نے انہیں ہتھیاروں سے دبایا۔ چنانچہ ایک تاریخ دان لکھتا ہے:

It was from this period that the word faringi (lit. farangi, Frank) acquired the opprobrium of which echoes may still be heard today. In religion they were intolorant to the extent of allowing no Hindu Temples in Goa(10) and introducing inquisition, (1560) both measures, which can be regarded as sub- standard from the Indian standpoint.(11)

اردو ادب میں لفظ فرنگی(۱۲) کے ساتھ جو مفہوم وابستہ ہو گیا ہے اس کا سبب یہی ہے۔

اسی زمانے میں ہالینڈ (ڈچ) اور فرانس کے لوگوں نے بھی تجارتی کمپنیاں قائم کیں' بحری بیڑے بنائے اور افریقہ' ہندوستان اور جزائر شرق الہند کے ممالک سے تجارت شروع کر دی۔ ان کے جہاز اور جہاز رانی کے آلات پرتگالیوں سے بہتر تھے اس لیے انہوں نے کئی جگہ پرتگالیوں کی طاقت کو توڑ کر اپنے تجارتی مراکز قائم کیے۔

ہالینڈ کے باشندے گرم مصالحے کی تجارت سے دلچسپی رکھتے تھے' اس لیے ان کے تجارتی مراکز ملایا اور اس کے گرد و نواح کے علاقوں میں تھے۔ علاوہ ازیں وہ چین میں منشیات خصوصاً افیون کی تجارت کر کے بہت نفع کماتے تھے۔ ہندوستان میں انہوں نے

مقامی بادشاہوں سے اچھے تعلقات قائم کر کے اپنا کام نکالنے کی پالیسی اپنائی اور ہندوستان جیسے وسیع ملک کو اپنی نو آبادی بنانے کا خیال نہ کیا۔ ان کا مقصد تجارت کر کے زیادہ نفع کمانا تھا۔ مگر یہ خیال صحیح نہ ہو گا کہ یہ لوگ دیانت دار اور راستباز تھے۔ ان کے ملازمین رشوت لینے میں حد سے زیادہ بدنام تھے۔ اس کے علاوہ نجی تجارت کر کے اپنی دولت میں اضافہ کرتے تھے۔ ڈچ تجارتی کمپنی نے رشوت ختم کرنے کے لیے سنجیدگی سے کوشش بھی نہیں کی۔ اس کمپنی کے ملازمین کی رشوت ستانی کا اندازہ اس سے ہو سکے گا کہ آمسٹرڈیم کے ایک افسر نے ۴۸۰ گلڈر(۱۳) سالانہ پر ایک شخص کو ملازم کرانے کے لیے ۳۵۰۰ گلڈر بطور رشوت قبول کیے(۱۴) یہی کیفیت کمپنی کی دیگر ملازمتوں پر تقرر کی تھی۔

پلاسی کی جنگ میں انگریزوں کی کامیابی کے بعد ہالینڈ سے ہندوستان کی رہی سہی تجارت بھی انگریزوں کے قبضے میں آگئی اور ہندوستان سے ان کا اقتدار بالکل رخصت ہو گیا۔ البتہ رشوت ستانی اور بے رحمی کے قصے باقی رہ گئے۔

فرانسیسیوں نے ہندوستان کا راستہ ہالینڈ اور پرتگال کے باشندوں سے بہت پہلے دیکھ لیا تھا۔ اگرچہ انہوں نے اقتدار حاصل کرنے کی کوشش بعد میں کی مگر اس وقت چونکہ ڈچ سمندری طاقت عروج پر تھی اس لیے فرانسیسیوں کے قدم جم نہ سکے۔ خاندان مغلیہ کی تیزی سے زوال آمادہ سلطنت کی بجائے وسیع فرانسیسی سلطنت قائم کرنے کا تصور دوپلے کے ذہن میں ۱۷۴۰ء کے لگ بھگ پیدا ہوا۔ لیکن اس وقت تک انگریز اپنے پیر مضبوطی سے جما چکے تھے۔ مقامی نوابوں اور حکمرانوں سے مل کر فرانسیسیوں نے بھی حصول اقتدار کی کوشش کی مگر وہ انگریزوں کی بہتر حکمت عملی کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکے۔ رفتہ رفتہ مقبوضہ علاقے بھی ان کے ہاتھوں سے نکلتے گئے تاآنکہ اٹھارویں صدی کے وسط تک ہندوستان میں ان کے اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ فرانسیسیوں نے ہندوستان کے تمدن اور زبانوں پر دیرپا اثرات نہیں چھوڑے۔

۱۵۸۸ء میں سپین کے بحری بیڑے "آرمیڈا" کی انگلستان کے ہاتھوں شکست نے انگریزوں کو مشرق ممالک کے ساتھ تجارت پر آمادہ کیا۔ اس سے ایک طرف سپین کی ابھرتی ہوئی سمندری طاقت زوال پذیر ہوئی' دوسری طرف انگلستان کو اپنی بحری فوقیت کا احساس ہوا اور اس نے بھی یورپ کی دیگر اقوام کی طرح مشرق کی دولت سے ہاتھ رنگنے کے لیے جدوجہد شروع کر دی۔

۱۵۹۹ء میں انگلستان کے لوگوں نے ملکہ الزبتھ سے مشرق ممالک کے ساتھ تجارت

کرنے کی اجازت طلب کی۔ اجازت مل جانے کے بعد ۳۱ دسمبر ۱۶۰۰ ع کو ایک تجارتی کمپنی قائم کی گئی(۱۵) اور اسے پندرہ سال کی مدت کے لیے ابتدائی اجازت نامہ ملا(۱۶) ۱۶۰۸ء ع میں کپتان ہاکنز نے مغل شہنشاہ جہانگیر سے سورت میں فیکٹری قائم کرنے کی اجازت طلب کی مگر پرتگالیوں نے اپنے تجارتی مفادات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کوشش ناکام بنا دی۔ ۱۶۱۲ ع میں کپتان بیسٹ (Best) نے جب پرتگالیوں کے ایک بیڑے کو شکست دی تو اس وقت انگریزوں کو سورت میں فیکٹری قائم کرنے کی اجازت مل گئی۔ ۱۶۱۵ ع میں جیمز اول کے دربار سے ایک سفیر سرٹامس رو جہانگیر کے دربار میں آیا۔ اس نے جہانگیر کا اعتماد حاصل کر کے اسے پرتگالیوں سے بدگمان کیا اور اپنے ملک کے تاجروں کے لیے اہم مراعات حاصل کیں۔

۱۶۴۰ ع میں چندر گیری کے راجا سے انگریزوں نے مدراس کا علاقہ خرید لیا اور وہاں اپنی پہلی قلعہ بند فیکٹری قائم کی اور اس کا نام فورٹ سینٹ جارج رکھا۔ ۱۶۵۱ ع میں انہوں نے ساحلی علاقوں سے اندرون ملک تجارت کے لیے تگ و دو شروع کی اور اس کے لیے ہگلی میں فیکٹری کی بنا ڈالی۔ اس کے بعد کمپنی کی تجارت مضبوط بنیادوں پر جاری رہی۔ جب محاصل کے سلسلے میں بنگال کے گورنر شائستہ خان سے انگریزوں کا جھگڑا ہوا تو برطانوی نو آبادیوں کے گورنر جوشوا چائلڈ نے انگلستان کے حکمران جیمز دوم کو اورنگ زیب کے خلاف اعلان جنگ پر اکسایا۔ چنانچہ جنگ شروع ہو گئی' مگر برطانوی تاجر اورنگ زیب کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں رکھتے تھے اس لیے شکست کھا کر اپنی نو آبادیوں سے محروم ہو گئے اور انہیں بنگال سے نکال باہر کیا گیا۔ سورت کی فیکٹری میں مقیم برطانوی باشندے قیدی بنا لیے گئے۔ چنانچہ ۱۶۹۰ع میں انگریزوں نے گر کر صلح کرنے میں عافیت جانی اور نہ صرف محصول ادا کر دیے بلکہ جنگ کے دنوں میں ساحلوں کے لوٹے ہوئے جہازوں کا معاوضہ دینا بھی قبول کر لیا۔ علاوہ ازیں آئندہ کے لیے اپنی ان سرگرمیوں سے باز رہنے کا یقین بھی دلایا۔ اس پر ان کی نوآبادیاں انہیں واپس دے دی گئیں۔ انہوں نے اب کے اورنگ زیب کو بہر طور خوش رکھا اور اسی سال کلکتے میں قلعہ بندی کی اجازت حاصل کر لی۔ یہ قلعہ اس وقت کے شاہ انگلستان ولیم سوم کے نام سے موسوم کیا گیا اور اسے فورٹ ولیم کہا جانے لگا۔ اورنگ زیب کے بعد ۱۷۱۷ع میں ایک انگریز طبیب ولیم ہملٹن نے فرخ سیر سے کمپنی کے لیے بہت سی مراعات حاصل کر لیں۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغل سلطنت تیزی سے زوال کی طرف جا رہی تھی۔

حکمرانوں کی بے تدبیریوں اور نااہلیوں کی کوئی حد ہی نہیں تھی۔ رفتہ رفتہ دور دراز کے صوبے مرکز سے کٹتے جا رہے تھے۔ دکن میں مرہٹے، پنجاب میں سکھ اور بنگال میں بعض مسلم نواب سر اٹھا رہے تھے اور مغلیہ حکومت ان سے نپٹنے کے قابل نہ رہی تھی۔ اس کے علاوہ ہر صوبے میں بالادستی کے لیے ہمہ وقت سازشیں ہوتی رہتی تھیں۔ ان حالات سے انگریزوں نے فائدہ اٹھایا اور رفتہ رفتہ تجارت کے ساتھ ساتھ وسیع سلطنت بھی حاصل کر لی۔

انگریزی سلطنت کا قیام

بنگال میں انگریزوں نے جب زیادہ سے زیادہ تجارتی مفادات کے حصول کی کوشش شروع کی، اس وقت بنگال مرکز سے کٹ چکا تھا۔ علی وردی خان ۱۷۴۰ء میں بنگال کا گورنر مقرر ہوا مگر وہ دراصل خود مختار نواب تھا۔ اسے انگریزوں کے خطرے کا شدید احساس تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے انہیں قلعہ بندیوں کی اجازت نہ دی۔ وہ ۹ اپریل ۱۷۵۶ء کو فوت ہوا۔ بستر مرگ پر اس نے سراج الدولہ کو وصیت کی کہ انگریزوں سے خبردار رہنا۔ چنانچہ نوجوان نواب نے انتظام سلطنت سنبھالتے ہی انگریزوں کے خلاف اقدامات کیے۔ اس پر کلائیو نے، جو انگریزی مقبوضات کا گورنر تھا، اسے سازش کے ذریعے تخت سے ہٹانے کا منصوبہ بنایا۔ وہ سلطنت کے بعض اہم لوگوں کو جن میں سپہ سالار میر جعفر بھی شامل تھا، لالچ دے کر ساتھ ملانے میں کامیاب ہو گیا۔ ۱۷۵۷ء میں پلاسی کے میدان میں کلائیو اور نواب سراج الدولہ کی فوجوں نے ڈیرے ڈال دیے۔ عین لڑائی کے وقت میر جعفر اپنی فوج کو لے کر انگریزوں کے ساتھ مل گیا۔ سراج الدولہ فرار ہو گیا مگر مرشد آباد میں پکڑا گیا اور میر جعفر کے بیٹے کے ہاتھوں قتل ہوا۔ میر جعفر کو اس غداری کے صلے میں نواب بنا دیا گیا جس نے کمپنی کو چوبیس پرگنے کا علاقہ اور ایک کروڑ روپیہ بطور خوشنودی نذر کیا۔ اب بنگال میں کمپنی کے مفادات مضبوط ہو گئے۔

پلاسی کی جنگ کے ہندوستان پر دور رس اثرات ہوئے۔ اس سے نئی سماجی اور سیاسی قوتیں ابھریں، جنھوں نے ہندوستان کا نقشہ ہی بدل کر رکھ دیا۔ حکومت کا انتظامی ڈھانچا اور اقتصادی نظام جو صدیوں سے چلا آ رہا تھا، بالکل بدل گیا۔ "کمپنی کی جائز تجارت کا زمانہ ختم ہوا۔ اس کی بجائے سرکاری محاصل اور سیاسی قوت کے بل بوتے پر تجارتی استحکام کا دور شروع ہوا۔"(۱۷)

بنگال کے اس وسیع اور دولت مند صوبے پر قبضے سے انگریزوں کی قوت، شہرت اور

دولت میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ اس سے ان کی حرص بھی کئی گنا بڑھ گئی۔ پورے صوبے میں استحصال، ظلم و جور، لوٹ مار اور بدعنوانیوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا جس نے اس صوبے کے خوشحال لوگوں کو مفلوک الحال اور فاقہ کش بنا دیا۔ بنگال کی تجارت کے مکمل طور پر انگریزوں کے قبضے میں آ جانے سے انہیں اس قدر قوت حاصل ہوئی کہ انہوں نے ایک طرف شمالی ہند اور دوسری طرف دکن کی ابھرتی ہوئی طاقتوں کو دبا دیا۔

شمالی ہند میں اس وقت شاہ عالم ثانی(۱۸) برائے نام بادشاہ تھا اور اس کے نام پر مرہٹے حکومت کرتے تھے۔ اودھ کے صوبے میں خود مختار سلطنت قائم تھی جس کے بانی ایک محمد شاہی عہدے دار سعادت خان برہان الملک تھے۔ جنگ پلاسی کے لگ بھگ شجاع الدولہ نواب اودھ بنا تھا۔ دکن میں تین طاقتیں (مرہٹے، نظام اور حیدر علی) باہم کشمکش میں مصروف تھیں اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانا چاہتی تھیں۔ اس کا فائدہ انگریزوں کو پہنچا جنہوں نے ایک ایک کر کے سب ریاستوں پر قبضہ کر لیا۔

سب سے پہلے نواب شجاع الدولہ سے انگریزوں کی جنگ ہوئی جس کا سبب یہ بنا کہ میر جعفر کو مفید مطلب نہ پا کر انگریزوں نے معزول کر دیا۔ میر قاسم کو، جو اس کا داماد تھا، نواب بنایا۔ میر قاسم نے صوبے کا نظم و نسق درست کرنا چاہا تو اسے انگریزوں کی طرف سے سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا جو یہ چاہتے تھے کہ مقامی باشندوں کو بھاری ٹیکسوں کی ادائیگی کے بعد تجارت کرنے کی اجازت دی جائے، جب کہ انگریز ٹیکسوں سے مستثنیٰ قرار پائیں۔ میر قاسم نے جب یہ دیکھا کہ وہ انگریزوں کو اس من مانی تجارت سے نہیں روک سکتا تو اس نے بنگال کے لوگوں کو بھی ٹیکسوں سے مستثنیٰ کر دیا۔ یہ بات انگریزوں کو ناگوار گذری۔ میر قاسم اور انگریزوں میں ٹھن گئی۔ انگریزوں نے فوج بھیجی۔ میر قاسم مقابلے کی تاب نہ لا کر فرار ہو گیا اور اس نے ۱۷۶۳ء میں اودھ کے حکمران نواب شجاع الدولہ کے ہاں پناہ لی۔ ان دنوں شاہ عالم ثانی بھی اودھ میں مقیم تھا۔ تینوں نے مل کر انگریزوں پر حملہ کیا مگر انگریز اپنی چالوں کے ذریعے شاہ عالم ثانی اور شجاع الدولہ میں پھوٹ ڈلوانے میں کامیاب ہو گئے۔ ۱۵ ستمبر ۱۷۶۴ء کو بکسر کے مقام پر جنگ ہوئی جس میں شجاع الدولہ کو شکست ہوئی اور اسے بہت زبردست نقصان اٹھانا پڑا۔ وہ فرار ہو کر بریلی جا پہنچا جہاں روہیلہ سردار حکمران تھے۔ وہاں سے مدد نہ ملی۔ آخر اس نے کمپنی کے ساتھ انہی کی شرطوں پر صلح کر لی۔ پچاس لاکھ روپیہ بطور تاوان جنگ ادا کیا اور اپنی حفاظت کے لیے انگریزوں کا ایک دستہ رکھنا قبول کر لیا۔ انگریز ریذیڈنٹ بھی دربار میں رہنے لگا۔ یہ گویا

شجاع الدولہ کی خود مختار سلطنت کے خاتمے کا اعلان تھا۔

شاہ عالم ثانی نے انگریزوں کے ساتھ صلح کر لی اور مرہٹوں کی بجائے انگریزوں کی پناہ میں چلا گیا۔ اس نے انگریزوں کو بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی عطا کر دی۔ انگریزوں نے اس کے بدلے میں چھبیس لاکھ روپیہ سالانہ دینا منظور کیا۔ میر قاسم فرار ہو گیا اور اس کے بعد گمنامی میں فوت ہوا۔ جنگ بکسر کی کامیابی نے انگریزوں کو دہلی، اودھ اور بہار کا مالک بنا دیا۔

شمالی ہند میں پاؤں جماتے ہی انگریز دکن کی طرف متوجہ ہوئے۔ مرہٹوں کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ نظام کمزور حکمران تھا۔ اصل خطرہ حیدر علی کی طرف سے تھا۔ چنانچہ حیدر علی سے انگریزوں کی ٹھن گئی۔ حیدر علی اور انگریزوں میں دو جنگیں ہوئیں جنہیں میسور کی پہلی اور دوسری جنگیں(۱۹) کہا جاتا ہے لیکن فیصلہ کن ثابت نہ ہوئیں۔ اس عرصے میں سلطان حیدر علی فوت ہو گیا۔ اس کے بیٹے ٹیپو سلطان کی بھی انگریزوں سے دو جنگیں ہوئیں جنہیں میسور کی تیسری(۲۰) اور چوتھی جنگ(۲۱) کہا جاتا ہے۔ چوتھی جنگ میں سلطان ٹیپو کو بعض لوگوں کی غداری کے باعث شکست ہوئی اور وہ شہید ہو گئے۔ میسور پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا۔ نظام حیدر آباد نے انگریزوں کی بالادستی تسلیم کر لی اور اس طرح پورا دکن انگریزوں کے قبضے میں آ گیا۔ ۱۸۰۳ء میں انگریز دہلی پر قابض ہو گئے اور شاہ عالم ثانی کی حیثیت ایک پنشن خوار کی رہ گئی۔

اب پورے ہندوستان میں صرف ایک طاقت رہ گئی تھی جو ابھی تک انگریزوں کی مطیع نہیں ہوئی تھی۔ یہ دریائے ستلج سے شروع ہو کر پورے پنجاب پر پھیلی ہوئی سکھ سلطنت تھی۔

رنجیت سنگھ نے مختلف سکھ جتھوں کو اکٹھا کر کے پنجاب میں سکھ حکومت قائم کر لی تھی۔ ۲ اپریل ۱۸۰۹ء کو انگریزوں اور سکھوں کے درمیان معاہدہ امرتسر ہوا جس کے مطابق انگریزوں اور سکھوں کے درمیان دریائے ستلج سرحد قرار پایا۔ ۱۸۳۹ء میں رنجیت سنگھ مر گیا اور اس کی فوج اور سردار بے قابو ہو گئے۔ انہیں درست کرنے کے لیے رانی جنداں نے انہیں انگریزوں سے بھڑا دیا۔ سکھوں اور انگریزوں کے درمیان دو جنگیں ہوئیں۔ پہلی جنگ ۱۸۴۵ء تا ۱۸۴۶ء ہوئی جس کے نتیجے میں لارڈ ڈلہوزی نے پنجاب کو انگریزی سلطنت میں شامل کر لیا اور اس طرح تمام ہندوستان پر مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک انگریزی راج قائم ہو گیا۔

فوراً ہی انگریزوں نے ہندوستان بھر میں تعلیم، دستور سازی اور جدید علوم و فنون کی تدریس شروع کر دی جس کا مقصد لوگوں کو ذہنی طور پر تبدیل کرنا تھا اور انہیں یہ باور کرانا تھا کہ یورپ تمدن، بود و ماند، سائنس اور علوم و فنون میں ہندوستان سے بہت آگے ہے۔ اس زمانے میں عیسائی مبلغ کثرت سے ہندوستان آئے انہوں نے تبلیغ و تحریص سے لوگوں کو عیسائی بنانا چاہا مگر اس میں انہیں بہت کم کامیابی ہوئی۔ البتہ اس کا شدید ردعمل ہوا جو ۱۸۵۷ء کے واقعات کا ایک اہم سبب بنا۔ اس بغاوت کے دوران ظلم و ستم بھی ہوئے لیکن انگریزوں نے دوبارہ قبضہ کیا تو ظلم و ستم کا ایک ایسا دور شروع ہوا جس کی مثال تاریخ میں بہت کم ملتی ہے۔ بہت سے لوگ شبہات کی بنا پر قتل کر دیے گئے۔ اس کثرت سے لوٹ مار ہوئی اور پھانسیاں دی گئیں کہ شہر ویران ہو گئے۔ خصوصاً دلی جو عہد مغلیہ کے تمدن کی علامت تھی، تباہ کر دی گئی۔

۱۸۵۷ء کے اس ہنگامے کی ذمہ داری انگریزوں پر عائد ہوتی ہے۔ ہندوستان انگریزوں کا ملک نہیں تھا۔ یہاں ان کی حیثیت محض تاجروں کی تھی۔ لیکن ہندوستان کے حکمرانوں کی نااتفاقیوں سے فائدہ اٹھا کر جب وہ حکمران کی حیثیت اختیار کر گئے تب بھی اپنے آپ کو ایک غیر ملکی اور بالاتر قوم سمجھتے رہے۔ ان سے پہلے بھی بہت سے حملہ آور ہندوستان میں آئے تھے لیکن ہندوستان کو فتح کرنے کے بعد وہ یہیں بس گئے اور اسی سرزمین کو اپنا وطن سمجھنے لگے۔ اس کے برخلاف انگریز نسل، رنگ، تہذیب، تمدن، تعلیم وغیرہ کے اعتبار سے اپنے آپ کو ایشیائی لوگوں سے برتر سمجھتے تھے۔ اس ذہنیت کا اظہار ایک انگریز مصنف رڈیارڈ کپلنگ کے ان مشہور عالم جملوں میں نہایت بے ساختگی سے ہوا ہے کہ "غیر متمدن اقوام کو تہذیب و تمدن سکھانا سفید فام اقوام پر ایک بوجھ ہے"(۲۲) اور یہ کہ "مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب اور دونوں کبھی نہیں مل سکتے۔"(۲۳) انگریزوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو ہندوستانیوں سے الگ تھلگ رکھنے کی کوشش کی۔ اپنی آبادیاں اور کیمپ شہر سے پرے رکھے۔ بقول اکبر

یہ سچ ہے انہوں نے ملک لے رکھا ہے
ہم لوگوں سے کیمپ کو پرے رکھا ہے

انہوں نے اعلیٰ عہدے اپنی قوم کو دیے اور صرف ان عہدوں پر ہندوستان کے لوگوں کو رکھا جن پر انگریزوں کو انگلستان سے منگوا کر ملازم رکھنا معاشی نقطۂ نظر سے سودمند نہیں تھا۔

مغلیہ دور کے ہندوستان میں متوسط طبقہ بہت کم تھا۔ طبقہ اعلیٰ اور طبقہ ادنیٰ کے افراد زیادہ تھے۔ انگریزوں نے ان اکثریتی طبقوں کو تو مکمل طور پر ناراض کر دیا۔ البتہ وہ لوگ جنہوں نے سرکاری سکولوں اور کالجوں میں تعلیم حاصل کی تھی اور عیسائیت سے متاثر ہونے کا تاثر دیتے تھے' انگریزوں سے خوش تھے۔ ان لوگوں کو انگریز عہدے دیتے تھے' اور نسبتاً قریب رکھتے تھے۔ انہی لوگوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ کے دوران انگریزوں کی مدد کی۔ بعد میں تصنیف و تالیف کے میدان میں یہی طبقہ چھایا رہا اور انگریزوں کی وفاداری پر زور دیتا رہا۔ اٹھارہ سو ستاون کے واقعات کو غدر اور چند سپاہیوں کی شورش بتاتا رہا چنانچہ سکولوں اور کالجوں کے فارغ التحصیلوں میں یہی خیال رائج ہو گیا' ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کی تحریک ہندوستان گیر تھی جو پنجاب سے بنگال تک اور دلی سے دکن تک ہر جگہ کم یا زیادہ قوت سے ظاہر ہوئی۔ اگرچہ تاریخیں بتاتی ہیں کہ یہ تحریک ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ سے شروع ہو کر اپریل ۱۸۵۸ء کو نانا صاحب کے وزیر تانتیا توپی کی شکست پر ختم ہو گئی مگر یہ اندر ہی اندر لوگوں کے دلوں میں سلگتی رہی۔ کبھی کبھی پھوٹ بھی پڑتی تھی اور فقط پچاس سال کے بعد پھر شعلہ جوالہ میں بدل گئی۔ لوگوں میں نفرت انگریزوں کے خلاف نفرت ذیل کے واقعات کی وجہ سے ہوئی:

آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو انگریزوں نے کہہ دیا تھا کہ آئندہ سے ان کا خاندان بادشاہ کا لفظ استعمال نہیں کر سکے گا۔ لال قلعے کی رہائش بھی ترک کرنی پڑے گی۔ عام لوگ اس وقت بھی بہادر شاہ ظفر کو مغل بادشاہت کی علامت سمجھتے تھے۔ اس بات سے عوام میں ناراضی پھیلی۔ قلعے سے بادشاہ کے جانے اور پنشن کم ہو جانے سے بہت سے لوگ بیکار ہو گئے۔ چنانچہ ان کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت کا پیدا ہونا لازمی تھا۔

اودھ کی سلطنت مسلمانوں کا ایک مضبوط حصار اور ایک خوشحال مملکت سمجھی جاتی تھی۔ اس کے معاملات میں دخل اور بیگمات کے ساتھ روپیہ وصول کرنے کے سلسلے میں ہیسٹنگز کی بدسلوکی وغیرہ بھی لوگوں کو ناگوار گزری مگر ۱۸۵۶ء میں انتزاع سلطنت اور واجد علی شاہ کی جلا وطنی سے اودھ کے لوگوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت کا عام جذبہ پیدا ہوا۔

انگریزوں نے ایک ایک کر کے مرکز سے دیسی ریاستوں کا الحاق شروع کیا۔ ستارا کے حکمران کو متبنیٰ بنانے کی اجازت نہ دی گئی اور اس کی ریاست انگریزی سلطنت میں شامل کر لی گئی۔ جھانسی کی رانی بے اولاد تھی' اس کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔ ناگپور کا علاقہ بھی اسی طرح انگریزی علاقے میں شامل کر لیا گیا۔ کرناٹک کے نواب کا کوئی بیٹا نہ تھا'

اس لیے کرناٹک میں بھی نوابی کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔ تنجور کے راجہ کا خطاب اور وظیفہ ختم ہوا کیونکہ اس کے ہاں بھی اولاد نرینہ نہ تھی۔ نانا صاحب (وندو پنتھ) کا وظیفہ ضبط کر لیا گیا۔ یہ سارے اقدامات شدید نفرت کا باعث بنے۔

تعلقہ داران اودھ کے ساتھ مالگزاری جمع کرنے کے سالہاسال پرانے حق کو ختم کرنے میں جو سختی کی گئی اس کی وجہ سے بہت سے تعلقہ دار غصے میں بھر گئے اور انتقام کے لیے موقع کے منتظر تھے۔

انگریز افسروں اور پادریوں کے مذہبی جنون نے جلتی پر تیل کام کیا۔ ان کا خیال تھا کہ ذرا سی محنت سے تمام ہندوستانیوں کو عیسائی بنایا جا سکتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے ہر جائز ناجائز طریقہ اختیار کرنا ضروری سمجھا۔ قحط کے ایام میں والدین کے ترک کیے ہوئے بچوں کو عیسائی بنا لیا۔ سکولوں اور کالجوں میں بائبل کی تعلیم رائج کی(۲۴) مباحثوں اور مناظروں کا زور ہوا۔ عیسائی مصنفین نے دوسرے مذاہب کے خلاف کتابوں اور رسالوں میں تکلیف دہ جملے استعمال کرنے شروع کیے۔

مالگزاری کا بندوبست ایسی سختی سے کیا گیا کہ اس کی مثال اس سے قبل ہندوستان میں موجود نہیں تھی۔ پہلے مالگزاری ہر سال پیداوار کے مطابق لگائی جاتی تھی، اب ایک یکساں شرح مقرر کر دی گئی جو زیادہ تھی اور بے لچک بھی۔ زمین رفتہ رفتہ خراب ہوتی گئی لیکن مالیہ اور آبیانہ مقررہ شرح کے مطابق وصول کیا جاتا تھا۔ اس سے کسان اور زمیندار غریب سے غریب تر ہوتے چلے گئے۔ چنانچہ زمینداروں کے دل سے پچھلی عملداریوں کی یاد نہ بھولتی تھی۔

انگریزوں سے پہلے کی حکومتیں لوگوں کو انصاف مفت مہیا کرتی تھیں۔ عدالتیں سرکار کی طرف سے مقرر ہوتی تھیں جو سادہ درخواست پر ساری کارروائی کرتی تھیں۔ انگریزوں نے اس کے لیے اشامپ کا قاعدہ جاری کیا۔ ہندوستان کے لوگ حصول انصاف کے لیے محصولات کی ادائیگی کو انتہائی قابل مذمت سمجھتے تھے۔

غرض سرسید کے لفظوں میں خلاصہ کلام یہ ہے کہ:

> "اس میں کچھ شک نہیں کہ گورنمنٹ نے رعایا کے حالات اور خیالات اور عادات اور اوضاع اور اطوار اور طبیعت اور طینت اور لیاقت کے دریافت کرنے میں توجہ نہیں کی۔ بلاشبہ ہماری گورنمنٹ کو نہیں معلوم تھا کہ ہماری رعیت پر دن کیسا گزرتا ہے اور رات کس مصیبت کی آتی ہے اور وہ دن بدن

کس مصیبت میں پڑتے جاتے ہیں اور کیا کیا رنج روز بروز ان کے دل میں جمتے جاتے ہیں جو رفتہ رفتہ بہت کثرت سے جمع ہو گئے تھے اور ایک ادنیٰ تحریک سے دفعتاً" بہہ پڑے۔"(۲۵)

نیز یہ بھی کہ:

"رفتہ رفتہ یہ نوبت پہنچ گئی کہ رعایا ہندوستان کی ہماری گورنمنٹ کو میٹھے زہر اور شہد کی چھری اور ٹھنڈی آنچ کی مثال دیا کرتی تھی اور اس کو اپنے دل میں سچ سمجھتی تھی اور یہ جانتی تھی کہ اگر ہم آج گورنمنٹ کے ہاتھ سے بچے ہوئے ہیں تو کل نہیں اور کل ہیں تو پرسوں نہیں' اور کوئی شخص ان کے حالات کا پوچھنے والا اور کوئی تدبیر ان کے اس غلط خیال کو دور کرنے والی نہ تھی۔"(۲۶)

انہوں نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ اب انگریز ان نیم خود مختار سلطنتوں کی طرف متوجہ ہوئے جو صرف داخلی امور میں آزاد تھیں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ داخلی امور میں بھی مسلسل انگریزوں کی مداخلت کا شکار رہتی تھیں۔ البتہ ریاستوں کے نام سے نوابوں اور راجوں کا کچھ بھرم ضرور تھا۔ انگریز انہیں بھی براہ راست اپنے تسلط میں لانا چاہتے تھے۔ چنانچہ لارڈ ڈلہوزی نے جو ابھی نوجوان تھا وہ احتیاط ضروری نہ سمجھی جو اس سے پہلے کے گورنر جنرل کرتے چلے آئے تھے۔ اس نے فوراً دیسی ریاستوں کے معاملات میں مداخلت شروع کر دی اور ان قوانین کو سختی سے نافذ کیا جن سے الحاق کی پالیسی کو تقویت ملتی تھی۔ اس نے سکم کے ایک حصے پر اس بہانے قبضہ کر لیا کہ وہاں دو انگریزوں سے بدسلوکی کی گئی تھی۔ اس نے لاولد والیان ریاست کو متبنیٰ بنانے کی اجازت نہ دی اور ستارا' جھانسی' ناگپور' جیت پور اور سنبھل پور وغیرہ پر قبضہ کر لیا۔

ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے بعد وہ دو بڑی مسلمان ریاستوں کی طرف متوجہ ہوا۔ پہلے اس نے نظام حیدر آباد کو ایک توہین آمیز خط لکھا۔ پھر امدادی فوج کے اخراجات کے لیے برار کا علاقہ ہتھیا لیا۔ وہ "مملکت آصفیہ پر قابض ہو جاتا اگر سالار جنگ اس کے عزائم کو شکست نہ دیتا۔"(۲۷) حیدر آباد دکن تو ڈلہوزی کے چنگل سے بچ نکلا مگر اودھ کی سلطنت کو حیلے بہانے برطانوی عملداری میں شامل کر لیا گیا۔ بکسر کی جنگ کے بعد سے انگریزوں نے نوابان اودھ کو پریشان کرنا شروع کر دیا تھا۔ رفتہ رفتہ ان کی طاقت میں کمی کی جاتی رہی۔ ۱۷۶۸ء میں شجاع الدولہ کو مجبور کیا گیا کہ وہ پینتیس ہزار سے زیادہ فوج نہ رکھے۔ پھر اسے کمپنی کی اطلاع کے بغیر کسی ملک سے رابطہ قائم کرنے کی بھی ممانعت کر دی گئی۔ ۱۷۹۸ء میں سعادت علی خاں کو مجبور کیا گیا کی برطانوی فوج رکھنے کے لیے ۶ لاکھ روپے

سالانہ ادا کیا کرے۔ غازی الدین حیدر انگریزوں کو نیپال کے خلاف جنگ میں پینتیس لاکھ روپے قرض دینے پر مجبور کیا گیا۔ محمد علی شاہ اور امجد علی شاہ کے ادوار میں حالات خراب سے خراب تر ہوتے چلے گئے۔ آخر ۱۲ فروری ۱۸۵۶ء کو اودھ پر بھی قبضہ جما لیا گیا۔ ڈاکٹر تارا چند لکھتے ہیں:

The dethronement of Wajid Ali Shah sent a wave of resentment and anger throughout the country, for whatever the faults of the nawab might have been, no Indian looked with approval upon the transfer of the fairest province of India to the hands of foreign rulers. Princes, Taluqdars, officials, dependents and the fighting classes of Oudh, Hindu and Muslim all, were filled with hatred and dismay."(28)

ناکام جنگ آزادی کے نتائج

غرض بغاوت ہوئی مگر ہندوستان کے لوگ چونکہ کسی اچھے لیڈر یا سپہ سالار سے محروم تھے اس لیے ناکام ہو گئی۔ بغاوت کے دوران انگریزوں پر ظلم و ستم بھی ہوئے۔ انگریز بھی گذشتہ دو صدیوں سے ظلم کرتے چلے آ رہے تھے اور وہ سلطنت کے غاصب تھے' اس لیے لوگ اپنے جذبات کو روک نہ سکے اور قتل و غارت کا میدان گرم ہوا جو بہرحال قابل مذمت ہے مگر بغاوت فرو ہونے کے بعد انگریزوں نے جو ظلم و ستم کیے وہ ان سے کئی سو گنا زیادہ تھے۔ اس کی پوری تفصیل تو ملنی محال ہے تاہم کچھ ایسے اشارے مل جاتے ہیں جن سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس "مہذب" قوم نے لوگوں کے ساتھ کیا سلوک کیا:

جنرل نکلسن نے اپنے تاثرات یوں بیان کیے ہیں:

"انگریز عورتوں اور بچوں کے قاتلوں کے خلاف ایسا قانون بنانا چاہیے جس کی رو سے ہم انہیں زندہ جلا سکیں یا گرم سلاخوں سے اذیت دے کر مار سکیں۔"(۲۹)

جب خواہشات یہ تھیں تو عملاً کیا کچھ نہیں ہوا ہو گا۔ اس کی بھی کچھ تفصیل تحریر ہے:

"کوچہ جیلان میں انگریز سپاہی حکیم فتح اللہ خاں کے زنانے میں داخل ہو گئے۔ ان کی نیت ظاہر ہے حکیم فتح اللہ خاں نے ایک انگریز سپاہی کو جو پیش پیش تھا زخمی کر دیا۔ اس پر انگریز فوج کے اعلیٰ افسر کے حکم سے کوچہ جیلان کے تمام مردوں کو گولی سے اڑا دیا گیا۔ ان مقتولوں میں مولانا صہبائی اور اپنے زمانے کے

نامور خطاط سید محمد امیر بھی تھے۔"(۳۰)

دلی میں ہر طرف لاشیں بکھری پڑی تھیں مگر انگریزوں کے لیے انہیں دیکھنا بھی تفریح کا سامان تھا۔ لارڈ روبرٹس ایک واقعہ یوں بیان کرتا ہے:

"ہم لاہوری دروازے سے ہوئے ہوئے چاندنی چوک گئے تو ہمیں دلی مردوں کا شہر دکھائی دیا۔ چاروں طرف خموشی تھی۔ ہمارے گھوڑوں کی ٹاپوں سے خاموشی ٹوٹتی۔ ہم کسی زندہ انسان کی صورت نہ دیکھ سکے۔ ہر طرف مردے ہی مردے تھے۔ زمین مردوں کا بچھونا بنی ہوئی تھی۔ چلتے وقت ہم آہستہ آہستہ باتیں کرتے تھے۔ ڈر تھا کہ کہیں ہماری آواز سے مردے نہ چونک پڑیں۔ ایک طرف لاشوں کو کتے کھا رہے تھے اور دوسری طرف گدھ انہیں نوچ رہے تھے۔"(۳۱)

باری نے مختلف ماخذ سے اس نوعیت کے بعض اور واقعات بھی ڈھونڈھ نکالے ہیں:

"چاندنی چوک کو کوتوالی کے سامنے ایک حوض کے تین طرف پھانسیاں دی جاتی تھیں اور ایک طرف تماشائیوں کے لیے کرسیاں بچھی ہوتی تھیں۔ تیسرے پہر ادھر بینڈ بجتا' ادھر لال قلعے سے مجرموں کی قطار روانہ ہوتی۔ ان کے ہاتھ پیٹھ کی طرف بندھے ہوتے تھے۔ مجرموں کو ایک قطار میں کھڑا کر دیا جاتا۔ ان میں سے آدھے پھانسی پر لٹکا دیے جاتے اور آدھے موت کے انتظار میں کھڑے رہتے۔"(۳۲)

دلی پر قبضہ ہو جانے کے بعد فوجی سپاہیوں کو تین دن کے لیے لوٹ کی اجازت دی گئی۔ چارلس گر فتھس کے الفاظ میں:

"شہر میں کافی لوٹ مار ہوتی رہی۔ ہمارے سپاہی (دیسی اور انگریز دونوں) لوٹ مار کی غرض سے مکانوں میں داخل ہو جاتے اور اپنے کپڑوں میں بہت سی قیمتی چیزیں چھپا لیتے۔ میں یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ انگریزی رجمنٹوں کے بہت سے سپاہیوں کو جواہرات اور سونے کے زیور ملے تھے۔ میری اپنی رجمنٹ کے سپاہیوں نے مجھے موتیوں کی لڑیاں اور وہ اشرفیاں دکھائیں جو انہوں نے لوٹ میں حاصل کی تھیں۔"(۳۳)

یہ واقعات محض دلی تک محدود نہ رہے۔ ہندوستان کے بیشتر علاقوں کو اسی قتل و غارت اور لوٹ مار کا شکار ہونا پڑا۔ پنجاب' یوپی' سی پی' بہار' بنگال' راجپوتانہ وغیرہ میں ایسے ہی واقعات پیش آئے۔ فرق تھا تو بس ان کی شدت میں جو کہیں کم اور کہیں زیادہ

تھی۔ اکبر کا شہر الہ آباد بھی اس سے محفوظ نہ رہا۔ وہاں بھی بے حد لوٹ مار ہوئی۔ باری رقم طراز ہیں:

"الہ آباد میں ۶ جون ۱۸۵۷ء کو سپاہیوں نے بغاوت کی اور اپنے سترہ افسروں کو قتل کر دیا۔ انگریز عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے کے بعد یہ سپاہی (چھٹی دیسی پیادہ فوج) دلی کی طرف کوچ کے ارادے سے چل دیے۔ انگریزوں کے بنگلوں کو آگ لگا دی۔ ریلوے سٹیشن کا بھی یہی حشر ہوا۔ ریل گاڑی کے انجنوں پر دور سے گولیاں چلائی گئیں۔ کئی میل تک ٹیلی گراف کے تار اور ریل گاڑی کی پٹڑی تباہ کر دی گئی۔ ۱۱ جون کو کرنل نیل اپنے سپاہیوں سمیت الہ آباد پہنچا۔ وہ باغی سپاہیوں کو گولی سے اڑا دیتا اور باغی شہروں کو پھانسی پر لٹکا دیتا۔ اس نے الہ آباد پر پوری طرح قبضہ کر لیا۔ جب کرنل الہ آباد سے کانپور پہنچا تو اپنے پیچھے سڑک کے دونوں کناروں کے درختوں پر ہندوستانیوں کی لاشوں کو لٹکتا ہوا چھوڑ گیا۔" (۳۴)

گیارہ سالہ اکبر پر ان مظالم کا اثر انگریز دشمنی کی صورت میں ہمیشہ باقی رہا۔

یہ ہنگامہ تو ختم ہو گیا مگر اپنے پیچھے ان مٹ یادیں چھوڑ گیا۔ خاندانوں کے خاندان ختم ہو گئے تھے۔ ناز و نعم میں پلے ہوئے لوگ نان شبینہ کے محتاج تھے۔ شہزادے در در کی ٹھوکریں کھا رہے تھے اور بعضے بھیک مانگ کر پیٹ بھرنے پر مجبور تھے۔(۳۵) بدترین اقتصادی بدحالی، رسوائی، ذلت، فاقہ کشی، خوف اور دہشت لوگوں کا مقدر بن چکے تھے۔ غرض عجیب بھیانک فضا تھی۔ خوف کی یہ فضا ربع صدی تک برقرار رہی۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں مصلحین نے قوم کو انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی طرف متوجہ کیا۔ مصلحین یہ خیال کرنے پر مجبور ہو گئے کہ انگریزوں کا تسلط اس قدر مضبوط ہو چکا ہے کہ اب ان کو نکالنے کا خیال تک دل میں لانا نادانی ہے۔ چونکہ انگریز ہمیشہ ہندوستان کے حکمران رہیں گے اس لیے ان سے بگاڑ پیدا کرنا موت کو دعوت دینا ہے۔ اب قوم کی بھلائی اسی میں ہے کہ اسے انگریزوں کی انتہائی وفادار رعایا بنا دیا جائے۔ انگریزوں سے حق نہ مانگا جائے، درخواست کی جائے۔ سرسید کی اصلاحی تحریک کا محرک یہی ہے کہ انگریز ہمیشہ یہاں رہیں گے۔ اس کو نکالنے کی کوشش کرنا موت کو دعوت دینا ہے۔ محسن الملک، حالی، نذیر احمد اور علی گڑھ تحریک سے وابستہ دوسرے لوگوں نے شدت سے اس نقطۂ نظر کو اپنایا اور مسلمانوں کو سرکار انگلشیہ کی وفادار رعایا بنانے کے لیے جدوجہد کی ہے۔ حالی سرکشی بجنور کا

ذکر کرتے ہوتے لکھتے ہیں :

"سر سید نے قسم دے کر کے نواب سے کہا کہ میں صرف تمہاری خیر خواہی کے لیے کہتا ہوں۔ آپ اس ارادے کو دل سے نکال ڈالیں۔ انگریزوں کی عملداری ہرگز نہیں جانے کی۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ تمام ہندوستان سے انگریز چلے جائیں گے تو بھی انگریزوں کے سوا ہندوستان میں کوئی عملداری نہ کر سکے گا۔"(۳۶)

آگے چل کر لکھتے ہیں کہ غدر کے دوران :

"انگریزی عملداری کے پھر قائم ہو جانے کا ان کو (سرسید کو) کامل یقین تھا۔"(۳۷)

اسی وجہ سے وہ انگریزوں سے بہر طور مفاہمت چاہتے تھے۔ حالی سر سید کے ایک مضمون کے حوالے سے لکھتے ہیں :

"قومی ترقی اور حکومت دونوں ماں جائی بہنیں ہیں۔ پس جب کسی قوم میں حکومت نہ رہے تو اس کی ترقی صرف اس بات پر منحصر ہے کہ وہ اپنی فتح مند قوم کے علوم و زبان حاصل کرنے سے اپنے فتح مندوں کے ساتھ ملکی حکومت میں حصہ لے۔ علوم کی ان شاخوں میں اعلیٰ درجے کی لیاقت حاصل کرے، جن میں ان فتح مندوں نے کاملیت حاصل کی ہے۔ سوشل عادات اور علمی و عملی و ملکی خیالات اس قسم کے پیدا کرے جو نتائج فاتح و مفتوح میں کسی درجہ تک مناسبت پیدا کریں۔"(۳۸)

انگریزوں کے ساتھ اس حد تک "زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز" کا رویہ اپنانے کی تہ میں درحقیقت یہ خوف چھپا ہوا ہے کہ کہیں ۱۸۵۷ء کے سے حالات دوبارہ نہ پیدا ہو جائیں۔ اسی لاشعوری کیفیت کا اظہار سر سید نے بنگالی اخبار نویسوں کے ایک مجمع سے خطاب کرتے ہوئے ان الفاظ میں کیا :

"گورنمنٹ کے بر خلاف رعایا کے بھڑکانے کے لیے کوشش مت کرو۔ جیسا کہ تیس برس کا عرصہ ہوا، اس قسم کی غلط بیانیاں زبردست باعث اس بات کا ہوئیں کہ اس ملک میں خون کی ندیاں بہنے لگیں۔"(۳۹)

اگرچہ برطانوی تسلط مضبوط ہو چکا تھا، پھر بھی چونکہ اکا دکا تشویش ناک واقعات ہوتے رہتے تھے اور بغاوت کا دھڑکا لگا رہتا تھا اس لیے انگریزوں نے ایک جامع منصوبہ

بندی کی جس کا مقصد یہ تھا کہ مختلف طریقے اختیار کر کے جو نظر بظاہر ہندوستانیوں کے لیے دلکش ہوں ایک ایسا پایدار نظام قائم کر دیا جائے جسے عرصے تک ہندوستان میں شکست کا خطرہ نہ ہو۔ چنانچہ ۱۸۵۸ء کے بعد مسلسل اس طرح کی تدبیریں بروئے کار لائی گئیں جن کے اثرات دور رس تھے۔ اس کے لیے بالخصوص ذیل کی باتوں پر عمل کیا گیا:

۱۔ ہندوستان دو بڑے مذاہب کے ماننے والوں کا ملک ہے جن میں بنیادی اختلافات ہیں۔ ان اختلافات کو ہوا دی جائے حتیٰ کہ دونوں مذاہب کے لوگ ایک دوسرے سے الجھتے رہیں اور برطانوی مفادات محفوظ رہیں۔

۲۔ نظام تعلیم میں بنیادی تبدیلیاں کی جائیں۔ اس سے (الف) معمولی ملازمتوں کے دروازے لوگوں پر کھلیں گے اور جنہیں اس سے فائدہ ہو گا وہ تاج برطانیہ کے وفادار ہو جائیں گے۔ (ب) اس نظام تعلیم کے ذریعے ایک نیا ذہن تیار ہو گا جو اپنی روایات سے بے خبر ہو گا۔ (ج) اپنی روایات سے بیگانہ ذہن یورپی روایات کے سحر میں اسیر ہو جائے گا۔ اپنی ہر چیز کو کمتر اور یورپ کی ہر چیز کو بہتر سمجھے گا اور اس طرح مستقلاً" احساس کمتری کا شکار رہے گا۔

۳۔ حکومت میں مقامی طور پر اور محدود پیمانے پر ہندوستانیوں کو نمائندگی دی جائے۔ اس سے کچھ لوگ یقیناً خوش ہو جائیں گے اور اپنے آپ کو دوسرے ملکی باشندوں سے ایک الگ گروہ سمجھنے لگیں گے۔

مغربی تعلیم کا آغاز

انگریزوں کے اس منصوبے میں بہت سے محب وطن اور ملک و قوم کے خیر خواہ بھی مجبوراً شریک ہو گئے مگر بد قسمتی سے انہوں نے اپنی قوم اور ملک کی ہر چیز کو انگریزوں اور انگلستان کی ہر چیز سے کمتر ثابت کر کے لوگوں میں شدید احساس کمتری پیدا کیا۔ انہوں نے ملکی زبانوں میں تعلیم دینے کی مخالفت کی اور اس طرح ایسے طلبہ کی کھیپ تیار کرنے میں مدد دی جو بقول میکالے:

> "خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر مذاق اور رائے' اخلاق اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو۔"(۴۰)

غرض اب جو دور شروع ہوا اسے دور اصلاحات کہنا چاہیے۔ بظاہر یہ اصلاحات ہندوستانیوں کی بھلائی کے لیے تھیں مگر درحقیقت ان کا مقصد انگریزی حکومت کے قدم ملک میں مضبوطی سے جمانا تھا۔

حکومت ہند اس وقت شدید خسارے میں جا رہی تھی۔ اس لیے برطانیہ سے معاشیات کے ماہرین بلوائے گئے جنہوں نے اقتصادی ڈھانچے میں بہت سی تبدیلیاں تجویز کیں۔ چنانچہ فوج میں کمی کی گئی، کاغذی نوٹ جاری کیے گئے اور سول انتظامیہ میں تخفیف کی گئی۔ اس سے حکومت چند برسوں میں اقتصادی طور پر مضبوط ہو گئی۔

۱۸۶۱ء میں انڈین کونسل ایکٹ منظور ہوا۔ گورنر جنرل کی انتظامی مجلس پر بار کم کرنے کے لیے صوبوں کو بھی قانون سازی کے اختیارات دیے گئے۔ تاہم بعض قوانین کے لیے گورنر جنرل سے قبل از وقت اجازت کو ضروری قرار دیا گیا۔ ہندوستانیوں کو پہلی بار مرکزی مقننہ میں نمائندگی دی گئی۔

تین یونیورسٹیاں کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں قائم کی گئیں۔ بعد میں پنجاب اور الہ آباد میں بھی یونیورسٹیوں کا قیام عمل میں آیا۔

۱۸۶۱ء میں کلکتے اور الہ آباد کے درمیان ایسٹ انڈیا ریلوے شروع ہو گئی۔ انڈین پینل کوڈ (قانون تعزیرات ہند) ۱۸۶۰ء میں نافذ کر دیا گیا۔ لیجسلیٹو کونسل نے سول اور کرمینل پروسیجر کے قوانین بنائے۔

یہ تمام اصلاحات پہلے وائسرائے لارڈ کیننگ کے عہد میں ہوئیں۔ پھر ان میں معمولی تبدیلیاں لارڈ رپن، لینس ڈاؤن، لارڈ ایلگن (دوم) وغیرہ کے عہد میں ہوئیں۔ رپن کے زمانے میں لوکل سیلف گورنمنٹ کا بل پاس ہوا اور ہندوستان بھر میں میونسپل کمیٹیاں اور ڈسٹرکٹ بورڈ قائم کیے گئے۔ لارڈ کیننگ (۱۸۵۸ء) سے لارڈ ایلگن دوم (۱۸۹۹ء) تک کا زمانہ جو چالیس برسوں پر محیط ہے، ہندوستان میں برطانوی سلطنت کے زبردست استحکام کا زمانہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بعد جب لارڈ کرزن ۱۸۹۹ء میں وائسرائے مقرر ہوا تو یہ بظاہر پر سکون فضا دفعتاً" سراپا احتجاج بن گئی۔ لارڈ کرزن نے ۱۹۰۳ء کے دربار دہلی میں ہندوستانیوں کو مستقبل کے سنہرے سپنے دکھا کر خوش کرنے کی کوشش کی تھی مگر اب لوگ خوش حالی کا انتظار کرتے کرتے تھک چکے تھے۔ ردعمل شروع ہو رہا تھا۔ ایک انگریز مورخ ان حالات نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں:

"In fact, this Durbar marked the end of the comparatively restful and untroubled era, which had lasted for forty years. It was an era of successful and unchallenged government, of increasing and widening education, of growing commerce, of an improving land

revenue system, of all round progress. Yet, among the still scanty western educated classes, discontent slumbered lightly under a surface that was usually smooth. Peculiar economic conditions were producing an increasing number of youths for whom life seemed hard and difficult, inspite of English Education; the ideas and customs of ages had been shaken; political gatherings were beginning to surpass fairs and caste meetings in social interest. There was a desire for change, on impatience of the present, a growing doctrine that the old times were better than the new. In one part of India this doctrine had been openly preached; and there and elsewhere advantage was taken of famines, of plague, of poverty, of lack of occupation, of the chequered incidents of Boer war, to depreciate British efficiency and British rule."(41)

اس کتاب کے مصنف برطانوی حکومت کا خالصتاً سرکاری نقطۂ نظر پیش کرتے ہیں مگر اس کے باوجود اس سے خاموشی کی تہہ میں چھپے ہوئے طوفان کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

سیاسی تحریکوں کا آغاز

سچ تو یہ ہے کہ ہندوستان کا محاذ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے کچلے جانے کے باوجود مکمل طور پر کبھی خاموش نہیں رہا۔ ان چالیس برسوں میں بھی ایسے واقعات ہوتے رہے جو ہندوستانیوں کی انگریز دشمنی کا اظہار کر جاتے تھے۔ ۶۰-۱۸۵۹ء میں نیل کے بنگالی کاشتکاروں اور یورپی مالکوں کے درمیان فسادات، ۱۸۶۱ء اور پھر ۱۸۶۳ء میں مالکا اور پنجاب پر وہابیوں کے حملے، ۱۸۷۸ء میں لدھیانہ کے قریب کوکا سکھوں کی انگریز دشمن تحریک، ۱۸۹۰ء میں منی پور (آسام) کے راجہ کی بغاوت، ۱۸۹۵ء میں میواتیوں کی بغاوت، ۱۸۹۷ء میں درۂ خیبر کے قریب آفریدیوں کی جنگ۔ یہ سارے واقعات اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ ہندوستان کے تمام لوگ اس زمانے میں بھی سرکار برطانیہ کی وفادار رعایا نہ بن سکے اور ہمیشہ ذہنی طور پر اپنے آپ کو انگریزوں سے الگ تھلگ سمجھتے رہے۔

بغاوت کی اس دبی دبی فضا میں شعلے تو ذرا بعد میں بھڑکے۔ البتہ بھس میں پہلی چنگاری قیام کانگرس نے ڈالی۔ کانگرس اپنے قیام کے زمانے میں انقلابی جماعت نہ تھی۔ اس کے

قیام کا مقصد فقط یہ تھا کہ انگریزوں سے چند مراعات کے حصول کے لیے وقتاً فوقتاً درخواستیں کی جائیں۔ اس طرح جو چند حقوق حاصل ہو جاتے تھے ان سے کانگرس والے مطمئن دکھائی دیتے تھے۔ کانگرس کے قیام میں انگریزوں کی دلچسپی، تائید اور رہنمائی بھی کچھ شامل تھا اس کے متعلق لووٹ لکھتے ہیں:

"In march, 1885, some Indians of the new school of thought, seeking for a remedy for the then existing state of things, decided to hold a congress of delegates of their own persuasion from all parts of British India. This resolution appears to have been largely inspired by the late Mr. Allan Octavian Hume, a well known liberal, whom his follwers have always called the Father of the Congress."(42)

کانگرس کے پہلے منشور میں یہ الفاظ بھی تھے کہ آئندہ چند برسوں میں یہ جماعت ان لوگوں کے الزام کا ناقابل تردید جواب دے گی جن کے خیال میں ہندوستان "کسی قسم کی نمائندہ" حکومت کا اہل نہیں ہے۔ ان مقاصد کے حصول کی طرف قدم اٹھانے کے لیے بمبئی میں ۲۸، ۲۹ اور ۳۰ دسمبر ۱۸۸۵ء کو کانگرس کا پہلا اجلاس ہوا جس میں بہتر مندوبین ہندوستان بھر سے شامل ہوئے "جن کو بڑی کوششوں سے جمع کیا گیا۔"(۴۳) اس میں صرف دو مسلمان شریک ہوئے۔ دونوں بمبئی کے وکیل تھے۔ مسٹر ڈبلیو بینرجی کو صدر منتخب کیا گیا جنھوں نے اپنی تقریر میں کانگرس کے مقاصد یوں متعین کیے:

"One of the objects of the association is the eradicaton, by direct friendly personal intercourse, of all possible race, creed, or provincial prejudices amongst all lovers of our country and the fuller development and consolidation of those sentiments of national unity that had their origin in our beloved Lord Ripon's memorable reign." (44)

کانگرس کے دوسرے اجلاس منعقدہ ۱۸۸۶ء میں اگرچہ زیادہ مندوبین نے شرکت کی مگر اس کے باوجود وفاداری کا لہجہ برقرار رہا۔

۱۸۹۰ء کے بعد ہندوستان کے حالات میں بنیادی تبدیلیاں آئیں۔ برطانوی افسر شاہی کا سخت نظام کمزور پڑنے لگا۔ ہندوستان کی پرامن قوم پرستی کی تحریک متشددانہ صورت اختیار کرنے لگی خصوصاً ہندوؤں کی کئی احیائی تحریکیں اس دور میں شروع ہوئیں اور انگریزوں کو

ہندوستان میں آرام سے حکومت کرنے کا موقع پھر کبھی نہ ملا۔ ٹی۔ ڈبلیو۔ وال بینک لکھتا ہے:

> "By 1895 what came to be known as 'Indian problem' had emerged. The Stars in their courses seemed to conspire against British authority in India as plague, droughty, famine, unrest along the north west frontier, and political terrorism descended on the land"(45)

ان حالات کی ذمہ داری لارڈ کرزن پر بھی عاید ہوتی ہے۔ وہ ہندوستان کے لوگوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اس نے کلکتے میں ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے ہندوستانیوں کو "جھوٹوں کی قوم"(۴۶) قرار دیا۔ اس پر شدید احتجاج ہوا۔ خصوصاً بنگالی اخبارات نے لارڈ کرزن کے خلاف مہم شروع کر دی اس زمانے میں بنگال کے اخبارات پر ہندوؤں کا قبضہ تھا اور اس مہم میں وہی پیش پیش تھے اب تک انگریزوں کی پالیسی یہ رہی تھی کہ مسلمانوں کے مقابلے میں ہندوؤں کو فائدہ پہنچایا جائے۔ چنانچہ تمام منصوبہ بندی اسی بنیاد پر کی گئی تھی۔ چنانچہ ہندو ساہوکار اور سرکاری ملازمین کثرت سے وجود میں آگئے تھے اور مسلمان بے روزگار اور فلاکت زدہ ہو گئے تھے۔ اب کرزن نے مسلمانوں کو ابھارنا چاہا اور اس غرض سے پہلا کام یہ کیا کہ بنگال کے صوبے کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ایک مشرقی صوبہ (جو تقریباً انہی علاقوں پر مشتمل تھا جو موجودہ بنگلہ دیش ہے)۔ اس کا صدر مقام ڈھاکہ ہوا۔ دوسرا مغربی صوبہ جو موجودہ بھارتی بنگال کے علاقوں پر مشتمل تھا' اس کا صدر مقام کلکتہ بنایا گیا۔ اس طرح بنگال کو تقسیم کر کے ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کو ابھارنے کی کوشش کی گئی کیونکہ مشرقی صوبہ مسلمانوں کی اکثریت کا علاقہ تھا اس لیے توقع تھی کہ اس سے مسلمانوں کو ملازمتوں وغیرہ میں فائدہ پہنچے گا۔ کانگرس نے' جس میں اکثریت بنگالی ہندوؤں کی تھی' اسے انگریزوں کی "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" والی پالیسی کا شاخسانہ قرار دیا اور اس کے خلاف زوردار تحریک شروع کر دی۔ اور مطالبہ کیا کہ تقسیم بنگال کو فوراً منسوخ کر دیا جائے۔ مگر لارڈ کرزن اس کے لیے کسی طرح بھی آمادہ نہ ہوا۔ اس پر کانگرس نے ہندوستان بھر میں انگریزوں کے خلاف عدم تعاون (یا ترک موالات) کی تحریک شروع کر دی۔ لوگوں سے کہا گیا کہ:

۱۔ کونسلوں کے انتخابات میں حصہ نہ لیا جائے۔

۲۔ سرکاری ملازمتیں ترک کر دی جائیں۔

۳- خطاب یافتہ افراد اپنے خطابات واپس کر دیں۔

۴- عدالتوں میں مقدمے نہ لڑے جائیں۔

۵- بدیشی کپڑے کا بائیکاٹ کیا جائے۔ اس کی بجائے ملکی کھدر پہنا جائے۔

۶- چھوت چھات ختم کر دی جائے اور اچھوتوں کو وہی درجہ دیا جائے جو اعلیٰ ذاتوں کو حاصل ہے۔

اس قومی تحریک کا روح رواں بال گنگا دھر تلک تھا جسے ہندوؤں کی متشددانہ قوم پرستی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ وہ گوکھلے جیسے اعتدال پسندوں کا سخت مخالف تھا۔ اس نے لوگوں کو یہ تعلیم دی کہ غیر ملکیوں کو تشدد کے ذریعے ہندوستان سے نکال دینا چاہیے۔ اس نے شیواجی کو ہندوؤں کا سب سے بڑا ہیرو قرار دیا اور ہندو قوم کو اس کے نقش قدم پر چلنے کا مشورہ دیا۔ شیواجی کے ہاتھوں افضل خاں سپہ سالار کے مکارانہ قتل کو تلک نے جائز قرار دیا۔ اس نے گنیش پوجا کو پھر رواج دیا۔ کالی دیوی کو علامت کے طور پر استعمال کرتے ہوئے ہندوؤں سے کہا کہ کالی پیاسی ہے اور اس کی پیاس خون ہی سے بجھ سکتی ہے بنکم چندر چیٹرجی کا ترانہ "بندے ماترم-"(۴۷) ہندوؤں کی تقریبوں میں قومی ترانے کی حیثیت اختیار کر گیا۔ چنانچہ متشددانہ ہندو قوم پرستی کی یہ تحریک انگریزوں کی مخالفت تک محدود نہ رہی بلکہ اس نے یہ تصور بھی ہندو دماغوں میں بٹھا دیا کہ انگریزوں کے ساتھ ساتھ مسلمان بھی ہندوؤں کے دشمن ہیں۔ گورنمنٹ کی مقرر کی ہوئی سیڈیشن کمیٹی (۱۹۱۸ء) کی رپورٹ میں اس تحریک کے ایک پسندیدہ اشلوک کا ترجمہ دیا گیا ہے:

> Alas, "You are not ashamed to remain in servitude, try therefore to commit suicide, alas, like butchers, the wicked in their monstrous atrocity kill calves and kine; free her (the cow) from her trouble; die but kill the English do not remain idle or thereby burden the earth. This is called Hindustan, how is it that the English rule here."(48)

رپورٹ یہ بھی کہتی ہے:

> "The chapekars and their associates were ultra orthodox and perhaps consequently, anti Muhammaden and anti British."(49)

اس تحریک نے لوگوں کے جذبات کو انگریزوں کے خلاف ابھارنے میں نمایاں کام کیا

مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ہندو مسلم تعلقات کو مستقلاً خراب کرنے میں بھی اس کا بہت حصہ ہے۔

اس تحریک کے نتیجے کے طور پر لاقانونیت اور تشدد کے بہت سے واقعات پیش آئے۔ کچھ لوگوں کو بم سازی کی تربیت حاصل کرنے کے لیے پیرس وغیرہ بھیجا گیا۔ برطانوی باشندوں پر بم پھینکے جانے لگے۔ بہت سے انگریز ہلاک اور مجروح ہوئے۔

کرزن کے عہد کا آخری حصہ اسی طرح کے واقعات سے بھرا پڑا ہے۔ ایک برطانوی مورخ نے لکھا تھا:

> "Foreign conquerors have treated the native with violance and often with great cruelty but none have treated them with so much scorn as we, none has stigmatized the whole people as unworthy of trust, as incapable of honesty, and as fit to be employed only where we cannot do without them."(50)

لوگ اس ذلت و رسوائی کو کب تک برداشت کرتے۔ اندر ہی اندر لاوا پک رہا تھا۔ جس کو بعض واقعات نے شدید تر کر دیا۔ ۱۸۹۶ء میں ابی سینیا نے اٹلی کی طاقتور فوج کو شکست دی۔ اس سے ہندوستان کے لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ یورپ ناقابل شکست نہیں ہے۔ اسی طرح جنگ بوئر (۱۹۰۲- ۱۸۹۹ء) میں اگرچہ برطانیہ کو فتح ہوئی مگر بوئر کے کسانوں نے جس بہادری کے ساتھ برطانیہ کی بہترین فوج سے مقابلہ کیا اور اسے شدید نقصان پہنچایا اس نے بھی ہندوستان کے باشندوں کو حیرت زدہ کر دیا۔ سب سے زیادہ جس چیز نے لوگوں کو برطانوی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے پر مائل کیا وہ ۱۹۰۵ء میں جاپان کے ہاتھوں روس کی شکست تھی۔ اس سے لوگوں میں عام طور پر یہ خیال پیدا ہوا کہ ایشیا کی بیداری اور یورپ کی تباہی کا زمانہ آگیا ہے۔ جاپان کی فتح کا ہندوستان میں جو ردعمل ہوا اس کا نقشہ ایک مورخ نے یوں کھینچا ہے:

> "A stir of exitement passed over the north of India. Even the remote villages talked over the victories of Japan as they sat- in their circles and passed round the huqqa at night. A Turkish consul of long experience in Western Asia told me that "in the interior you could see every where the most ingnorant peasants tingling with the news" Asia was moved from one end to the other, and the

sleep of the centuries was finally broken.(51)

اس فضا میں جو نعرہ مقبول ہوا وہ تھا "ایشیا ایشیا والوں کے لیے" ہندوستان میں یہی زمانہ قوم پرستی کی مقبولیت کا تھا جس نے سیاست کو "ہوم رول" کی تحریک اور اردو ادب کو وطنی شاعری کا سرمایہ عطا کیا۔

دسمبر ۱۹۰۵ء میں بنارس کے مقام پر کانگرس کا جو اجلاس ہوا' اس میں سات سو چھپن مندوبین شریک ہوئے جن میں سترہ مسلمان' چودہ سکھ اور باقی ہندو تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس وقت بھی کانگرس مسلمانوں میں مقبول جماعت نہ تھی۔ بہرحال اس بار اجلاس کی کارروائی پہلے سے مختلف تھی۔ جاپان کی فتح کے زیر اثر لہجہ شدید ہو گیا تھا۔ ہندوستان کے لوگوں کی مفلوک الحالی کی شکایت اور بنگال کی تقسیم کا ذکر تلخ انداز میں کیا گیا تھا۔ اس اجلاس میں گوکھلے(۵۲) کو صدر منتخب کیا گیا۔ گوکھلے نے بدیشی مال کے مقاطعے کی پالیسی کو' جو تقسیم بنگال کے نتیجے میں جاری تھی' جائز قرار دیا۔ یہ بھی مطالبہ کیا کہ کونسلوں میں آدھے نمائندے منتخب کر کے شامل کیے جائیں۔

ہندو قوم پرستی کی اس تحریک میں سوامی وویکانند کا بہت حصہ تھا۔ اس کا انداز فکر ذیل کے ایک اقتباس سے نمایاں ہے جو اس کی ایک تقریر بعنوان "ہمیں کیا کرنا چاہیے" سے لیا گیا ہے:

"The first manifest effect of life is expansion. You must expand if you want to live. The moment you ceased to expand, death is upon you, danger is ahead. Those of you who think that the Hindus have been always confined within the four walls of their country through all ages are entirely mistaken.....I am an imaginative man and my idea is the conquest of the whole world by the Hindu race. There has been great conquering races in the world. We also have been great conquerers. The story of our conquest has been described by the great emporer of India, Asoka, as the conquest of religion and spirituality; Once more the world must be conquered by India."(53)

۱۹۰۶ء کے کانگرس کے اجلاس میں دادا بھائی ناروجی نے تقسیم بنگال کی تنسیخ کا مطالبہ پھر دہرایا اور ایجی ٹیشن پر لوگوں کو اکسایا۔ نتیجے کے طور پر بنگال میں بالخصوص اور ہندوستان

کے دیگر حصوں میں بالعموم انگریزوں کے خلاف بغاوت کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ سکولوں اور کالجوں کے طلبہ اور اساتذہ نے اس تحریک میں بہت حصہ لیا۔ اخبارات نے بھی لوگوں کے جذبات کو اکسانے میں کمی نہ کی۔ ۱۹۰۷ء میں کانگرس دو گروہوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ ایک معتدل گروہ تھا جو حکومت کے ساتھ مصالحت کا رویہ اپنانے کے حق میں تھا' دوسرا انتہا پسند تھا۔ معتدل مزاج گروہ کے رہنما گوکھلے اور سریندر ناتھ بینرجی تھے جب کہ انتہا پسندوں رہنمائی تلک اور آرابندو گھوش کے ہاتھوں میں تھی۔ عوام میں انتہا پسندوں کی مقبولیت بہت زیادہ تھی۔ اس لیے ان کے زیر اثر بلکہ ان کی رہنمائی میں ۱۹۰۷ء سے لے کر کئی سال بعد تک سیاسی جرائم' قتل و غارت' بم اندازی اور تشدد کے دوسرے مظاہرے جاری رہے۔(۵۴) اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگرچہ ۱۸۹۷ء سے دہشت پسندوں کی سرگرمیاں محدود پیمانے پر شروع ہو گئی تھیں مگر ۱۹۰۷ء کے قریب قریب اس میں بہت اضافہ ہوا۔ بنگال میں مظفر پور' علی پور' کلکتہ' ڈھاکہ' فرید پور' میمن سنگھ 'ہگلی' باقرگنج وغیرہ۔ بہار میں بانکی پور اور اڑیسہ وغیرہ۔ یوپی میں بنارس اور لکھنؤ۔ سی پی میں ناگ پور' جبل پور وغیرہ اور پنجاب میں امرتسر' فیروزپور' لاہور' دہلی(۵۵)' حصار' لدھیانہ' گورداس پور' ہوشیار پور وغیرہ میں بم مارنے' گاڑیوں کو اڑانے' لوٹ مار اور ڈاکا ڈالنے کے متعدد واقعات ہوئے جن میں متعدد جانیں ضائع ہوئیں اور بہت سا روپیہ اور سامان لوٹ لیا گیا۔ ان واقعات کا خلاصہ رپورٹ کے آخر میں ان لفظوں میں تحریر کیا گیا ہے:

All these plots have been directed towards one and the same objective, the overthrow by force of British rule in India. Sometimes they have been isolated sometimes they heve been interconnected, sometimes they have been encouraged and supported by Germen influence,(56)

سرسید تحریک

تحریک تشدد میں کچھ مسلمان بھی شریک تھے مگر ان کی ایک بڑی اکثریت اس سے الگ رہی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان اندر ہی اندر شکوک و شبہات کی فضا پیدا ہو گئی تھی کیونکہ اس ہنگامے کے بعد سارا عتاب مسلمانوں پر نازل ہوا تھا اور ہندو فاتحین کے غیظ و غضب سے بچ گئے تھے۔ اس بنا پر سرسید نے مسلمانوں کو انگریزوں کے خلاف تحریکوں میں شامل ہونے سے روکا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

"امریکہ میں اول اسی قسم کا ایجی ٹیشن شروع ہوا تھا اور آخر کو یہاں تک نوبت پہنچی کہ آخری لفظ جو ان کے منہ سے نکلا وہ یہ تھا کہ No Taxation Without representation پس جن لوگوں میں اس لفظ کے کہنے کی طاقت ہو، وہ اس ایجی ٹیشن میں شریک ہوں ورنہ ہیجڑوں کی طرح تالیاں بجاتی ہیں- غدر میں کیا ہوا؟ ہندوؤں نے شروع کیا، مسلمان دل جلے تھے، وہ بیچ میں کود پڑے- ہندو تو گنگا نہا کر جیسے تھے ویسے ہی ہوگئے مگر مسلمانوں کے تمام خاندان تباہ و برباد ہوگئے-"(۵۷)

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

"جن لوگوں پر بدبختی کے دن نہیں ہوتے ان کا برا کام بھی آنکھوں میں نہیں کھٹکتا- ان میں سے ہزاروں نے کیسے ہی برے کام کیے ہوں مگر ان کی برائی پر کسی کو دھیان نہیں ہوتا- یہ بدبختی کا زمانہ وہ ہے جو ۵۸-۱۸۵۷ء میں ہندوستان کے مسلمانوں پر گزرا- کوئی آفت ایسی نہیں ہے جو اس زمانے میں نہ ہوئی ہو اور یہ نہ کہا گیا ہو کہ مسلمانوں نے کی، گو وہ رام دین اور ماتا دین ہی نے کی ہو- کوئی بلا آسمان پر سے نہیں چلی جس نے زمین پر پہنچنے سے پہلے مسلمانوں کا گھر نہ ڈھونڈھا ہو-"(۵۸)

اس لیے سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کو مزید تباہی سے بچانے کے لیے انہیں یہ مشورہ دیا کہ وہ سیاست سے بالکل الگ رہیں اور ہندوؤں کی سیاسی تحریکوں کے ساتھ کوئی تعلق نہ رکھیں، حتیٰ کہ سرسید نے علی گڑھ کالج کے طلبہ کو کانگرس کے کسی جلسے جلوس میں شریک ہونے کی اجازت نہ دی اور ہمیشہ کانگریس کو ہندوؤں کی جماعت سمجھا اور قرار دیا- سرسید چاہتے تھے کہ مسلمانوں کو انگریزوں کے قریب لایا جائے اور انگریزوں کو یقین دلایا جائے کہ مسلمان من حیث القوم انگریزوں کے دشمن نہیں ہیں- اس لیے انہیں مغربی تعلیم دی جائے، انگریزی پڑھائی جائے اور ملک کے نظام میں اہم حیثیت دی جائے-

ان مقاصد کے حصول کے لیے سرسید احمد خاں نے پہلے چند ایسی کتابیں لکھیں جن میں یہ ثابت کیا گیا تھا کہ "غدر" کی ساری ذمہ داری مسلمانوں پر عائد نہیں ہوتی بلکہ وہ مخصوص حالات کے تحت اس میں شامل ہونے پر مجبور ہوگئے تھے- (اسباب بغاوت ہند) اور پھر بھی بہت سے مسلمان انگریزوں کے وفادار رہتے تھے (لائل محمڈنز آف انڈیا) پھر ایسی کتابیں لکھیں جن میں مسلمانوں کو انگریزوں اور انگریزوں کو مسلمانوں کے قریب لانے کی کوشش کی گئی تھی- ان میں تبیین الکلام اور رسالہ احکام طعام اہل کتاب وغیرہ شامل

ہیں۔ خصوصاً تبیین الکلام کا مقصد یہ تھا کہ قرآن اور بائبل کے احکام میں جہاں تک ممکن ہو مطابقت ثابت کی جائے اور جہاں جہاں اختلاف پایا جائے، وہاں اختلاف کی وجہ بیان کی جائے اور اسلام کی نسبت جو بدگمانیاں عیسائیوں کو ہیں، وہ رفع کی جائیں۔ اسی طرح وہ مسلمان جو بائبل کی تحریف لفظی کے قائل ہیں، ان کی غلط فہمی کو دور کیا جائے۔

اس کام میں جزوی کامیابی کے بعد سرسید نے دوسرے مقصد کے حصول کے لیے کوششیں شروع کر دیں، یعنی ان کی سب سے زیادہ توجہ مسلمانوں کو انگریزی زبان کے ذریعے تعلیم دینے والے اداروں کے قیام طرف ہوئی اور انہوں نے خود بھی ایک ماڈل ادارہ قائم کرنے کا ارادہ کیا۔ اس کے لیے وہ انگلستان کے تعلیمی اداروں کے نظام کو دیکھنے کے لیے انگلستان گئے۔ یہ واقعہ ۱۸۶۹ء کا ہے۔ انگلستان سے وہ اس قدر متاثر بلکہ مرعوب ہوئے کہ ان میں ایک طرح کا احساس کمتری پیدا ہوگیا۔ اس زمانے میں انگلستان صنعتی ترقی کے نقطۂ عروج پر پہنچا ہوا تھا۔ دنیا بھر میں ان کی نو آبادیاں تھیں، جہاں سے خام مال انگلستان پہنچتا تھا اور پھر کارخانوں کے ذریعے مصنوعات میں ڈھل کر کئی گنا زیادہ منافع پر نو آبادیوں میں فروخت ہو جاتا تھا۔ اس طرح نو آبادیوں کی ساری دولت انگلستان میں کھنچی چلی جاتی تھی۔ اس لیے انگلستان نہایت خوش حال ملک بن چکا تھا۔ سرسید نے ان عوامل کو نظرانداز کر دیا اور یورپ کی صنعتی، تعلیمی اور اقتصادی ترقی کا مقابلہ ہندوستان سے کر کے یہاں کے لوگوں کے بارے میں فتویٰ دے دیا کہ یہ کبھی اتنی ترقی نہیں کرسکتے۔ یورپ میں سرسید کے ڈیڑھ سالہ قیام نے ان پر بہت دور رس اثرات مرتب کیے۔ انہیں اپنے قدیم رواجوں سے نفرت سی ہوگئی اور بعض نہایت بے ضرر چیزیں مثلاً ہاتھ سے کھانا بھی بری معلوم ہونے لگیں۔ یورپ کے لوگوں سے ہندوستانیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے "مسافران لندن" میں اکثر ایسا انداز بیان اختیار کیا جو ہندوستان کے لوگوں میں مستقلاً احساس کمتری پیدا کرنے والا تھا۔ جب ہم اس کتاب میں اس قسم کے جملے دیکھتے ہیں تو سخت تعجب بلکہ دکھ ہوتا ہے:

> "ہم جو ہندوستان میں انگریزوں کو ایک نہایت بداخلاقی کا ملزم ٹھہرا کر (اگرچہ اب بھی میں اس الزام سے ان کو بری نہیں کرتا) یہ کہتے تھے کہ انگریز ہندوستانیوں کو بالکل جانور سمجھتے ہیں اور نہایت حقیر جانتے ہیں، یہ ہماری غلطی تھی۔ وہ ہم کو سمجھتے ہی نہیں تھے بلکہ درحقیقت ہم ایسے ہی ہیں۔ میں بلامبالغہ نہایت سچے دل سے کہتا ہوں کہ تمام ہندوستانیوں کو اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک، امیر سے لے کر غریب تک، سوداگر سے لے کر اہل حرفہ تک، عالم فاضل سے لے کر جاہل تک انگریزوں کی تعلیم و تربیت اور شائستگی کے مقابلے میں درحقیقت ایسی ہی

نسبت ہے جیسے نہایت لائق اور خوبصورت آدمی کے سامنے نہایت میلے کچیلے وحشی جانور کو۔ پس تم کسی جانور کو قابل تعظیم یا لائق ادب کے سمجھتے ہو؟ کچھ اس کے ساتھ اخلاق اور بداخلاقی کا خیال کرتے ہو؟ ہرگز نہیں کرتے۔ پس ہمارا کچھ حق نہیں ہے (اگرچہ وجہ ہے) کہ انگریز ہم ہندوستانیوں کو ہندوستان میں کیوں نہ وحشی جانور کی طرح سمجھیں۔"(۵۹)

"تمام خوبیاں دینی اور دنیوی جو انسان میں ہونی چاہئیں، وہ اللہ تعالیٰ نے یورپ کو اور اس میں بالتخصیص انگلینڈ کو مرحمت فرمائی ہیں۔ دینی خوبیوں سے میرا مطلب یہ ہے کہ جس دین کو وہ لوگ حق سمجھتے ہیں، ایسی خوبصورتی اور ایسی عمدگی سے اس کے تمام متعلقات کو پورا کرتے ہیں اور انجام دیتے ہیں کہ کسی ملک میں اور کوئی مذہب اس خوبی و خوش اسلوبی و سلیقے سے نہیں کرتا۔ یہ تمام نتیجہ ہے زن و مرد کے عموماً تعلیم یافتہ ہونے کا، اگر ہندوستان کے لوگ بھی عموماً تربیت پا جاویں تو ہندوستان بسبب اپنے قدرتی اوصاف کے انگلستان سے زیادہ نہیں تو یقینی اس کے قریب قریب گلزار ہو جاوے۔"(۶۰)

بہرحال کسی نہ کسی طریقے سے سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کے ایک بڑے گروہ کو اپنی زندگی میں سیاست سے الگ رکھا اور انہیں کانگرس میں شامل نہ ہونے دیا۔ سرسید کی وفات (۱۸۹۸ء) کے بعد واقعات نے ایسی سمت اختیار کر لی کہ مسلمانوں کو بھی اپنے حقوق کے حصول کے لیے میدان میں آنا پڑا۔

سب سے پہلے جس چیز نے مسلمانوں کو انگریزوں سے بدظن کیا وہ ناگری رسم الخط کی تحریک تھی جو یو پی کے لیفٹیننٹ گورنر سر انٹنی میکڈانل کی سرپرستی میں شروع ہوئی تھی۔ گورنر صاحب نے ایک حکم کے ذریعے یو پی میں صرف ناگری رسم الخط میں لکھے ہوئے کاغذات اور درخواستیں قبول کرنے کا فیصلہ نافذ کر دیا۔ مسلمانوں نے اس بات کو اپنی تہذیب پر حملہ قرار دیا اور اس کا شدید ردعمل ہوا۔ جگہ جگہ گورنمنٹ کے خلاف جلسے ہونے لگے۔ اس کے مقابلے میں چونکہ ناگری خط کے اجرا سے ہندوؤں کو مزید فائدہ پہنچتا تھا اس لیے انہوں نے بہت سے جلسے گورنمنٹ کی تائید و حمایت میں کیے۔ بہرحال مسلمانوں اور ہندوؤں میں اس فیصلے سے وسیع خلیج پیدا ہوئی۔ اٹاوہ کے اخبار "البشیر" نے اس مسئلے پر مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا اور سو سے زیادہ مضامین شائع کیے۔(۶۱) دوسرے اخباروں میں بھی بہت سے مضمون شائع ہوئے۔ محسن الملک کو، جو اس وقت علی گڑھ کالج کے آنریری سیکرٹری تھے، مجبوراً مسلمانوں کے جذبات کا ساتھ دینے کے لیے میدان میں اترنا پڑا۔ ۱۳ مئی ۱۹۰۰ء کو ایک اجلاس منعقد ہوا۔ اس میں محسن الملک نے ایک

پرزور تقریر ناگری کے خلاف کی۔ یہ جلسہ لیفٹیننٹ گورنر کی ناراضی کا باعث ہوا۔ نواب محسن الملک اردو کی تحریک کے صدر تھے۔ گورنر خود علی گڑھ آئے اور کہا کہ محسن الملک یا تو علی گڑھ کالج کے سیکرٹری رہیں یا انجمن اردو کے صدر' چنانچہ ٹرسٹیوں کے مجبور کرنے پر انہیں انجمن اردو کو چھوڑنا پڑا۔ اس پر بعض مسلمانوں کو خیال آیا کہ کانگرس کی طرح مسلمانوں کی بھی کوئی سیاسی جماعت ہونی چاہیے جو ان کے حقوق کے لیے حکومت سے مطالبات کر سکے' چنانچہ نواب فتح نواز جنگ نے ۹ اپریل ۱۹۰۱ء کے "پانیر" میں ایک چٹھی لکھی۔ اس میں تحریر تھا کہ سرسید کانگرس سے اس لیے علیحدہ نہ ہوئے تھے کہ مسلمان بالکل خاموش ہو کر بیٹھ رہیں' بلکہ غرض یہ تھی کہ وہ اپنی ضروریات گورنمنٹ کے سامنے جداگانہ پیش کیا کریں ـــــ اب ان کے پائے کا کوئی شخص نہیں ہے' اس لیے ایک ایسی جماعت قائم کرنے کی ضرورت ہے جو گورنمنٹ کو مسلمانوں کی ضروریات سے آگاہ کرے اور اپنے حقوق حاصل کرے۔(۶۲) یہی مسلم لیگ کے قیام کا ابتدائی تخیل ہے مگر مسلم لیگ کے قیام کو اس کے بعد بھی چند برس اور لگ گئے۔

پہلے ذکر کیا جاچکا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے واقعات کے بعد انگریزوں کے انتقام کا نشانہ زیادہ تر مسلمان بنے تھے۔ مسلمانوں سے کھوئے حکومت چھیننے کے لیے ہر اس جگہ سے مسلمانوں کا اخراج عمل میں آیا جو مجلسی زندگی میں اہمیت رکھتی تھی اور ان کی جگہ ہندوؤں کو دی گئی' مگر ہندو جب تعلیم حاصل کر کے ترقی کے ایک خاص درجے تک جا پہنچے تو یہ مراعات انہیں ناکافی معلوم ہوئیں۔ پھر انہیں غلامی کا احساس بھی ہوا' انگریزوں کے استحصال کو سمجھنے کا شعور پیدا ہو۔ اس کا نتیجہ ہندو قوم پرستی کی تحریکوں کی صورت میں نکلا۔ اب انگریزوں کو محسوس ہوا کہ ہندوؤں کو زیادہ ابھار دیا گیا ہے اور مسلمانوں کو زیادہ ہی گرا دیا گیا ہے' چنانچہ تقسیم بنگال کے بعد لارڈ کرزن بذات خود ڈھاکا پہنچے اور وہاں ایک جلسہ عام میں مسلمانوں کو خطاب کر کے کہا:

"تقسیم بنگال سے ان کا مقصد صرف یہ نہ تھا کہ بنگال کی گورنمنٹ کے انتظامی بوجھ کو ہلکا کیا جائے بلکہ ایک اسلامی صوبہ بنانا تھا جس میں مسلمانوں کا غلبہ ہو۔"(۶۳)

مسلم لیگ کا قیام

مسلمانوں نے جب انگریزوں کا میلان اپنی طرف دیکھا تو انہوں نے موقعے سے فائدہ اٹھانے کا سوچا۔ یکم اکتوبر ۱۹۰۶ع کو سر آغا خاں کی سرکردگی میں مسلمانوں کے چیدہ چیدہ

لیڈروں کا ایک وفد وائسرائے سے ملا اور مسلمانوں کے حقوق کے لیے اپنے مطالبات پیش کیے۔ خصوصاً منٹو مارلے اصلاحات میں مسلمانوں کی اہمیت کے متعلق گفتگو کی اور مطالبہ کیا کہ مسلمانوں کو ان کی اکثریت اور سیاسی اہمیت کے اعتبار سے لوکل سیلف گورنمنٹ کے اداروں اور اسمبلیوں میں نمائندگی دی جائے۔ شملہ وفد کے بعد ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو نواب وقار الملک کی صدارت میں ایک جلسہ ڈھاکا میں منعقد ہوا جس میں آل انڈیا مسلم لیگ قائم کی گئی۔ آنے والے چند برسوں میں مسلم لیگ کے کئی اجلاس ہندوستان کے متعدد مقامات پر ہوئے جن میں ان مطالبات کو دہرایا گیا۔ اس بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ انگریزوں کے اشارے پر کیا گیا تھا۔ اکبر الہ آبادی بھی اس سے زیادہ خوش نہ تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ کانگرس یا ہندوؤں کی ضد پر مطالبات کرنا کوئی اچھا طریق کار نہیں۔ مسلمانوں کو خود اپنی بہتری کے لیے تعمیری طریقے اختیار کرنے چاہئیں۔ طفیل احمد منگلوری نے مسلم لیگ کے قیام اور مطالبات کے متعلق جو تجزیہ پیش کیا ہے، وہی بہت سے دیگر مولفین کا نقطۂ نظر معلوم ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "۳۰ جولائی ۱۹۰۶ء کو نواب حاجی محمد اسماعیل خان رئیس علی گڑھ نے، جو نینی تال میں تھے، اور حکام رس تھے، نواب محسن الملک بہادر آنریری سیکرٹری کالج کو ایک مسودہ تیار کر کے بھیجا کہ مسلمان بھی اپنے حقوق کا مطالبہ کریں اور عام طور پر تعلیم یافتہ مسلمانوں نے اس کی طرف توجہ کی۔ اسی زمانے میں علی گڑھ کالج کے پرنسپل مسٹر آرچ بولڈ بوجہ تعطیلات کلاں شملہ میں تھے جو اعلیٰ حکام سے ملتے رہتے تھے۔ انہوں نے مجوزہ وفد کے بارے میں پرائیویٹ سیکرٹری وائسرائے سے گفتگو کی۔ اس گفتگو کے بعد مسٹر آرچ بولڈ نے جو چٹھی ۱۰ اگست ۱۹۰۶ء کو نواب محسن الملک مرحوم کو لکھی اور جو طبع ہو کر ممبران وفد کے پاس بھیجی گئی، اس چٹھی کے خلاصے سے معلوم ہو گا کہ علی گڑھ کالج کے پرنسپل تمام سیاسی جزئیات میں مسلمانوں کی کس طرح رہنمائی کیا کرتے تھے اور وہ علی گڑھ میں بمنزلہ گورنمنٹ ریذیڈنٹ کے ہوتے تھے۔" (۶۴)

مگر یہ مسلمانوں کی مجبوری تھی کہ انہیں انگریزی کی تائید و حمایت کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ ابھی ان کی سماجی حیثیت کے استحکام کا آغاز ہی تھا۔ وہ ابھی سے حکومت کے ساتھ ٹکر لینے پر نہ تو تیار تھے، نہ انہیں اس کی ضرورت تھی۔ انہیں فائدہ ہو سکتا تھا تو حکومت کی حمایت کر کے کانگرس بھی تو اپنے قیام کے چند سال بعد تک اسی طرح کی جماعت رہی تھی۔

مسلم لیگ کے ابتدائی اجلاس چند برسوں میں کراچی، علی گڑھ، امرتسر اور دہلی میں

منعقد ہوئے جس میں مذکورہ بالا مطالبات دہرائے گئے مگر آخر الذکر اجلاس منعقدہ ۱۹۱۰ع کے بعد علی گڑھ میں نواب وقار الملک اور ٹرسٹیوں کے درمیان یورپین سٹاف کے سلسلے میں اختلاف پیدا ہوا۔ تمام مسلمانوں نے ہندوستان بھر کے مختلف علاقوں میں وقار الملک کے موقف کی تائید میں جلسے کیے تو انگریز مسلم لیگ سے ناراض ہو گئے۔ نتیجہ یہ کہ مسلم لیگ کی پالیسی انگریزوں کی خوشنودی تک محدود نہ رہی۔ بقول طفیل احمد منگلوری:

"اس تبدیلی سے مسلم لیگ کا کچھ نہ کچھ فائدہ ہوا۔ علی گڑھ سے مسلم لیگ کا دفتر اٹھ جانے سے مسلمانوں کی سیاسی پالیسی انگریز پرنسپل کے ہاتھوں سے نکل گئی اور اس طرح عہد تثلیث کے پچیس سال کے دور کا خاتمہ ہوگیا اور مسلم لیگ نے علی گڑھ سے خارج البلد ہو کر لکھنؤ کی تازہ اور کھلی ہوا میں اپنی آزادی کا مظاہرہ کیا۔" (۶۵)

اس کے بعد یکے بعد دیگرے چند ایسے واقعات پیش آئے جنہوں نے مسلمانوں کو انگریزوں کے سخت خلاف کر دیا۔ دسمبر ۱۹۱۱ء میں جارج پنجم ہندوستان آئے اور دہلی میں دربار منعقد کیا۔ اس دربار میں انہوں نے تقسیم بنگال کی تنسیخ کا اعلان کر دیا۔ اس تقسیم کو پہلے حکومت نے ایک طے شدہ مسئلہ قرار دیا تھا مگر اب مسلمانوں کی دل شکنی یا ہندوؤں کی دلداری کے لیے اسے منسوخ کر دیا گیا۔ اس کا ردعمل مسلمانوں میں جس طرح ہوا' وہ ذیل کے دو اقتباسات سے واضح ہے۔ ۴ مارچ ۱۹۱۲ء کو کلکتے میں مسلم لیگ کا جو اجلاس نواب سلیم اللہ کی صدارت میں ہوا' اس میں نواب صاحب نے اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

"یہ تقسیم ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۱ء تک نافذ رہی اور ہمارے بدخواہوں نے محسوس کیا کہ اس سے مسلمانوں کے حقوق کی طرف توجہ ہوگی۔ اگرچہ اس تقسیم سے ہمیں کچھ نہیں ملا تاہم جو کچھ بھی ملا وہ برادران وطن کے نقصان کا موجب نہ تھا۔ برادران وطن نے تقسیم کے خلاف شورش کی' سخت جرائم کا ارتکاب کیا۔ قتل اور ڈکیتیاں کیں' ولایتی سامان کو ترک کیا۔ افسوس کہ اس قدر زبردست شورش اور بغاوت کا گورنمنٹ نے کچھ خیال نہ کیا۔ مسلمان وفاداری کی وجہ سے اس میں شریک نہ ہوئے اور یہ وجہ بھی تھی کہ صوبے کا تقسیم ہونا مسلمان کاشتکاروں کے لیے مفید تھا۔ ان کے ہندو زمینداروں نے انہیں مجبور کیا کہ وہ بھی شورش میں شریک ہوں مگر مسلمان وفادار رہے۔ اس بنا پر ہندو مسلمان میں رنجش ہوئی۔ گورنمنٹ ہند کے مراسلے میں جو یہ تحریر ہے کہ صوبے کی تقسیم

سے ہندو مسلمانوں میں رنجش ہوئی صحیح نہیں ہے۔ مگر اصل بنا یہ ہے کہ مسلمانوں نے گورنمنٹ کے خلاف باغیانہ سازش میں شریک ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ گورنمنٹ نے سختی کی جس سے شورش پسندوں کا جوش بڑھا۔ ایک طرف دولت مند قوم تھی دوسری طرف گورنمنٹ کے طرفدار مسلمان تھے۔ یہ سب کچھ ہو رہا تھا کہ گورنمنٹ نے انتظامی مصالح کی بنا پر دفعتاً" تقسیم کو منسوخ کرنا طے کر دیا۔ یہ منسوخی بلا ہم سے مشورہ یا اطلاع کے کی گئی ہے مگر ہم نے بوجہ وفاداری کے ضبط کیا۔" (٦٦)

ان الفاظ کے اندر جو تلخی چھپی ہوئی ہے' اسے با آسانی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس سے زیادہ شدید الفاظ میں نواب وقار الملک کا ردعمل ظاہر ہوا۔

"گورنمنٹ کی یہ پالیسی بمنزلہ ایک توپ خانے کے تھی جو مسلمانوں کی مردہ لاشوں پر سے گزر گیا' بدون اس احساس کے کہ ان غریب لاشوں میں سے کسی میں کچھ جان بھی ہے اور ان کو اس سے کوئی تکلیف ہوگی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔" (٦٧)

تقسیم کی تنسیخ کا نتیجہ یہ نکلا کہ کانگرس اور مسلم لیگ نے ایک ہی نہج پر سوچنا شروع کیا' چنانچہ مسلم لیگ اور کانگرس کے پروگرام ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ کانگرس پہلے ہی ہندوستان کے لیے نو آبادیاتی درجے کا مطالبہ کر رہی تھی' تقسیم بنگال کی تنسیخ نے مسلم لیگ کو بھی اس طرف مائل کیا۔ اس کے ساتھ ہی یکے بعد دیگرے کچھ ایسے واقعات پیش آئے جن سے مسلمان انگریزوں کے سخت خلاف ہو گئے۔

تحریک خلافت

انگریز ترکی کے یورپی علاقے کو بالخصوص للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے تھے۔ جب ترکی میں قوم پرستی کی تحریکیں شروع ہوئیں اور انگریزوں کو اپنا منصوبہ ناکام ہوتا نظر آیا تو انہوں نے ترکی کو ٹھکانے لگانے کا ارادہ کر لیا۔ منصوبے کے مطابق پہلے اٹلی نے ۱۹۱۱ء میں لیبیا (طرابلس) پر حملہ کیا مگر لیبیا نے خوب مدافعت کی۔ یہ لڑائی جاری تھی کہ بلقان نے ترکی پر حملہ کر دیا۔ اس میں عیسائی دنیا کی شرکت اور دلچسپی اس سے ظاہر ہے کہ یونان کے بادشاہ نے اسے صلیبی جنگ قرار دیا۔ برطانیہ کے وزیراعظم مسٹر ایسکوتھ اور وزیر خارجہ ایڈورڈ گرے نے فاتحین کو مبارکباد کے پیغام بھیجے۔ ہندوستان کے مسلمان ان خبروں سے مضطرب تھے۔ اکبر' ظفر علی خاں' شبلی نعمانی اور اقبال(٦٨) کی نظموں نے ان واقعات کی دکھ

بھری تصویریں مسلمانوں کے سامنے پیش کیں۔ سیاسی رہنماؤں نے مسلمانوں کو اپنے بھائیوں کی مدد کے لیے پکارا۔ زمیندار، الہلال، ہمدرد، مسلم گزٹ، کامریڈ اور دیگر اخبارات نے اس بیداری میں بہت حصہ لیا۔ غرض مسلمان انگریزوں کے سخت دشمن ہوگئے اور سرسید نے جتنی کوششیں انہیں انگریزوں سے قریب لانے میں کی تھیں وہ اس مختصر وقفے میں قصہ پارینہ بن گئیں۔ خود ہندوستان میں بھی ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے مسلمانوں کی برگشتگی میں اہم حصہ لیا اور وہ تھا مسجد مچھلی بازار کانپور کا واقعہ۔ ۱۹۱۳ء میں کانپور کی کسی سڑک کو سیدھا کرنے کے لیے ایک مسجد کا کچھ حصہ گرا دیا گیا۔ جب مسلمان ۱۳ اگست کے دن مسجد کی گری ہوئی اینٹیں جمع کرنے کے لیے اکٹھے ہوئے تو حکومت کے حکم سے ان پر گولی چلائی گئی۔ کئی مسلمان شہید ہوئے۔ اس واقعے سے مسلمانوں میں شدید اشتعال پیدا ہوا۔(۶۹)

ان واقعات میں چونکہ ہندوؤں نے مسلمانوں کا ساتھ دیا۔ اس لیے کانگرس اور مسلم لیگ کو قریب آنے میں بہت مدد لی۔ لووٹ نے لکھا ہے:

> "While these impressions were working on their (Muslim's) minds, congress newspapers were profuse in expressinos of sympathy over the misfortunes of Turkey."(70)

جنوری ۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ نے اپنے دستور میں ترمیم کی اور ان الفاظ کا اضافہ کیا:

> "The attainment of the system of self government suitable to India"(71)

اس کے بعد کئی برسوں تک مسلم لیگ اور کانگرس کے سالانہ اجلاس ایک ہی مقام پر ہوتے رہے۔ ۱۹۱۴ع میں جب پہلی عالم گیر جنگ چھڑ گئی تو سیاسی جوش و خروش میں کچھ کمی آگئی۔ ہندوستانیوں کا خیال تھا کہ اگر محوری طاقتیں جیت گئیں تو وہ ہندوستانیوں کے ساتھ نہایت برا سلوک کریں گی۔ علاوہ ازیں لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے اور زیادہ سے زیادہ فوجی اور مالی مدد حاصل کرنے کے لیے انگریزوں نے ان سے کچھ وعدے کیے تھے۔
ایک مصنف لکھتے ہیں:

> Wide publicity was also given in India in the early months of the War to speeches made by British officials in which they promised generous measures of constituitional reforms for India. In particular, prime Minister Asquith

had declared that henceforth Indian question would have to be approached from a different angle of vision."(72)

مگر جنگ طول پکڑتی رہی اور وعدوں کا ذکر اذکار ترک کر دیا گیا۔ اس سے لوگوں نے سمجھا کہ حکومت عمداً اپنے وعدے پورے کرنے سے پہلوتہی کر رہی ہے۔ چنانچہ حکومت کے خلاف نفرت بڑھی۔ اس میں مزید شدت دو چیزوں نے پیدا کی۔ جنگ کے دوران بے شمار ہندوستانی فوج میں اپنی مرضی سے یا زبردستی بھرتی ہو کر گئے تھے۔ ان میں سے چھبیس ہزار سے زیادہ مارے گئے اور ستر ہزار کے لگ بھگ زخمی ہوئے۔ (۷۳) اس کے علاوہ جنگی مصارف کے لیے بہت بڑی رقم بھی ہندوستان نے مہیا کی۔ چنانچہ یہ فوج جنگ تو برطانیہ کے لیے لڑ رہی تھی مگر اس کے تمام اخراجات ہندوستان کے خزانے سے ادا کیے جا رہے تھے۔
T.W.Wallbank کے بقول:

This obligation cost between twenty and thrity Million pounds sterling a year, at a time when the total revenue of the central government was only 100, 000, 000, pounds"(74)

۱۹۱۶ء کا سال اس زمانے کی سیاست میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس سال شریف مکہ نے انگریزوں کے ایماء پر ترکوں کے خلاف بغاوت کر دی۔ ۲۷ جون کو کلکتے میں مسلم لیگ کا اجلاس ہوا جس میں ایک قرارداد منظور ہوئی۔ اس میں شریف مکہ' اس کے باغی ساتھیوں اور ان کے ہمدردوں کو "دشمنان اسلام" قرار دیا گیا تھا۔ اس قرارداد کی وسیع پیمانے پر نشرو اشاعت کی گئی مگر حکومت نے جلد ہی اس کی اشاعت پر پابندی عاید کر دی۔

اس سے پہلے اپریل ۱۹۱۶ء میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے اجلاس منعقدہ الہ آباد میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ "ہوم رول" کے حصول کو مقصد قرار دیا جائے اور اس سلسلے میں مسلم لیگ کی تائید حاصل کی جائے۔

"ہوم رول" کی تحریک کا آغاز ایک یورپی خاتون مسزاینی بیسنٹ(۷۵) نے کیا۔ اس نے کانگرس اور مسلم لیگ دونوں کو یہ تجویز پیش کی کہ وہ ہندوستان کی کامل آزادی' سوراج یا ہوم رول کو اپنا مقصد وحید قرار دیں۔ مگر جب ابتدا میں اسے پوری کامیابی نہ ہوئی تو اس نے ۳ ستمبر ۱۹۱۶ء کو ہوم رول لیگ کے نام سے اپنی ایک الگ سیاسی جماعت تشکیل دی۔

نومبر ۱۹۱۶ء میں کانگرس اور مسلم لیگ کے نمائندے کلکتے میں جمع ہوئے اور انہوں نے ہوم رول کے پروگرام کو اپنانے کا فیصلہ کیا۔ تاہم مسلمانوں کے لیے "جداگانہ انتخابی طریق کار" پر ان کا اتفاق نہ ہو سکا۔

دسمبر کے آخری ہفتے میں کانگرس کے انتہا پسند اور اعتدال پسند گروہوں میں صلح ہو گئی۔ انتہا پسندوں کو دوبارہ کانگرس میں شامل کر لیا گیا۔ یہ انتہا پسندوں کی فتح تھی کیونکہ کانگرس نے انہی کے نقطۂ نظر کو آئندہ جدوجہد کے لیے اپنا لیا تھا۔ محمد علی جناح اس وقت مسلم لیگ کے صدر تھے۔ ان کی کوششوں سے مسلم لیگ نے بھی کانگرس کا پروگرام قبول کر لیا اور ہوم رول کو اپنا مطمح نظر قرار دیا۔

پنجاب اور یوپی کے بعض مسلم لیگی ارکان اس کے خلاف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی تہذیب و تمدن میں اس قدر بعد اور اختلافات ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ ابھی مدت مدید تک چلنے کے قابل نہیں ہو سکتے۔ لیکن مسلم لیگ اور کانگرس کی اکثریت مل جل کر ہوم رول کے حصول کے لیے کوشاں رہنے کا ارادہ کر چکی تھی۔

یہ ساری جنگ پر امن طریقے سے قانون کی حدود میں رہ کر لڑی جا رہی تھی مگر رفتہ رفتہ لوگوں کا لہجہ اس قدر جارحانہ ہوتا جا رہا تھا کہ حکومت برطانیہ کو ہندوستانیوں کے اطمینان کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا ضرور تھا ورنہ اس بات کا خطرہ تھا کہ بغاوت پھوٹ پڑے۔ نئی اصلاحات کے لیے ۱۹۱۷ء میں مانٹیگو (برطانوی سیکرٹری برائے ہند) ہندوستان آیا۔ وائسرائے سے گفتگو کے بعد اس نے کلکتہ، مدراس اور بمبئی کا دورہ کیا اور بہت سے سرکاری اور غیر سرکاری افراد سے ملا۔ کانگرس اور مسلم لیگ نے اسی سال کلکتے میں اپنے اجلاس منعقد کیے اور انگریزوں سے مطالبہ کیا کہ ان کا ہوم رول کا پروگرام قبول کر لیا جائے۔ کانگرس کے اجلاس کی صدارت مسز بیسنٹ نے کی۔ ۱۶ جون کو ہوم رول ڈے منایا گیا جس میں تقریر کرتے ہوئے مسز بیسنٹ نے کہا:

"The share of India in the empire was the giving of men and money. How could Indians be asked to fight for a liberty in which they would not share."(76)

اب ہندو اور مسلم دونوں ہندوستان کی آزادی یا ہوم رول کے حامی بن چکے تھے، اس لیے انگریزوں کے لیے ضروری تھا کہ ان سے کچھ ایسے وعدے وعید کیے جائیں جن سے سب لوگ یا کم از کم معتدل مزاج لوگ (جن کی تعداد زیادہ تصور کی جاتی تھی) مطمئن ہو جائیں۔ اس لیے ۱۹۱۷ء میں حکومت نے ایک اعلان کیا جو ۱۹۱۹ء کے گورنمنٹ ایکٹ کی طرف پہلا قدم تھا۔ لارڈ مونٹیگو (سیکرٹری آف سٹیٹ فار انڈیا) نے ۲۰ اگست کو ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں برطانیہ کی پالیسی کی وضاحت کے لیے مندرجہ ذیل چار اصول

مقرر کردیے

۱ انتظامیہ کی ہر شاخ میں ہندوستانیوں کی مزید شرکت۔

۲۔ خود مختار اداروں کا تدریجی ارتقا جس کا مقصد بالاخر یہ ہوگا کہ گورنمنٹ برطانیہ کے ماتحت ذمہ دار حکومت قائم کر دی جائے۔

۳۔ یہ پالیسی اسی صورت میں کامیاب ہو گی جب اس پر عمل رفتہ رفتہ اور مختلف درجوں میں کیا جائے گا۔

۴۔ اس بات کا فیصلہ حکومت ہند کرے گی کہ مختلف درجات کتنے وقت میں طے کیے جائیں گے اور لوگ ذمہ دار حکومت کے قابل ہوئے ہیں یا نہیں۔

ان تجاویز کا خاطر خواہ اثر نہ ہوا۔ مسلم لیگ اور کانگرس دونوں نے ان نکات کی شدید مخالفت کی اور یہ خیال ظاہر کیا کہ ان اصلاحات کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کو زیادہ سے زیادہ مدت تک کے لیے برطانیہ کے ماتحت رکھا جائے۔ لوگ یہ چاہتے تھے کہ ہندوستان کو جلد از جلد آزادی ملے یا کم از کم آزادی کے لیے کسی قطعی مدت کا تعین کر دیا جائے۔

نومبر ۱۹۱۷ء میں مانٹیگو ہندوستان آیا۔ یہاں اس نے بہت سے لوگوں سے ملاقاتیں کیں۔ وہ کانگرس، مسلم لیگ، سکھ اور اچھوت نمائندوں سے ملا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کی حقیقی ضرورتوں کا موقعے پر اندازہ کیا جائے۔ اپریل ۱۹۱۸ء میں وہ انگلستان واپس پہنچا اور ۸ جولائی کو اس کی رپورٹ شائع ہوئی۔ اس رپورٹ کو "مانٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ" کہا جاتا ہے۔ مانٹیگو نے اپنی دانست میں بڑی قابل قدر رپورٹ پیش کی تھی۔ اس نے تسلیم کیا کہ منٹو مارلے اصلاحات اب نئے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتیں۔ جنگ عالمگیر نے ہندوستانیوں کی توقعات کو بڑھا دیا ہے۔ چنانچہ اس رپورٹ میں ہندوستان کے صوبوں کے لیے کچھ اور اختیارات تجویز کیے گئے۔ حکومت کے محکموں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ایک حصے کو محفوظ (Reserved) اور دوسرے کو منتقل (Transferred) قرار دیا گیا۔ محفوظ محکموں میں عدالتیں، رسد کی فراہمی، انہار، پولیس اور جیل خانے تھے۔ یہ مکمل طور پر برطانوی حکومت کے ماتحت رکھے گئے۔ منتقل محکمے تعلیم، لوکل گورنمنٹ، حفظان صحت اور زراعت تھے جو ہندوستانی وزیروں کے سپرد کر دیے گئے۔ اس منقسم نظام کو دو عملی (Dyarchy) قرار دیا گیا۔ مرکز اور صوبوں کے درمیان پہلی دفعہ محکموں کی تقسیم کی گئی۔ مرکز کے پاس کسٹم، فوج، امور خارجہ اور ریاستوں کے معاملات رہے، جبکہ صوبوں کے پاس پولیس، عدالتیں، تعلیم اور امور عامہ آ گئے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ برطانیہ کی حکومت نے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ وحدانی حکومت کی بجائے وفاقی نظام ہندوستان کے لیے مفید رہے گا۔

دو ایوانوں پر مشتمل اسمبلی قائم کی گئی جس کے اختیارات محدود تھے جبکہ گورنر جنرل کے پاس تنسیخ کے اختیارات تھے۔

ہندوستان کے لوگوں کی توقعات اس سے بھی پوری نہ ہو سکیں۔ گورنمنٹ نے مزید برآں کچھ ایسے اقدامات کیے جنہوں نے لوگوں کو اور بھی مشتعل کر دیا۔ ان میں "رولٹ ایکٹ" کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ جنگ کے دوران ہندوستان کے بعض علاقوں میں انگریزوں کے خلاف دہشت پسندی کی وارداتیں ہوتی رہی تھیں اور گورنمنٹ کی اطلاعات یا قیاسات تھے کہ یہ وارداتیں جرمنی کے ایجنٹوں کی مدد سے ہو رہی ہیں اس لیے ان واقعات کی چھان بین کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا گیا۔ اس کمیشن کا سربراہ جسٹس رولٹ تھا جس کے نام پر یہ رپورٹ اور بعد میں ایکٹ بھی مشہور ہوا۔ اجلاس کلکتے میں منعقد ہوئے کمیشن نے جنوری ۱۹۱۸ع میں چھان بین شروع کی اور ۱۵ اپریل کو رپورٹ حکومت کے پاس بھیجی۔(۸۴) اس میں دہشت گردی کے تمام واقعات کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا تھا اور بتایا گیا تھا کہ یہ ایک منظم تحریک کا حصہ ہیں۔ رپورٹ کے مطابق یہ جرمنوں کی اکسائی ہوئی تحریک تھی جن کا خیال تھا کہ جنگ عظیم شروع ہوتے ہی ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف تشدد کے واقعات شروع ہو جائیں گے۔ چونکہ انگریز ہندوستان میں فوج نہیں رکھ سکیں گے اس لیے دہشت پسند عوام انگریزوں کو ملک سے باہر نکال دیں گے۔ آخر میں کمیشن نے ان بلووں کی روک تھام کے لیے تجاویز پیش کیں۔ ان کا اہم حصہ درج ذیل ہے:

We think, as we have already indicated, that the powers to be acquired should be of two grades capable of being called into operation separately, possibly under different forms of notification.

The first group of powers should be of the follwing nature:

(i) to demand security with or without sureties;

(ii) to restrict residence or to require nctification of change of residence;

(iii) to require abstention from certain acts, such as engaging in journalism, distributing leaflets or attending meetings.,

(iv) to require that the person should periodically report to the police.

The second group of powers should be:

(i) To arrest (ii) To search under Warrent.

(iii) To confine in a non penal cus tody.(78)

ان تجاویز کو بنیاد بنا کر حکومت نے اسمبلی میں دو بل پیش کئے جو رولٹ بل کے نام سے مشہور ہوئے۔ ہندوستان کے لوگ جنگ میں تعاون کے بعد زیادہ آزادی کے امیدوار تھے مگر ان بل نے پابندیوں کو اور بھی سخت بنا دیا۔ اس کا لازمی نتیجہ شدید احتجاج کی شکل میں ظاہر ہوا۔ ملک بھر میں جلسے منعقد ہوئے، جن میں گورنمنٹ کے اس اقدام کو بے وقت، جابرانہ، یک طرفہ، احمقانہ، متشددانہ، قاتلانہ اور خدا جانے کیا کیا کچھ قرار دیا گیا تھا۔ گاندھی اب تک انگریزوں سے تعاون کر رہے تھے۔ وہ کانگرس کے معتدل مزاج گروہ کے ساتھ تھے اور گوکھلے کے ہم نوا مگر اب انھوں نے بھی اعتدال کا رویہ ترک کر دیا اور ستیاگرہ کا آغاز کیا۔ انھوں نے کہا: "پہلے میں برطانیہ کی حکومت کے انصاف کا قائل تھا مگر رولٹ بل نے مجھے شدید دھچکا لگایا ہے۔ یہ بل لوگوں کی آزادیوں کو لوٹنے کے برابر ہے۔" ۲۴ فروری ۱۹۱۹ء کو گاندھی کے آشرم واقع احمد آباد میں ایک جلسہ ہوا جس میں فیصلہ کیا گیا کہ اگر رولٹ بل قانون بن گیا تو عدم تشدد کے ذریعے اسے ماننے سے انکار کر دیا جائے۔ ۳۰ مارچ کو گاندھی نے ہندوستان گیر ہڑتال کے لیے اپیل کی۔ دلی میں ہڑتال نے عدم تشدد کی بجائے تشدد کا روپ دھار لیا جس پر فوج کو گولی چلانی پڑی۔ اس سے آٹھ آدمی مر گئے۔ اس روز گاندھی نے دلی اور امرتسر جانے کا ارادہ کیا۔ حکومت نے انہیں گرفتار کر کے بمبئ بھیج دیا۔ اس پر ہندوستان کے بہت سے شہروں میں فسادات شروع ہو گئے۔ خصوصاً دلی، بمبئ، الہ آباد اور پنجاب کے مختلف علاقوں میں ان کا زور رہا۔ لوگوں نے سرکاری عمارتوں کو آگ لگا دی، بینک لوٹ لیے اور انگریزوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ ان میں سب سے زیادہ المناک واقعات امرتسر میں ہوئے جہاں ۹ اپریل کی صبح کو فسادات شروع ہوئے۔ انگریزوں کے ساتھ تشدد کے بعض معمولی واقعات پیش آئے لیکن انگریزوں نے اس کا خوفناک انتقام لیا۔

۱۳ اپریل کو جلیاں والا باغ امرتسر میں لوگ ایک جلسے کے لیے جمع ہوئے۔ جلسے میں بیشتر سامعین دیہاتی تھے اور بیساکھی کے میلے میں شرکت کرنے امرتسر آئے تھے۔ ان کا ہنگاموں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ لوگ آرام سے تقریریں سن رہے تھے کہ جنرل ڈائر نے انتباہ کیے بغیر لوگوں پر گولی چلانے کا حکم دے دیا۔ مشین گن سے ہجوم پر متواتر فائرنگ کی گئی یہاں تک کہ گولیاں ختم ہو گئیں۔ مجمع میں بھگدڑ مچ گئی۔ لوگ جان بچانے کے لیے بھاگے مگر باغ سے نکلنے کا ایک ہی راستہ تھا، اس لیے کئی افراد جو گولیوں سے بچ رہے تھے،

ہجوم میں کچلے گئے۔ سرکاری ذرائع کے مطابق چار سو آدمی مارے گئے جبکہ ایک ہزار سے زیادہ زخمی ہوئے اس واقعے کے بعد کئی ہفتوں تک لوگوں نے تشدد کے واقعات جاری رکھے۔ صوبے میں مارشل لاء لگا دیا گیا جو اس قدر سخت تھا کہ ذرا سی خلاف ورزی کرنے والوں کو گولی مار دی جاتی تھی۔ جنازے اور برات کے ساتھ جانے والوں کو پکڑ کر تازیانے لگائے جاتے تھے۔ لوگوں کو حکم تھا کہ کسی انگریز افسر کو دیکھیں تو رینگ کر چلیں۔ اس طرح کے بہت سے احکام جاری کیے گئے جن کا مقصد لوگوں کو ذلیل کرنا تھا۔

اس پر گاندھی نے اعلان کر دیا کہ لوگ ابھی عدم تشدد کے فلسفے پر عمل کرنے کے قابل نہیں ہوئے۔ مزید یہ کہہ کر میں نے عدم تشدد سے توقعات وابستہ کر کے ہمالیہ جتنی بڑی غلطی کا ارتکاب کیا ہے ستیاگرہ کو ختم کرنے کا اعلان کر دیا' چپ سادھ لی اور "ٹھہرو اور دیکھو" کی پالیسی پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ عدم تشدد پر مبنی ستیاگرہ کی یہ ناکامی لوگوں کے لیے بڑی حوصلہ شکن ثابت ہوئی۔ اکبر نے بھی اس سلسلے میں اپنے رد عمل کا اظہار متعدد اشعار میں کیا ہے:

ہوں مبارک حضور کو گاندھی
ایسے دشمن نصیب ہوں کس کو
کہ پٹیں خوب اور سر نہ اٹھائیں
اور کھسک جائیں جب کہو کھسکو

گاندھی سے ان کی مایوسی یہیں سے شروع ہوئی۔

دسمبر ۱۹۱۹ء میں کانگرس کا اجلاس امرتسر میں ہوا۔ تشدد آمیز واقعات کی وجہ سے گاندھی نے انگریزوں کے ساتھ کسی قدر تعاون کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ چنانچہ اس اجلاس میں اس نے لوگوں سے کہا کہ مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کو آزما لینے میں کوئی حرج نہیں۔ انہی دنوں اپنے اخبار Young India میں بھی اصلاحات کے بارے میں اس نے یوں اظہار خیال کیا تھا:

"Our duty is not to subject the reforms to carping criticism, but to settle down quietly to work so as to make them a success."(79)

لیکن جلد ہی گاندھی نے پھر حکومت کی مخالفت شروع کردی۔ اس نئی تبدیلی کے دو اسباب بیان کیے جاتے ہیں۔ والٹر وال بینک نے لکھا ہے:

"Why this Ghandian volte- face? The answer is easily found in what the Mahatama maintained were the broken pledges and insincerity of the British Government manifested in the "white washing" of the culprits of Amritsar and in another injustice imposed upon Indian Muslims, the Khilafat grievance(80)

امرتسر وغیرہ میں جو متشددانہ رویہ اختیار کیا گیا اس کے ذمہ دار برطانوی افسروں کے خلاف ہندوستان میں شدید احتجاج ہوا، جس سے مجبور ہو کر حکومت نے ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا جو "ہنٹر کمیشن" کے نام سے مشہور ہے۔ اس نے رپورٹ میں کہا جنرل ڈائر نے جو کچھ کیا وہ "غلط قسم کے احساس فرض" کا نتیجہ تھا۔ ڈائر کو نوکری سے الگ کر دیا گیا مگر ہاؤس آف لارڈز میں جب یہ مسئلہ پیش ہوا تو وہاں ڈائر کے حق میں بہت کچھ کہا گیا۔ اس کے علاوہ برطانوی اخبارات نے اس کی حمایت میں زبردست مہم کا آغاز کیا اور اس کے نقصانات کی تلافی کے لیے چندہ جمع کرنا شروع کیا۔ یہ امر ہندوستان کے لوگوں کی مزید ناراضی کا باعث بنا جس کی بنا پر گاندھی کو دوبارہ عدم تعاون کے متعلق سوچنا پڑا۔

تحریک خلافت کا آغاز بھی اسی دور میں ہوا۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران برطانیہ اور ترکی مخالف جنگی کیمپوں میں تھے۔ چونکہ ترکی کے سلطان کو ہندوستان کے مسلمان اسلامی دنیا کا خلیفہ سمجھتے تھے اور انگریزوں کی جنگ بہت حد تک ہندوستانی افواج کی مدد سے جاری تھی جن میں بڑی تعداد مسلمانوں کی تھی، اس لیے انہیں مطمئن کرنے کے لیے ۱۹۱۸ء میں برطانیہ کے وزیر اعظم لائڈ جارج نے اعلان کیا کہ ترکی کو نہ تو اس کے یورپی علاقوں سے محروم کیا جائے گا اور نہ ہی مسلمانوں کے مقدس مقامات کی بے حرمتی کی جائے گی مگر جنگ کے دوران نہ صرف یہ کہ مقدس مقامات کی حرمت کا خیال نہ رکھا گیا بلکہ جنگ کے بعد ترکی کو اس کے بہت بڑے علاقے سے محروم کرنے کی سازش کی گئی جس میں برطانیہ برابر کا شریک تھا۔ قسطنطنیہ پر اتحادی فوجوں نے قبضہ کر لیا۔ ۱۹۱۹ء کے موسم بہار میں یونانی افواج برطانیہ کی مدد سے سمرنا میں داخل ہو گئیں۔ مئی ۱۹۲۰ء میں عہد نامہ ساورے شائع ہوا جس کی رو سے ترکی کا کچھ علاقہ بین الاقوامی قبضے میں آ گیا۔ مصر میں اس کو تمام حقوق سے محروم کر دیا گیا۔ ٹریپولی، مراکو اور تیونس پر بھی اس کا کچھ حق نہ رہا۔ عرب، فلسطین، میسوپوٹیمیا اور شام کے علاقے بھی چھین لیے گئے۔ علاوہ ازیں یونان کا تھریس پر قبضہ تسلیم کر لیا گیا۔ سمرنا اور جنوب مغربی ایشیائے کوچک کا علاقہ یونان کے انتظام میں دے دیا گیا۔ اس سے ہندوستان کے مسلمانوں کے دل چھلنی ہو گئے۔ یہ بات انگریزوں کی سمجھ میں نہیں

آ سکتی تھی کہ ہندوستان کے لوگوں کو ترکی سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ وہ سمجھتے تھے کہ جس طرح یورپ کی عیسائی مملکتیں ایک دوسرے سے مذہبی بنیادوں کی بجائے سیاسی بنیادوں پر دوستیاں اور دشمنیاں رکھتی ہیں' یہی بات مختلف ملکوں کے مسلمانوں میں ہونی چاہیے- وہ عالمگیر اسلامی برادری کے تصور سے نا آشنا تھے- ایک انگریز عہد نامہ ساورے کے متعلق ہندوستان کے مسلمانوں کے اس ردعمل کے بارے میں حیرت کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے

"Such terms were regarded by Muslims, especially in India, as unnecessarily severe, and the cry of "Islam in danger" was raised. In vain did British Statesmen try to point out that the Britain had commitments to France, that the allied world supported the design of a Zionist National Home in palestine, and that a soft peace for Turkey, after the long History of Turkish misrule and atrocities- was out of question. Despite these arguments, Indian Muslims proceeded to organise their Khilafat movement to force the British government to amend the sevres Treaty on the side of leniency"(81)

اس کتاب کا مصنف جس ردعمل پر حیرت کا اظہار کرتا ہے' جس کو انگریز اس زمانے میں بھی سمجھ نہ پائے تھے اور جسے تاریخ سے ناواقف لوگ آج بھی سمجھ نہیں پاتے' وہ ردعمل درحقیقت اپنی جڑیں ہندوستان میں اور ہندوستان سے باہر اسلامی سلطنتوں کی کئی سو سالہ تاریخ میں پیوست رکھتا ہے- اس پس منظر کے بغیر خلافت کی تحریک اور اس کے ہندوستان گیر ابال کو سمجھنا ممکن نہیں-

مسلمانوں کا مزاج دوسرے تمام مذاہب کے پیروکاروں سے مختلف ہے- لوگوں کے اعتقادات نجی نہیں ہیں بلکہ اجتماعی حیثیت رکھتے ہیں اسلام کا مقصد ایک عالمگیر اسلامی معاشرے کا قیام ہے- اسلامی معاشرے کے مزاج کو ڈبلیو- سی- سمتھ نے ان الفاظ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے:

"It (Islam) has had a central conviction that the true Muslim life includes the carrying out in this world of the divine injunction as to how mankind individually and corporately, should live. It has

been characterised equally, therefore by an intense loyalty towards its own community. In its fullest, this conviction has risen to the vision of building the ideal society. Or if one looks at the same thing from another viewpoint, stressing Gods' initiative rather than human response, one may say, of seeing the ideal society built. Still more passively, one may say that the true Muslim lives in the ideal society; and to its corporate life has a cosmic loyalty. In essence Islamic History, therefore is the fulfillment, under divine guidance, of the purpose of human history. It is the kingdom of God on earth."(82)

پین اسلامزم

اسلامی دنیا کا یہی مزاج ہے جس کا اظہار تاریخ کے مختلف ادوار میں ہوتا رہا ہے۔ اسلامی ممالک آپس میں لڑتے جھگڑتے رہے ہیں اور اب بھی ان میں تنازعے موجود ہیں مگر حکمرانوں کی مصلحتوں سے قطع نظر ان ممالک کے مسلمان ہمیشہ ایک دوسرے کے خیر خواہ رہے ہیں۔ اگر افریقہ کے کسی اسلامی ملک پر مصیبت آتی ہے تو تکلیف انڈونیشیا میں محسوس کی جاتی ہے۔ اگر دنیائے عرب کا کوئی ملک شکست سے ہمکنار ہوتا ہے تو پاکستان میں اس پر دکھ کا اظہار کیا جاتا ہے ہندوستان میں تحریک خلافت کی بنیاد یہی چیز تھی مگر اس کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ ہندوستان کے مسلمان حکمران اور عوام صدیوں سے کسی بیرون ہند اسلامی مرکز پر موجود کسی حکمران کو اپنا اصلی حکمران اور دنیائے اسلام کا خلیفہ سمجھتے آ رہے تھے۔ اس کا مختصر تذکرہ بے موقع نہ ہو گا۔

ہندوستان میں اسلامی تاریخ محمد بن قاسم کی فتح سندھ سے شروع ہوتی ہے۔ مہمات سندھ کا آغاز ۷۱۱ع میں ہوا۔ اس فتح کے بعد سندھ اموی سلطنت کا حصہ بن گیا اور بعد میں عباسی سلطنت کا حصہ بنا۔ عباسی خلیفہ المعتمد نے ۸۷۱ع میں یعقوب بن لیث صفاری کو سندھ کی سلطنت کا فرمان عطا کیا۔ صفاریوں کے زوال کے بعد سندھ بہت سے عروج و زوال کے ادوار سے گزرا، لیکن خطبۂ جمعہ بدستور عباسیوں کے نام پر جاری رہا۔ اسلامی کامرانیوں کی دوسری بڑی لہر محمود غزنوی اور پھر محمد غوری کے ساتھ آئی۔ محمود غزنوی نے عباسی خلیفہ القادر سے فرمان سلطنت حاصل کیا، حالانکہ حقیقتاً محمود اس وقت عباسیوں سے زیادہ طاقتور تھا۔ مگر محمود اور بعد میں اس کے جانشین بھی خلیفہ کے نام سے حکومت کرتے

رہے۔ محمد غوری کے سکوں پر عباسی خلیفہ الناصر کا نام ملتا ہے۔ خاندان غلامان کے شہنشاہوں نے بھی یہ سلسلہ جاری رکھا۔ شمس الدین التمش کو عباسی خلیفہ المستنصرباللہ نے فرمان سلطنت جاری کیا اس کے سکوں پر اسے ناصر امیر المومنین ظاہر کیا جاتا تھا۔ سقوط بغداد اور عباسی خلافت کے خاتمے کے بعد بھی ناصر الدین محمود اور غیاث الدین بلبن کے سکوں پر برابر بادشاہوں کو ناصر امیر المومنین لکھا جاتا رہا۔ علاء الدین خلجی "یمین الخلافت" کہلاتا تھا۔ تغلق خاندان کے بادشاہوں میں محمد بن تغلق نے تو اس معاملے میں یہاں تک غلو کیا کہ عباسی خاندان کے جلا وطن وارث سلطنت المستکفی کا پتا چلایا جو مصر میں مقیم تھا۔ وہاں سفیر بھجوایا اور جب سفیر فرمان کے ساتھ ۱۳۴۳ء میں قاہرہ سے واپس آیا تو اس دن سے اس نے خود کو جائز حکمران سمجھنا شروع کیا۔ جمعے اور عیدین کے خطبات میں عباسی خلفا کے ورثاء کے نام داخل کیے۔ سکے سے اپنا نام بالکل نکلوا دیا اور اس کی جگہ عباسی ورثا کے اسما داخل کیے۔ فیروز شاہ تغلق نے بھی اس روایت سے سرمو انحراف نہ کیا۔ مرکز سے آزاد ہو کر صوبوں میں خود مختار ہونے والوں نے بھی ہمیشہ خطبات میں خلفاء کے ناموں کو شامل کرنا ضروری سمجھا۔ عزیز احمد لکھتے ہیں:

"On the basis of numismatic evidence one may assume that the name, or in its absence, the authority of Abbasid caliph, was accepted practically throughout the period of the pre- mughal rule in India as the source and sanction of the sultan's legal authority. The use of coinage must have familiarized the common Indian Muslim with the position and authority of the'universal' caliph; and it will therefore be not unreasonable to hazard a conjecture that when the name of a particular Abbasid Caliph appeared on the coinage, it was also read out in the Friday Sermon (khutba); when the name of a caliph long dead like Al-Mustasim, or no name but merely the title of the caliph, appeared on the coins then perhaps the prescribed passage in the Friday Sermons referring to the universal was read out with the name left blank. This was a practice which was also followed in some places in Muslim India after the abolition of Ottoman caliphate in 1924."(83)

مغلیہ حکومت کا رویہ خلافت کے متعلق مجموعی طور پر تو وہ نہیں تھا جو ان سے قبل

کی ہند اسلامی حکومتوں کا تھا تاہم بعض بادشاہوں نے انفرادای طور پر خلافت کا ازحد احترام کیا اور اپنے آپ کو دارالاسلام کے خلیفہ سے وابستہ رکھا- مثلاً بابر نے ماوراء النہر کی مہمات کے زمانے میں سیاسی ضرورتوں کی بنا پر شاہ اسمٰعیل صفوی کے نام کا سکہ مسکوک کرایا اور جمعے کے خطبے میں بھی اس کا نام شامل کیا- ہمایوں نے چونکہ طہماسپ صفوی کی مدد سے دوبارہ ہندوستان پر قبضہ کیا اس لیے اس نے بابر والی حیثیت کو برقرار رکھا- شیر شاہ سوری نے سلیمان حاکم ترکی کے پاس اپنا سفیر بھیجا اور یہ تجویز پیش کی کہ ہندوستان اور ترکی کی فوجیں بیک وقت حملہ کر کے ایران کو فتح کر لیں- (۸۴) مگر سفارت کی واپسی سے پہلے ہی شیر شاہ وفات پا گیا- سلیمان نے گجرات کے بادشاہ کی مدد کے لیے ایک بحری بیڑا روانہ کیا جسے پرتگالیوں نے شکست دی- اس بیڑے سے بچ نکلنے والے خشکی کے راستے ہمایوں کے پاس پہنچے' جہاں ان کو عزت سے رکھا گیا- ان میں سے ایک شخص علی رئیس نے دربار میں کہا کہ مسلمانوں کا خلیفہ سلیمان ہے اور بہت سی اسلامی حکومتیں خطبات میں سلیمان کا نام لیتی ہیں-(۸۵) اکبر کی تخت نشینی کے وقت بھی علی رئیس ہندوستان میں تھا' چنانچہ نوجوان بادشاہ اکبر نے اس کی معرفت سلیمان کو ایک خط بھیجا جس میں اسے دنیا میں خدا کا نائب (خلیفہ) قرار دیا گیا تھا- اگرچہ بعد میں اکبر اپنے آپ ہی کو بادشاہ اور خدا کا نائب (خلیفہ) تصور کرنے لگا مگر اکثر لوگوں کے نزدیک وہ لامذہب اور بدعتی تھا' اور کسی قابل ذکر مسلمان نے اس کا مذہب قبول نہ کیا- اس کے طویل دور میں چونکہ اس زمانے کی دیگر بڑی اسلامی حکوتوں یعنی صفویوں' عثمانیوں اور ازبکوں کے باہمی تعلقات تیزی سے بدلتے رہے اس لیے ان سے اکبر کے تعلقات بھی مختلف اوقات میں حالات کے ماتحت تبدیل ہوتے رہے' اگرچہ آخر میں وہ عثمانیوں کا شدید مخالف ہو گیا تھا- جہانگیر شروع شروع میں نورجہاں وغیرہ کے اثرات کی وجہ سے صفویوں کا حامی رہا لیکن جب عباس صفوی اول نے قندھار فتح کر لیا تو جہانگیر نے صفویوں کے خلاف تین سنی طاقتوں (عثمانی' ازبک' مغل) کے اتحاد کے لیے کوششیں شروع کر دیں- شاہجہان نے بھی یہی خارجہ پالیسی اختیار کی اور اسے زیادہ شدت سے جاری رکھا- چنانچہ مغلوں نے قندھار اور عثمانیوں نے بغداد صفویوں سے چھین لیے- مغلوں اور عثمانیوں کے تعلقات میں اضافہ ہوا اور شاہجہان نے عثمانی حکمران مراد چہارم کو مسلمان بادشاہوں کا خاقان قرار دیا- مزید ایک خط میں اسے خدا کا برگزیدہ بندہ' خلافت کے منصب کا اہل اور اسلامی سلطنتوں کو متحد رکھنے والا بتایا- اورنگ زیب کے تعلقات صفویوں اور ترکوں دونوں سے خنک رہے جس کی وجہ دونوں سلطنتوں کی اندرونی کمزوریوں کی بنا پر حالات میں تبدیلی تھی- تاہم شریف مکہ کو اورنگ زیب نے بہت سے

تحائف بھجوائے اور لوگوں میں بانٹنے کے لیے بہت سا روپیہ بھیجا۔ اورنگ زیب کے بعد تیزی سے روبہ زوال مغل شہنشاہوں نے بھی عثمانی ترکوں سے تعلقات قائم رکھے۔ ۱۷۱۷ء میں ایک مغل سفیر استنبول پہنچا۔ محمد شاہ نے عثمانی سلطان محمود کے پاس سفیر بھیجا اور نادر شاہ کے مقابلے میں باہم متحد ہو جانے کا مشورہ دیا۔ ۱۷۵۰ء میں بھی ایک مغلیہ سفیر عثمانی دربار میں پہنچا۔ اسی طرح دو عثمانی سفیر ۱۷۵۰ء اور ۱۷۹۹ء میں مغلیہ دربار میں آئے۔(۸۶) - یہ ساری تفصیل اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ ہندوستان کی اسلامی حکومتیں ایک مدت تک خلیفہ بغداد کو علامتی حکمران سمجھتی رہیں۔ بعد ازاں اگرچہ اکا دکا مثالیں ایرانی حکومت سے اتحاد کی بھی مل جاتی ہیں لیکن مجموعی طور پر انگریزوں کے قبضہ دلی تک حکومت کا رجحان عثمانی ترکوں کی طرف زیادہ رہا۔ یہ اثرات عوام کے ذہنوں میں رفتہ رفتہ کام کرتے رہے۔ سرزمین حجاز ترکوں کی سلطنت میں شامل تھی۔ یہ سرزمین مسلمانوں کے لیے مرکز اسلام ہے' اس لیے ترکوں کو خلافت کا وارث سمجھا جاتا رہا۔ ہندوستان کے لوگوں کی اکثریت ترکی کے حکمرانوں سے عقاید میں قریب اور صفویوں سے دور تھی اس لیے بھی وہ عثمانیوں کو خلیفہ سمجھتے تھے۔

انگریزوں کے ہندوستان پر ۱۸۵۸ء میں مکمل قبضے کے بعد بھی ہندوستان میں کچھ ایسی تحریکیں جاری رہیں جنھوں نے مسلمانوں کو مذہب کی طرف مائل کیے رکھا۔ اور عالم اسلام کے ساتھ ان کی وابستگی کو کم نہ ہونے دیا۔ انہوں نے ایسا ذہن تیار کیا جو تحریک خلافت کے فروغ کے لیے از حد مفید ثابت ہوا۔ اس ذہن کو تیار کرنے میں مندرجہ ذیل تحریکوں کا نمایاں حصہ ہے:

۱۔ شاہ ولی اللہ کی تحریک احیائے اسلام۔

۲۔ جمال الدین افغانی کی تحریک اخوت اسلامیہ۔

ہندوستان میں شاہ ولی اللہ (۱۷۰۳-۱۷۸۱ء) اور دنیائے عرب میں ابن عبدالوہاب (۱۷۰۳-۱۷۸۷ء) کی اصلاحی تحریکیں ایک ہی زمانے میں جاری رہیں۔ اگرچہ شاہ ولی اللہ پر ابن عبد الوہاب کے اثرات کے متعلق یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ دونوں تحریکوں میں ایک ہی روح جلوہ گر تھی اور ان کے مقاصد میں بہت کچھ ہم آہنگی تھی۔ یہ دونوں تحریکیں اٹھارویں صدی کے آغاز میں مسلم ممالک کے تیزی سے مائل بہ انحطاط معاشرے کی اصلاح کی خاطر شروع کی گئیں۔

شاہ ولی اللہ نے مسلمانوں کے اندرونی زوال کے اسباب دریافت کیے اور انہیں دور کرنے کی کوشش کی۔ اس کے علاوہ بیرونی عقائد کے خطرے سے اسلام کو بچانے کے لیے

جدوجہد کی۔ ان کا مقصد مسلمانوں کو قرون اولیٰ کی سادگی اور بلند کرداری کی طرف واپس لے جانا تھا۔ انہوں نے عرب کی وہابی تحریک کے مقابلے میں اعتدال کا مظاہرہ کیا اور اسلام کے فقہی سلسلوں کو رد کرنے کی بجائے انہیں قبول کرنے کے اصول وضع کیے شاہ ولی اللہ نے اپنی مشہور کتاب "حجتہ اللہ البالغہ" میں خلافت کے مسئلے پر بھی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اور خلیفہ کی خصوصیات قرآن اور حدیث کی روشنی میں تحریر کی ہیں۔(۸۷) چونکہ ہندوستان کے مسلمانوں میں اس کتاب کا بڑا چرچا رہا ہے اس لیے لازماً لوگ خلیفہ کی موجودگی کو مسلمانوں کے لیے ضروری سمجھنے لگے۔

شاہ ولی اللہ ہی کی تحریک سے تحریک مجاہدین کی شاخ پھوٹی۔ تحریک مجاہدین کے بانی سید احمد بریلوی، شاہ ولی اللہ کے فرزند اور جانشین شاہ عبدالعزیز کے شاگرد تھے۔ سید احمد بریلوی نے اپنی کتاب "صراط مستقیم" میں مسلمانوں کے زوال کے اسباب پر تفصیل سے اظہار رائے کیا ہے۔ سید احمد بریلوی کے شاگرد اور شاہ ولی اللہ کے پوتے شاہ اسمٰعیل شہید کی کتاب "تقویت الایمان" بھی اس سلسلے کی اہم کتاب ہے۔ ان دونوں مجاہدوں نے ہندوستان کے مسلمانوں میں رائج ہو جانے والے متعدد غیر اسلامی رواجوں کی مخالفت کی اور ان کے اخراج کی تعلیم دی۔ انہوں نے خاص طور پر ہندی مسلمانوں کو مندرجہ ذیل مشورے دیے:

۱۔ ہندی ایرانی اور رومن عناصر کا اخراج جو مسلمانوں کے عقائد میں غلط فہمی کی بنا پر داخل ہو گئے ہیں۔

۲۔ ان صوفیوں کی مخالفت جو شریعت کے قوانین کی پروا نہیں کرتے۔

۳۔ خدا اور رسول کے متعلق بے ادبی کی باتوں کی مخالفت۔

۴۔ اپنے مرشد سے بت پرستی کے انداز میں لگاؤ اور مزاروں کو سجدے کرنے کی ممانعت۔

۵۔ محرم کو ایک عوامی میلے کی طرح منانے کی مخالفت۔

۶۔ ہندو تہواروں میں شرکت، رشیوں کی خدمت اوران کے مقدس مقامات کی زیارت کی مکمل ممانعت۔

مسلمان ممالک کو دو اقسام میں تقسیم کیا گیا تھا: مدینۃ التامہ اور مدینۃ الناقصہ۔ اول الذکر قسم میں وہ اسلامی ممالک آتے ہیں جہاں مسلمانوں کی حکومتیں ہیں۔ ثانی الذکر وہ ہیں جن پر غیر مسلموں نے قبضہ کر رکھا ہے اور جو دارالحرب ہیں۔ ان کو غیر مسلموں کے قبضے سے چھڑانے کے لیے جہاد ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل(۹۰)

وسطی ہند کو چھوڑ کر سرحد میں آئے اور سکھوں کے خلاف مرحلہ اول کے طور پر جہاد شروع کی جس کا زور ان دونوں بزرگوں کی شہادت (۱۸۳۱ء) کے بعد ٹوٹ گیا۔ پھر بھی ۱۸۶۳ء تک یہ تحریک کسی نہ کسی شکل میں جاری رہی اور اس کے بعد اس نے دوسری شکلیں اختیار کیں، یہاں تک کہ ۸-۱۸۷۷ء کی افغانستان اور برطانیہ کے درمیان جنگ میں بھی اس تحریک کے مجاہد شریک ہوئے۔(۸۸)۔

دوسری بڑی تحریک جس نے تحریک خلافت کو تقویت پہنچائی، وہ سید جمال الدین افغانی (۱۸۳۸ء- ۱۸۹۸ء) کی پین اسلامسٹ تحریک تھی۔ جمال الدین افغانی پراثر اور مقناطیسی شخصیت کے مالک تھے۔ وہ انیسویں صدی میں دنیائے اسلام کی واحد شخصیت تھے جو کسی ایک ملک تک محدود ہونے کی بجائے بین الاقوامی اثرات پیدا کرنے والے تھے۔ وہ ہندوستان، ایران، افغانستان، ترکی، مصر، سوڈان غرض کسی بھی اسلامی ملک کے لیے اجنبی نہیں تھے۔ دنیائے اسلام کی تمام بڑی زبانوں سے واقفیت رکھتے تھے۔ فارسی ان کی مادری زبان تھی، عربی میں ان کی مہارت اہل زبان سے کسی طرح کم نہیں تھی۔ اردو اور ترکی بھی ان کے لیے اجنبی زبانیں نہ تھیں۔ اس لیے وہ پوری دنیائے اسلام سے براہ راست رابطہ پیدا کرنے کی اہلیت رکھتے تھے۔

جمال الدین افغانی کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ دنیائے اسلام کو زوال کے گڑھے سے نکال کر شاہراہ ترقی پر گامزن کیا جائے۔ اس وقت اسلامی دنیا نکبت و ادبار میں ڈوبی ہوئی تھی۔ سامراجی طاقتوں نے افریقہ کے اسلامی ملکوں پر قبضہ جما لیا تھا۔ ہندوستان کئی برس سے ان کے زیرنگیں تھا۔ مصر، سوڈان، ترکی، ایران اور افغانستان پر بھی ان کی حریصانہ نظریں گڑی ہوئی تھیں۔ ان سامراجی طاقتوں میں سب سے زیادہ قوت برطانیہ کی تھی اور زیادہ نقصان بھی اسی سے پہنچ رہا تھا اس لیے افغانی برطانیہ کے شدید مخالف تھے۔

افغانی کم از کم تین بار ہندوستان آئے۔ پہلی دفعہ ۱۸۵۵ء میں جب ان کی عمر سولہ یا سترہ برس تھی۔ ان کے سوانح نگاروں کا کہنا ہے کہ وہ ایک سال اور چند ماہ ہندوستان میں مقیم رہے مگر حال ہی میں لکھی جانے والی ایک کتاب کی مصنفہ اس کے متعلق یہ رائے رکھتی ہے:

"Although the standard biography says that Afghani stayed in India "a year and some months" there is no totally convincing account of where he spent the foll-owing seven years, and it may be that he spent more

time in India than he told his biographers. However long he stayed, there seems, judging from his later life and activity, an inescpable infrence that this Indian stay had a profound and traumatic effect on Afghani which his biographers have not noted. From the time of his first appearance in Afganistan in 1866 Afghani was a champion of Muslim struggle against British imperialist encrocnhments. and a violent critic of British rule over Muslims. Such Ideas scarcely could have obsessed him in northern Iran or in the shrine cities of Iraq, where British influence was hardly felt, but could have easily arisen from a stay in India in the period right before, and probably during the Indian mutiny of 1857."(89)

یہی مصنفہ آگے چل کر لکھتی ہے:

"Even before the mutiny, a state of chronic socio-religious revolt had existed among Muslims of Bengal and the Northwest Frontier. This Jehad movement was an offshoot of a move for muslim religious purification begun by the great eighteenth century reformer, Shah Wali Allah of Dehli. Although we do not know whether Afghani had any such contact with this reform movement or its jehad offshoot, his later advocacy of both religious reform and armed struggle against the British may show some such influence."(90)

غرض اس بات کے بڑے امکانات ہیں کہ شاہ ولی اللہ کی تحریک اور ۱۸۵۷ء کے واقعات کے اثرات افغانی پر پڑے ہوں گے۔

اس کے بعد بھی افغانی دو مرتبہ ہندوستان آئے۔ ایک مرتبہ ۱۸۶۹ء میں وہ بمبئی آئے۔ ان کے قیام کی مدت نا معلوم ہے۔ پھر ۱۸۷۹ع میں آئے اور زیادہ تر حیدر آباد دکن میں قیام کیا اور دو برس تک مقیم رہے اس زمانے میں انھوں نے "رد نیچریت" لکھی۔ سرسید احمد خاں اور ان کے بعض رفقا انگریزی حکومت کے زبردست حامی تھے جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ہندوستان میں مسلمانوں کے مفادات کو انگریزوں کی حمایت سے وابستہ سمجھتے

تھے۔ ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کی تباہی سے وہ اس قدر خوفزدہ ہوئے تھے کہ ان کے ذہنوں میں یہ خیال گھر کر گیا تھا کہ انگریزوں کی مخالفت مول لینا تباہی کو دعوت دینا ہے۔ اس لیے وہ سیاست، مذہب اور تمدن میں مسلمانوں کو انگریزوں کے قریب لا کر انگریزوں کو یہ احساس دلانا چاہتے تھے کہ مسلمان ان کے دشمن نہیں ہیں۔ حیدر آباد دکن میں سرسید کے بعض رفقا کا قیام رہا۔ مولوی چراغ علی اور مولوی سمیع اللہ ان میں خاص حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی وجہ سے حیدر آباد کے لوگوں میں سرسید کے خیالات پھیل رہے تھے جن میں بنیادی حیثیت ''انگریز دوستی'' کو حاصل تھی، جبکہ افغانی اسے مسلمانوں کے حق میں زہر قاتل سمجھتے تھے۔ اس لیے انہوں نے سخت لفظوں میں ان حضرات پر تنقید کی۔ جمال الدین افغانی کے نظریات نے حیدر آباد میں لوگوں کو بہت متاثر کیا۔ حیدر آباد سے نکل کر ان کے افکار ہندوستان بھر میں پھیل گئے اور بعض بہت اہم شخصیتیں ان سے متاثر ہوئیں جن میں اکبر الہ آبادی بھی شامل ہیں۔ جب ۱۸۸۴ء میں انہوں نے پیرس سے رسالہ ''العروہ الوثقیٰ'' جاری کیا تو یہ ہندوستان میں بہت مقبول ہوا۔ یہاں تک کہ برطانوی حکومت نے ہندوستان میں اس کے داخلے پر پابندی لگا دی۔ اس رسالے نے دنیائے اسلام کے سوچنے والے ذہنوں کو بہت متاثر کیا۔

غالباً اکبر الہ آبادی کی جمال الدین افغانی سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ البتہ انہوں نے ایک انگریز ولفرڈ سکاون بلنٹ کا ذکر اپنے خطوط میں کیا ہے جو افغانی کے دوست تھے۔ اکبر جب علی گڑھ میں ملازم تھے، انہی دنوں بلنٹ ہندوستان آیا تھا اور علی گڑھ میں اکبر نے اس سے ملاقات بھی کی تھی۔ بلنٹ سے اکبر بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے اس کی ایک کتاب ''فیوچر آف اسلام'' کا اردو میں ترجمہ بھی کیا۔

بلنٹ اور جمال الدین افغانی کا آپس میں گہرا تعلق رہا ہے۔ بلنٹ بھی ہندوستان میں انگریزوں کی پالیسی کا سخت مخالف تھا۔ بلنٹ کی کتاب Ideas about India میں ہندوستان کے متعلق انگریزی حکمت عملی کو سخت تشویش کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ ہندوستان میں سرسید کے نظریات کے بر خلاف کانگرس کی جدوجہد کی حمایت کی گئی ہے۔ اسی طرح اپنے روز ناچے (My Diaries) میں ہندوستان کے قیام کے دوران اس نے جو تاثرات لکھے ہیں ان میں بھی ہندوستان میں انگریزوں کے رائج کردہ نظام پر تنقید کی گئی ہے۔ ۱۸۸۴ء میں جمال الدین افغانی اور بلنٹ کی پہلی بار ملاقات ہوئی جس کے متعلق Nikki R Kiddie نے لکھا ہے:

"In 1884 and 1885 Afghani became involved in schemes of philo-Arab Englishman Wilfrid Blunt to try to negotiate with the British government a settlement of Egyptian question and of Sudanese Mahdi's rising. Perhaps sensing in Blunt's concern a means once more to move into high political circles..... when the conservatives threw Gladstone's government in 1885, partly on Sudanese issue, Blunt brought Afghani to England to meet his important governmental friends Randolph Churchill, now Secretary of State for India, and Sir Henery Drummand Wolff. Wolff was soon to go on a mission to Istambul to try to negotiate the withdrawal of British forces from Egypt on terms satisfactory to British government. Whereas Blunt failed to convince Gladstone to make use of Afghani's services, he almost convinced wolff to make Afghani along to Istambul, but wolff changed his mind at the last minute."(91)

جمال الدین افغانی اس بات چیت میں سلطان ترکی کی رضا مندی سے شریک تھے۔ گویا افغانی کے اس اقدام کا مقصد محض عالم اسلام کو سلطنت ترکی کے ذریعے مضبوط بنانا تھا۔ بلنٹ غالباً دنیائے اسلام کو انگریزوں کا زبردست حلیف بنانا چاہتا تھا۔ جب وہ ہندوستان آیا تو اس نے بہت سے بڑے بڑے شہروں میں مسلمانوں کے اجتماعات میں تقریریں کیں۔ اکبر نے بلنٹ سے ملاقات اسی لیے کی تھی کہ وہ انہیں دنیائے اسلام کا ہمدرد سمجھتے تھے۔ بلنٹ نے انہیں افغانی کے افکار کے اور بھی قریب کر دیا ہو گا۔ اکبر نے اگرچہ اپنی تحریروں میں کہیں جمال الدین افغانی کا ذکر نہیں کیا تاہم ان کے افکار پر افغانی کے واضح اثرات ہیں کیونکہ وہ پین اسلامسٹ اور برطانیہ کے شدید مخالف ہیں۔

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ہمیشہ دنیائے اسلام کے مسلمانوں کے دکھ سکھ کو اپنا دکھ سکھ سمجھتے رہے ہیں۔ پہلے شاہ ولی اللہ اور ان کے پیروکاروں اور بعد ازاں سید جمال الدین افغانی نے ان پر گہرا اثر کیا۔ چونکہ مسلمانان ہند اسلامی دنیا کے زوال پر بہت آزردہ تھے اور ان کی خواہش تھی کہ دنیائے اسلام ماضی کی طرح دوبارہ طاقتور ہو' اس لیے جب کبھی وہ سامراج کی سازشوں سے اسلامی ممالک کو خطرے میں پاتے تھے' اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ تحریک خلافت کے ہندوستان میں فروغ کے

نمایاں اسباب یہی ہیں۔

عہد نامہ ساورے مئی ۱۹۲۰ء میں ہوا جس کی شرائط قبل ازیں بیان کی گئی ہیں۔ ان کی رو سے بہت سا علاقہ ترکی سے چھین لیا گیا تھا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے نزدیک یہ عہدنامہ توہین آمیز تھا۔ اس کا شدید ردعمل ہوا' اگرچہ اس سے بھی پہلے خلافت کے حق میں تحریک شروع ہو چکی تھی۔ نومبر ۱۹۱۹ء میں دہلی کے مقام پر خلافت کانفرنس کا انعقاد ہوا تھا۔ مارچ ۱۹۲۰ء میں مسلمانوں کا ایک وفد عہد نامہ ساورے میں ترمیم کرانے کی غرض سے انگلستان گیا تھا۔ ۱۹ مارچ کو ہندوستان کے مسلمانوں نے ترکی کے مسلمانوں کے لیے روزے رکھے تھے مگر مئی میں اس عہد نامے کا نفاذ ہو جانے سے تمام مسلمان بھڑک اٹھے اور جگہ جگہ خلافت کمیٹی کے پرجوش جلسے منعقد ہونے لگے۔ گاندھی نے اس موقع کو آزادی کی تحریک کے لیے نہایت مناسب جانا اور ایسا رویہ اختیار کیا کہ خلافت تحریک کی رہنمائی بھی اسی کے ہاتھ میں آگئی۔ اس نے حکومت کو دھمکی دی کہ اگر ترکی کے ساتھ انصاف نہ کیا گیا تو ہندوستان کے گوشے گوشے میں عدم تعاون کی تحریک شروع کی جائے گی۔ اس نے وزیر اعظم لائڈ جارج کے نام ایک کھلے خط میں لکھا کہ ترکوں کے ساتھ بدسلوکی اور جلیاں والا باغ امرتسر کے حادثے کے مجرموں کی بریت نے حکومت برطانیہ کے متعلق میرے اعتماد کو بالکل متزلزل کر دیا ہے۔ علاوہ ازیں اس نے سرکار برطانیہ کو وہ تمام اعزازات بھی واپس کر دیے جو پہلی جنگ عظیم اور بوئروار کے سلسلے میں خدمات انجام دینے پر اسے ملے تھے۔

مولانا محمد علی اور شوکت علی نے گاندھی کے ساتھ ہندوستان بھر کا دورہ کیا اور تقاریر سے حکومت کے خلاف آگ لگا دی۔ ہر چھوٹے بڑے کی زبان پر یہ نغمہ گونجنے لگا:

"بولیں اماں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو"

ستمبر ۱۹۲۰ء میں کانگرس کا خصوصی اجلاس کلکتے میں ہوا۔ گاندھی نے اس میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "ہمیں خود مختاری چاہیے۔ خواہ یہ برطانیہ کی حکومت کے اندر ہو یا باہر۔" ایک سال کے اندر اندر گاندھی کے رویے میں اتنی تبدیلی کیوں آئی؟ ۱۹۱۹ء میں کانگرس کے اجلاس منعقدہ امرتسر میں گاندھی نے انگریزوں سے تعاون کرنے کا اعلان کیا تھا مگر اب تحریک چلانے کی دھمکیاں دی جا رہی تھیں۔ اس تبدیلی کے مقاصد پر ایک مصنف نے یوں روشنی ڈالی ہے:

Gandhi was not perhaps greatly motivated by an appreciation of any deep injustice to his muslim colleagues inflicted by the Sevres Treaty or even by the "condoning" of Amritsar, but rather by the fact that an unusual opportunity had been offered him of uniting all Indians-Muslim and Hindu- and thus of accelerating the pace toward national independence.(92)

ترک موالات

غرض گاندھی نے حکومت کے خلاف تحریک شروع کر دی جسے ترک موالات یا ستیاگرہ کی تحریک کہا جاتا ہے۔ گاندھی نے تمام لوگوں سے اپیل کی کہ وہ بدیشی مال بالخصوص کپڑے کا مقاطعہ کریں اور چرخے کا کاتا ہوا سوتی کپڑا استعمال کریں۔(۹۳)

عدم تعاون کی یہ تحریک ۱۹۲۱ء میں نقطۂ عروج پر پہنچی۔ اکبر بھی اس تحریک میں از حد دلچسپی رکھتے تھے جیسا کہ ان کے "گاندھی نامہ" اور بعض خطوط سے ظاہر ہوتا ہے۔ ہندوستان بھر میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی اکثریت اس میں شامل ہو گئی۔ ملک بھر میں بیرونی کپڑے کے بڑے بڑے ڈھیر جلائے گئے۔ غیر ملکی سامان اور شراب کی دکانوں پر پکٹنگ کی گئی۔ ایک مغربی مصنف جس نے بیرونی کپڑا جلانے کا ایک واقعہ خود دیکھا، لکھتا ہے :

The Mahatama lighted the heap of foreign clothing. The sight was extremely impressive; vast audience, the burning clothes, and the passionate speakers, under God's sky in the growing night."(94)

یہ تحریک گاندھی نے عدم تشدد کے اصول پر شروع کی تھی مگر رفتہ رفتہ تحریک میں تشدد کا رنگ جھلکنے لگا۔ ظاہر ہے کہ ہجوم زیادہ دیر تک غیر متشدد نہیں رہ سکتا۔ خصوصاً اس حالت میں جب کہ اسے اپنے خلاف طاقت کے استعمال کا خطرہ ہو یا طاقت واقعتا استعمال کی گئی ہو۔ چنانچہ یہ تحریک تشدد کے بہت سے واقعات پر منتج ہوئی۔

۱۹۲۰ء کے آخر میں ہزاروں مسلمان افغانستان کو ہجرت کر گئے، (۹۵) کیونکہ وہ اس ملک کو دارالحرب سمجھتے تھے۔ ان میں سے بہت سے راستے کی تکالیف برداشت نہ کر سکے۔ کچھ لوگ بدقت افغانستان وغیرہ پہنچے۔ وہاں ان کے ساتھ اچھا سلوک نہ کیا گیا۔(۹۶) ملیبار کے ساحل پر موپلے، تحریک خلافت سے متاثر ہو کر ہندو جاگیرداروں کے خلاف اٹھ کھڑے

ہوئے اور کئی ہندو قتل ہوئے۔ اس پر فوج نے بے تحاشا گولیاں چلائیں جس کے نتیجے میں کم از کم دو ہزار موپلے مارے گئے۔ اس واقعے کے بعد مسلم لیگ کے صدر نے عدم تشدد اور عدم تعاون کی اس تحریک سے لاتعلقی کا اعلان کر دیا اور اس کے بعد ہندو مسلم اتحاد کا خواب پھر کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

گاندھی نے اس کے باوجود یہ تحریک جاری رکھی مگر ۵ فروری ۱۹۲۲ع کو کانگرس کے رضاکاروں نے عدم تشدد کو بالائے طاق رکھ کر ضلع گورکھپور کے ایک تھانے چوری چورا پر حملہ کر دیا۔ عمارت کو آگ لگا دی جس میں اکیس سپاہی جل کر مر گئے۔ گاندھی نے یہ خبر سن کر عدم تشدد اور عدم تعاون کی تحریک کے خاتمے کا اعلان کر دیا اور کہا کہ لوگ ابھی اس قابل نہیں ہوئے کہ عدم تشدد پر عمل کر سکیں۔ اس کے علاوہ یہ کہا کہ حکومت کو ٹیکسوں کا ادا نہ کرنا کانگرس کے مفاد کے خلاف ہے اور جاگیرداروں کو یقین دلایا کہ کانگرس نجی املاک پر حملوں کی اجازت کسی صورت میں نہیں دے گی۔ اس کا بدیہی نتیجہ یہ نکلا کہ تحریک صعود سے نزول پر آگئی۔ ایک تاریخ دان لکھتا ہے:

"The middle class leaders of the nationalist movement (congress) including wealthy landowners and industrialists, were fearful of a genuine popular movement, that might become an attack on all property priviledge and power--- Indian as well as British. More and more in 1920's funds flowed from Indian capitalists into the coffers of congress. Apart from purely patriotic motives, the millionaires could hardly be blamed for trying to hurry the day when their own national government would adjust Indian tarrifs to suit their interests."(97)

یہی وہ موقع ہے کہ جب گاندھی کے بہت سے رفقا اور مداحین ان سے دل برداشتہ ہو گئے۔ خود پنڈت نہرو نے ان کے اس رویے سے اختلاف کیا۔ نہرو لکھتے ہیں:

Suddenly, early in February 1922, the whole scene shifted, and we in prison learned to our amazement and consternation, that Gandhiji had stopped the aggressive aspects of our struggle....at a time when we seemed to be consolidating our position and advancing on all fronts.(99)

خلافت تحریک بھی جلد ختم ہو گئی۔ ۱۹۲۲ء میں ترکی میں شہنشاہیت ختم کر دی گئی مگر سلطان محمد ششم کو خلیفہ کے طور پر برقرار رکھا گیا۔ ۱۹۲۳ء میں مصطفیٰ کمال نے ترکی کو جمہوریہ قرار دے دیا اور خلافت کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے نتیجے میں ہندوستان کی تحریک خلافت کو بھی زوال آ گیا۔ اکبر نے عدم تشدد کی تحریک کا عروج دیکھا مگر خاتمہ نہ دیکھا۔ اسی طرح وہ تحریک خلافت کا زوال دیکھنے کو بھی زندہ نہ رہے مگر اس کا ابال انہوں نے ضرور دیکھا تھا۔ اگر وہ بعد میں زندہ رہتے تو ممکن ہے اس کے زوال کے اثرات پر بھی بہت کچھ لکھتے۔

یہ حالات تھے جو اکبر کا ذہن تیار کرنے میں معاون ہوئے۔ اکبر مزاجاً تاریخ اور سیاست سے دلچسپی رکھتے تھے۔ قوموں کے عروج و زوال اور ان کے اسباب پر انہوں نے غور کیا تھا۔ تاریخ سے انہیں بڑی دلچسپی تھی اور یہ لفظ ان کے کلام میں بہت جگہ استعمال ہوا ہے۔ ان کے مزاج کی دوسری خصوصیت صوفیانہ رنگ تھی۔ ان وہبی خصائص کی بنا پر انہوں نے اپنے دور سے بھی اسی قسم کے رجحانات چنے۔

ان کا دور عالم اسلامی کے ہمہ جہتی زوال کا دور تھا۔ مغربی ممالک دنیائے اسلام پر قبضہ کرتے جاتے تھے اور اس قبضے کے لیے ہر جائز اور ناجائز حربہ استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے۔ ہندوستان میں بالخصوص انہوں نے بے حد لوٹ مار کی اور لوگوں کو ذہنی طور پر احساس کمتری میں مبتلا کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ اکبر اپنی بصیرت کی بنا پر تاریخ اور سیاست کے تیزی سے بدلتے ہوئے واقعات سے صحیح نتائج اخذ کرتے چلے گئے۔ انہیں یقین تھا کہ ہندوستان کے لوگوں بالخصوص مسلمانوں نے اگر سنبھلنے اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی کوشش نہ کی تو انگریز انہیں ملیامیٹ کر دیں گے۔ وہ تاریخی واقعات کو رونما ہوتا دیکھ رہے تھے۔ انگریزوں کی طاقت اور حکمت عملی کا انہیں پورا اندازہ تھا لیکن وہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کو زوال کے گڑھے سے نکالنے کے لیے جو لائحہ عمل سرسید نے اختیار کیا ہے وہ نامناسب ہے کیونکہ اس طرح مسلمانوں کو عارضی فائدہ تو پہنچے گا مگر بالآخر نقصان ہو گا۔ ان کے ذہن بدل جائیں گے، اور اپنے برے بھلے کا فرق معلوم نہ ہو سکے گا۔ اکبر انگریزوں کی ہر کوشش کو، خواہ وہ بظاہر کتنی بھی اچھی نظر آتی ہو، ان کی بنیادی حکمت عملی یعنی ذہنی تسخیر ہی کا ذریعہ تصور کرتے تھے۔ کونسلیں بنانا، اصلاحات کرنا، بحث مباحثے میں لوگوں کو الجھانا۔ یہ تمام باتیں انہیں اپنی منزل سے بھٹکانے کے لیے تھیں، یہی سبب ہے کہ انہیں انگریز سے کسی بھلائی کی توقع نہ تھی۔ گزشتہ واقعات ان کی اس رائے کے موید تھے اور ان کی روشنی میں حالیہ واقعات قوم کے لیے ضرر رساں۔

ہندوستان کے مسلماں ہمیشہ سے عالم اسلام سے وابستگی اور لگاؤ رکھتے تھے۔ شاہ ولی اللہ ہوں یا جمال الدین افغانی' وہ اسی لیے لوگوں کو پسند آتے تھے کہ وہ عالم اسلامی کی بات کرتے تھے۔ اکبر بھی پوری اسلامی دنیا کے حالات کو ایک ہی زنجیر کی کڑیاں سمجھتے تھے۔ بلقان ہو یا ترکی' ہندوستان ہو یا مصر غرض ان کے نزدیک جب کسی اسلامی ملک پر مصیبت آتی تو اس کا سبب مغربی سامراج ہوتا تھا۔ اس کے برخلاف سرسید احمد خاں وغیرہ ہندوستان کو دوسرے اسلامی ممالک سے الگ کر کے دیکھتے تھے' یعنی اسلامی اخوت کے تصور کو قبول نہیں کر رہے تھے۔ اسی سبب سے ہندوستان کی سیاست میں بھی دونوں کے نظریات مختلف تھے۔ سرسید کے نزدیک کانگرس سے تعاون کرنا مسلمانوں کے لیے نقصان دہ تھا۔ اکبر کا خیال تھا کہ انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں کا اتحاد ضروری ہے۔ جمال الدین افغانی کا بھی یہی خیال تھا مگر سرسید کی وفات کے بعد حالات نے جو رخ اختیار کیا اس سے اکبر بھی اس نتیجے پر پہنچے کہ ہندوؤں سے مسلمانوں کا اتحاد عملاً ناممکن ہے۔ اکبر گاندھی کی عدم تشدد کی پالیسی کو بھی ناپسند کرتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ دنیا کمزور کو پیس ڈالتی ہے جبکہ زور والے سے دبتی ہے۔ اس لیے غلام ملک کو عدم تشدد سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اگر کچھ مل سکتا ہے تو قوت مدافعت پیدا کر کے' مگر دقت تو یہ تھی کہ زور مندی کا کوئی امکان بھی نظر نہیں آتا تھا۔ غرض یہ پس منظر دنیائے اسلام کے لیے بہت تاریک تھا۔ انگریزوں کا ہمہ جہتی غلبہ' ہندوستانیوں کی بے تدبیریاں--- سیاسی اکھاڑ پچھاڑ' گولیاں اور لاٹھیاں' ہڑتالیں اور جلسے' اس دور میں ایک ختم نہ ہونے والی جدوجہد کا نقطۂ آغاز معلوم ہوتے تھے۔ ان حالات میں کسی بھی حساس شخص کے ہاں امید و رجا کی بجائے زیادہ سے زیادہ تمنا پیدا ہو سکتی تھی اور وہ بھی اچھے لمحوں میں' ورنہ عام طور پر تو مایوسی ہی مستولی رہتی تھی۔

حواشی

۱- ۱۸۰۳ء میں مرہٹوں کے خلاف جنرل لیک کی فاتحانہ یلغار کے بعد دلی مکمل طور پر انگریزوں کے تسلط میں آچکی تھی اور بادشاہ انگریزوں کا پنشن خوار تھا۔

2- The Cambridge History of India (Vol. V) by H.H Dodwell p.4

۳- سکندر لودھی کا عہد سلطنت ۱۴۸۸ء سے ۱۵۱۷ء تک رہا۔

4- The Cambridge History of India Vol. V Page 6.

5- Ibid, p. 4.

6- Ibid, page 7.

7- Ibid, p. 3.

8- Ibid, page 18.

9- Portugese in India by Danvers, Vol. I, page 508

۱۰- زین الدین عبدالعزیز معبری (زندہ- ۱۵۸۵ء) نے عربی زبان میں ایک تاریخ بعنوان "تحفتہ المجاہدین" لکھی ہے جس میں پرتگالیوں کے مالا باری مسلمانوں پر مظالم کا ذکر ہے۔

11- A History of India, Vol II : p Spear. p 63.

12- Firangee S. Pers, Farangi, Ar Alfrang. Firangi i.e. a Frank. This term for a European is very old in Asia, but when now employed by natives in India, is either applied (esp. in the South) Specifically to Indian born Protuguese, or when when used more generally for European, implies Something of hostility or disparagement (Hobson- Jobson- P 352)

۱۳- گلڈر ایک ڈچ سکے کا نام ہے۔

14- The Cambridge History of India, Vol, Page 58.

15- The Governor and Company of Merchants of London Trading into the East Indies.

بعد میں ناموں کی کئی تبدیلیوں کے بعد یہ "ایسٹ انڈیا کمپنی" کے نام سے موسوم و مشہور ہوئی۔

۱۶- ظاہر ہے کہ اس کی تجدید ڈھائی سو سال تک جاری رہی تا آنکہ ۱۸۵۸ء میں حکومت برطانیہ نے کمپنی سے تمام اختیارات براہ راست اپنے قبضے میں لے لیے۔

17- History of the Freedom Movement in India, by Tara Chand. Vol. I, p.221.

۱۸- شاہ عالم ثانی (شاہزادہ عالی گوہر) عالمگیر ثانی کا بیٹا تھا جو عماد الملک کی سازشوں کی وجہ

سے ۱۷۵۹ء میں دلی سے فرار ہو گیا تھا۔ اس نے نواب شجاع الدولہ اور میر قاسم کے ساتھ مل کر انگریزوں سے جنگ (بکسر) کی اور شکست کھائی۔ ۱۷۶۰ء میں عالمگیر ثانی کے قتل پر بہار میں بادشاہ بنا اور ۱۷۷۲ء میں مرہٹوں کی حفاظت میں الہ آباد سے دلی واپس آیا۔ وہ برائے نام بادشاہ تھا۔ مرہٹے سیاہ و سفید کے مالک تھے۔

۱۹۔ پہلی ۱۷۶۷ء سے ۱۷۶۹ء تک اور دوسری ۱۷۸۰ء تا ۱۷۸۴ء۔

۲۰۔ ۱۷۹۰ء تا ۱۷۹۲ء۔

۲۱۔ ۱۷۹۹ء۔

۲۲۔ White man,s Burden. یہ کپلنگ کی ایک نظم کا عنوان ہے جو اس نے ۱۸۹۹ء میں لکھی تھی جب امریکہ نے فلپائین پر قبضہ کیا۔ اکبر نے اس کے جواب میں کہا ہے:

بار احساں جسے کہتے ہیں وہ ہے کوہ جفا
کاش نادم ہوں یہ احسان جتانے والے

۲۳۔ East is East and West is West and never the twain shall meet. یہ سطر کپلنگ کی ایک نظم بعنوان The Ballad of East and West سے لی گئی ہے جو ۱۸۸۹ء میں لکھی گئی۔

۲۴۔ امتحان مذہبی کتابوں میں لیا جاتا تھا اور طالب علموں میں سے جو لڑکے کم عمر ہوتے تھے ان سے پوچھا جاتا تھا کہ تمہارا خدا کون ہے؟ اور وہ عیسائی مذہب کے موافق جواب دیتے تھے۔ اس پر ان کو انعام ملتا تھا" (اسباب بغاوت ہند' از سرسید احمد خان)۔

۲۵۔ مقالات سرسید' جلد نہم' مرتبہ محمد اسمٰعیل پانی پتی' ص ۶۳۔

۲۶۔ ایضاً' ص ۶۴۔

۲۷۔ کمپنی کی حکومت' باری' ص ۳۶۳۔

28- History of Freedom Movement in India, Vol. II, P. 51,

۲۹۔ کمپنی کی حکومت' صفحہ ۳۹۶۔

۳۰۔ ایضاً صفحہ ۳۹۷۔

۳۱۔ ایضاً' ص ۳۹۷۔

۳۲۔ ایضاً' ص ۳۹۸۔

۳۳۔ ایضاً' ص ۴۰۸۔

۳۴۔ ایضاً ص ۴۰۸۔

۳۵۔ خواجہ حسن نظامی کی کتابیں ان واقعات کو افسانوی انداز میں بیان کرتی ہیں۔ ان کہانیوں پر "حقیقت افسانے سے زیادہ تعجب خیز ہوتی ہے" کا اطلاق ہوتا ہے۔

۳۶۔ حیات جاوید' ص ۱۳۰۔

۳۷۔ ایضاً' ص ۱۴۲۔

۳۸۔ ایضاً' ص ۴۶۶۔ ۴۶۷۔

۳۹- حیات جاوید' ص ۳۱۲-

40- Macaulay's Minutes on Education in India, P. 115

41- A History of the Indian Nationalist movement: Sir Verney Lovett, P. 54.

42- Ibid P. 34.

43- A History of the Indian Nationalist Movement: Lovett P 35.

44- Quoted by Sir Verney Lovett.

45- A Short History of Indian and Pakistan : Waliibank P. 105.

۴۶- A Nation of Liars. - اکبر نے اپنے ایک مصرعے میں اس کا جواب یوں دیا ہے:

جھوٹے ہیں ہم تو آپ ہیں جھوٹوں کے بادشاہ

۴۷- یہ ترانہ چیٹرجی کے ناول "آنند مٹھ" میں ایک مسلمان دشمن کردار بھوانند کی زبان سے ادا کرایا گیا ہے (اردو ترجمہ آنند مٹھ- از ہیرا لال کوثر چاند پوری- امرتسر ۱۹۴۴ء)

48- Sedition Committee Report, 9118, Calcutta P. 2. 48- Ibid P. 13.

49- Ibid: p13

50- India today: Raleigh Parkin, P. 178.

51- India in Transition : C. F. Andrew, Page 91.

۵۲- گوپال کرشن گوکھلے ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوا- ایک مدت تک فرگوسن کالج پونا میں لیکچرار رہا- پھر سیاست میں حصہ لینے لگا-

53- As quoted by Sir Verney Lovett. P. 64.

۵۴- اس کی تفصیل ۱۹۱۸ء کی سیڈیشن کمیٹی رپورٹ میں موجود ہے-

۵۵- دہلی کسی زمانے میں پنجاب ہی کا حصہ تھا-

56- Sedition Committee Report, P. 180.

۵۷- مکتوبات سر سید' مرتبہ شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی' ص ۴۷۴- (بدرالدین طیب جی صدر کانگرس کے نام ایک خط سے اقتباس)-

۵۸- لائل محمڈنز آف انڈیا سرسید احمد خان بحوالہ حیات جاوید : حالی صفحہ ۱۵۵-

۵۹- مسافران لندن' سر سید احمد خان' ص ۱۸۳- ۱۸۴ (۱۹۶۰ء)-

۶۰- مسافران لندن' ص ۱۸۵- ۱۸۶-

۶۱- مسلمانوں کا روشن مستقبل' طفیل احمد منگلوری' ص ۳۳۳-

۶۲- مسلمانوں کا روشن مستقبل' ص ۳۳۵' ۳۳۶-

۶۳- مسلمانوں کا روشن مستقبل' ص ۳۴۶-

۶۴- مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص ۳۴۸، ۳۴۹-
۶۵- مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص ۳۶۹-
۶۶- بحوالہ مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص ۳۷۲- ۳۷۳-
۶۷- وقار حیات، ص ۶۹۹-
۶۸- "ہو گیا مانند آب ارزاں مسلماں کا لہو" (شمع و شاعر- بانگ درا)-
۶۹- مولانا شبلی کی نظم "ہم کشتگان معرکہ کانپور ہیں" مسلمانوں کے جذبات کو خوبصورتی سے پیش کرتی ہے-

70- A History of Indian Nationalist Movement, P. 91.

۷۱- اگرچہ بعض لوگوں نے Suitable کے لفظ کا مضحکہ اڑایا ہے لیکن ابھی تک کانگرس کے پلیٹ فارم سے بھی مکمل آزادی کا مطالبہ نہیں کیا گیا تھا- Suitable کا جو مفہوم لووٹ نے لکھا ہے اس کے مطابق اس کی مضحکہ خیزی ختم ہو جاتی ہے-
وہ لکھتے ہیں :

"The qualification self government of a kind suited to
India, appears to mean self government in wich Muhammadans
will have a share proportioned to what they consider
to be their political rather than their numerical
importance (p: 93)

یاد رہے کانگرس کے صدر سنہا نے ۱۹۱۵ء میں کہا تھا :

At present India was not fit for self government
Ibid (p: 100)

72- India : V, Chirol,p. 160.

73- A Short History of India and Pakistan, p. 124.

74- A Short Histoty of India and Pakistan p. 125.

۷۵- اینی بیسنٹ ایک انگریز پادری کی بیوی تھی لیکن جب وبا میں اس کا خاوند اور بچے مر گئے تو مذہب پر سے اس کا اعتقاد اٹھ گیا اور اشتراکیت کی طرف راغب ہو گئی- اس نے ایک روسی عورت مادام بلاوٹسکی سے علوم مخفیہ (Theosophy) میں تربیت حاصل کی- ۱۸۹۳ع میں ہندوستان آئی- (کانگرس کا بانی مسٹر ہیوم بھی علوم مخفیہ کے ماہرین میں سے تھا) بیسنٹ نے کانگرس میں شمولیت اختیار کر لی- بنتی ہندوانہ لباس پہننا شروع کیا اور ہندو کالج بنارس کے قیام میں نمایاں حصہ لیا-

76- A History of Indian Nationalist movement: p: 154.

۷۷- یہ رپورٹ بعد میں شائع بھی ہوئی- ۲۲۵ صفحات پر مشتمل ہے اور سیڈیشن رپورٹ کہلاتی ہے-

78- Sedition Committee Report, p.2

79- India without Fable: Kate Mitchell p. 160
80- A Short Histoty of India and Pakistan p. 153.
81- A Short History of India and Pakistan p. 155.
82- Islam in Modern History ; wilfred Cantwell Smith, p. 39.
83- Studies in Islamic Culture in the Indian environment: Aziz Ahmad, p.10.

۸۴- اس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے لوگوں کے لیے خشکی کی طرف سے حج کا راستہ کھل جائے جو سمندر کی طرف سے پرتگالیوں کی وجہ سے بند تھا۔

85- Studies in Aslamic Culture : p. 28.
86- Studies in Islamic Culture : p. 37.

۸۷- حجتہ اللہ البالغہ' جلد دوم' ص ۴۲۵ تا ۴۲۹۔

88- Studies in Islamic Culture, p. 216.
89- An Islamic response : Nikki R . Kiddie p. 11.
90- Ibid p. 12.
91- An Islamic respone,
92- A shart History of India and Pakistan, p. 156.

۹۳- جے کی بھی صدا آئے گی چرخے بھی چلیں گے
لیکن یہ سمجھ لیجئے صاحب نہ ٹلیں گے (اکبر)

94- Gertrude Emerson- Non violent non co- operation in India, p. 610.

۹۵- ہند سے آپ کو ہجرت ہو مبارک اکبر
ہم تو گنگا ہی پہ اب مار کے آسن بیٹھے

۹۶- تفصیل کے لیے علامہ حسین میر کاشمیری کا "سفر نامہ افغانستان" ملاحظہ کیجئے۔

97- A Short History, p. 159.
98- Nehru- Twards Freedom, p. 79.

باب سوم

اکبر کے افکار

اکبر کے اعتراضات

نشان شوکت و گاندھی کجا بود
کہ اکبر صرف کشف ماجرا بود
بجائے ملک لیکن مدعائش
خدا بود و خدا بود و خدا بود

یہ قطعہ اکبر نے ۱۹۲۰ء میں لکھا تھا۔ انہوں نے اس میں دعویٰ کیا ہے کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کے خلاف میں اس وقت سے مصروف سخن ہوں جب مسلمانوں یا ہندوؤں کے موجودہ لیڈروں کا کوئی نام بھی نہیں جانتا تھا لیکن مجھ میں اور ان میں فرق یہ ہے کہ وہ ملک کی آزادی کو اپنا مطمح نظر قرار دیتے ہیں جبکہ میں احکام خداوندی کو ہر شے کا آغاز و انجام سمجھتا ہوں۔

افسوس یہ ہے کہ بہت سے نقاد اکبر کے افکار کی بلندی، گہرائی اور وسعت سے آگاہ نہیں ہیں اور ان کو تنگ نظر، رجعت پسند، تضادات کا شکار، سطحی نگاہ رکھنے والا اور خدا جانے کیا کیا کچھ سمجھتے ہیں۔ اس سلسلے میں بعض نقادوں کی آرا پیش کی جاتی ہیں۔ اس سے اکبر پر ہونے والے تمام اعتراضات سامنے آ جائیں گے۔ اس کے بعد تفصیل سے بتایا جائے گا کہ ان کے ہاں حقیقتاً کیا کچھ موجود ہے اور کس کس چیز کے لیے وہ متہم کیے جاتے ہیں۔

رام بابو سکسینہ

"بعض جگہ وہ چوک گئے ہیں اور نشانہ خطا کر گئے ہیں۔ انہوں نے تناسب حالات اور مصالح وقت کا خیال نہ کر کے بسا اوقات مغربی تہذیب کے درخت کو

بیخ و بن سے اکھاڑنا چاہا ہے۔ وہ وقت کے ساتھ چلنا نہیں چاہتے تھے اور مغربی تعلیم کے مستقل اور دیرپا فوائد کے بھی قائل نہ تھے۔ شاید اسی وجہ سے، یعنی انتہائی قدامت پسندی کی وجہ سے، پوری پبلک ان کے ساتھ نہ تھی اور اس وجہ سے ان کی شہرت پر کسی قدر اثر پڑا۔ ہمارے نزدیک ان کا یہ خیال کہ مغربی تعلیم و تہذیب تمام تر بری اور ناقابل تقلید ہے صحیح نہ تھا۔ وقت کے سیلاب کو روکنا یا اس کے مخالف چلنا عقل کی بات نہیں ہے۔"(۱)

آل احمد سرور:

"دراصل وہ مصور تھے مفکر نہ تھے۔ اپنے زمانے کی تصویر کھینچ لیتے تھے، اپنے زمانے سے آگے انہیں دیکھنا نہ آتا تھا۔ احساس کی دولت سے مالا مال تھے، فکر کی روشنی کم تھی۔ حال کو ماضی کے معیار پر پرکھتے تھے اور مستقبل کے خیال سے ڈرتے تھے۔ خلوص تھا، نظر نہ تھی، جذبہ تھا۔ ملک و قوم سے محبت نہ تھی، اس کی ایک خاص حالت سے انس تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آخر میں انہیں شکست ہوئی۔ کچھ دنوں وہ اس کا مذاق اڑاتے رہے مگر حقائق کا مذاق اڑانے سے تو ان کا وار خود مذاق اڑانے والے پر پڑتا ہے۔"(۲)

"ان کے یہاں صرف روایت پرستی نہیں، رسم پرستی بھی ہے۔ وہ نل کے پانی، ترقی تعلیم، ٹائپ کے حروف، عورتوں کی تعلیم، سیاسی جدوجہد، سائنس، عقلیت اور فطرت پر تسخیر کا بھی مذاق اڑاتے ہیں۔ نئی تہذیب اپنے ساتھ جو برکتیں لائی، اکبر نے ان پر نظر نہیں کی۔ سرسید کی تحریک کے ذریعے جو تعلیمی و تہذیبی، علمی و ادبی قدریں ہمیں ملیں اکبر ان سے خوش نہیں تھے۔"(۳)

سید احتشام حسین:

"سرسید اپنی بہت سی کوتاہیوں کے باوجود ایک نئی دنیا کا خواب دیکھ رہے تھے لیکن اکبر اس ساری بیداری اور زندگی کو محض وقتی ہنگامہ آرائی سمجھتے تھے جو ان کے دور میں تاریخی وجوہ سے طوفانی شکل میں رونما ہوئی تھی.... مغرب سے آئی ہوئی ہر چیز کے مقابلے نے انہیں اور ان کے مقصد کو کمزور بنا دیا۔ وہ ٹائپ کے حروف اور پائپ کے پانی، ٹم ٹم اور بائیسکل، ریل اور انجن، ہر چیز کی شکایت پر اتر آئے اور گو انہوں نے ہندوستان کو مغرب کی کھوکھلی اور غلامانہ نقالی سے بچانے کے لیے مبالغانہ انداز میں بڑا کام کیا لیکن اس دھن میں انہوں نے مغربی

علوم اور سائنس کی مخالف کر کے ہندوستان پر معاشی ترقی اور نئے سیاسی شعور کے دروازے بند کرنے کی کوشش کی۔"(۴)

پنڈت کشن پرشاد کول:

"اکبر کی زندگی کا ماتم یہی ہے کہ وہ نئی روشنی کے نور و تجلی کو بھی ظلمت سے ہی تعبیر کیا کیے۔ انہیں موتیوں اور جواہروں کے انبار میں صرف سنگریزے ہی دکھائی دیے۔ آزادی کی پرواز میں انہیں بلندیاں نہیں دکھائی دیں' صرف پستیوں ہی میں پڑے رہے۔ نئے دور کی قدروں کو پہچاننے اور ان کے سمجھنے کی اگر ان میں صلاحیت ہوتی تو ان کے طنز کے نشتر بڑے کارگر ہوتے اور ان کا طنز و مزاح بھی پیام کی حیثیت رکھتا۔"(۵)

شیخ محمد اکرام:

"طنزیہ اور ظریفانہ شاعری میں اکبر بے بدل تھے لیکن بطور ایک تعمیری مفکر کے ان کا پایہ حالی اور اقبال سے بہت پست ہے۔ اکبر جزئیات اور وقتی مسائل کے مختلف پہلوؤں کو بڑی خوبی سے دیکھ لیتے تھے اور ان کے متعلق انہیں ایسی باتیں سوجھتیں جن کا خیال اقبال یا حالی کو نہ ہوتا تھا۔ لیکن اصولی باتوں اور انسانی زندگی یا قومی ضروریات کے اہم مسائل پر ان کی نظر اتنی گہری نہ تھی جتنی حالی یا اقبال کی۔ اس کے علاوہ شاید یہ بھی صحیح ہے کہ انہیں حالی کی سی راست بینی اور ہموار طبیعت میسر نہ تھی۔ نئی نسل کی تمام خامیاں تو انہیں پوری طرح نظر آ جاتی تھیں لیکن پرانی نسل کے نقائص پر ان کی توجہ نہ تھی اور وہ یہ نہیں سمجھتے تھے کہ قومی تمدن کے جس دور نے واجد علی شاہ' جان صاحب' میر جعفر اور غلام قادر روہیلہ پیدا کیے ہوئے ہوں' اس کے اخلاقی نظام میں اصلاح کی ضرور گنجائش ہے۔"(۶)

خلیل الرحمٰن اعظمی:

"اکبر کی شاعری بھی یہی ساٹھ سال سے زائد والی شاعری ہے۔(۷) ان کے یہاں سنجیدہ ذہانت یا طنز کی اعلیٰ مثال ڈھونڈے سے بھی نہیں مل سکتی۔"(۸)

ڈاکٹر محمد صادق:

"To him the past was sacred and above criticism, and this spirit of reverence was not only confined to religion, it spread to everything savouring of the past; to poetry,

literature, dress, education; in short to every secular thing that had come down from the old world."(9)

اکبر کے خلاف لکھی جانے والی تنقید میں سے یہ چند نمایاں مثالیں ہیں۔ ان کی رو سے اکبر ماضی کے اندھے مقلد، مغرب کے بے بصر نقاد، سائنس اور جدید ترقیات کے دشمن، مغرب کی لائی ہوئی برکات کے مخالف، گہرے شعور سے عاری، ہندوستان کی ترقی پذیر قوتوں کے نکتہ چیں اور زمانے کی رو کے خلاف چلنے والے تھے۔ یہ الزامات بڑے سنگین ہیں۔ ان میں سے بعض باتیں تو صریحاً غلط الزام تراشی کی ذیل میں آتی ہیں اور بعض نیم صداقتوں کے ضمن میں شمار کی جا سکتی ہیں اور یہ کون نہیں جانتا کہ نیم صداقت دروغ سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ آئندہ صفحات میں ہماری یہ کوشش ہو گی کہ افکار اکبر کا اس انداز سے جائزہ لیا جائے کہ ایک تو اس کا خاکہ سامنے آ جائے، دوسرے ان اعتراضات کی حقیقت واضح ہو جائے۔

اکبر بنیادی طور شاعر ہیں، اگرچہ انہوں نے کچھ نثر بھی لکھی ہے۔ مفکر شاعروں کے خیالات کے متعلق لوگوں کو اکثر غلط فہمیاں ہو جایا کرتی ہیں کیونکہ شاعری میں افکار کو منطقی زبان کے بجائے شاعرانہ زبان میں ادا کرنا پڑتا ہے۔ اور شاعرانہ زبان، تشبیہ، استعارہ، علامت، امیجری اور جذبے کی زبان ہوتی ہے۔ اس میں منطقی نثر کے وسائل کو کام میں لایا جائے تو وہ اس قدر بے کیف ہو جائے کہ اسے کوئی پڑھنا بھی گوارا نہ کرے۔ شاعرانہ زبان میں جب افکار کا اظہار کیا جاتا ہے تو سرسری نظر سے دیکھنے والے استعارہ، علامت اور امیج کو حقیقی مفہوم سمجھ کر قبول کرنا چاہتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ مفکر شاعروں کے ہاں تضادات نظر آنے لگتے ہیں، حالانکہ ان کے ہاں اتنے تضادات ہونے ضروری نہیں۔ اقبال اسی چیز کا شکار ہوئے اور اکبر کو اقبال سے بھی زیادہ اعتراضات کا ہدف بننا پڑا۔ اقبال کے ہاں خیالات سنجیدہ زبان میں بیان کیے گئے ہیں۔ اکبر مزاحیہ شاعر ہیں، اس لیے لامحالہ ان کے بارے میں غلط فہمیاں بھی زیادہ ہی ہونی چاہیں۔ اکبر پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے افکار کے لیے نثر کو وسیلہ اظہار کیوں نہ بنایا۔ کچھ ایسی ہی بات پروفیسر آربری نے اقبال کے بارے میں لکھی ہے:

Iqbal was a poet as well as a philosopher, and he preferred to express his philosophy in poetry rather than in prose; which is presumably the main reason why he is still so comparatively unknown and misappre-

ciated in the West."(10)

اکبر اتنا خوش قسمت نہیں جتنا کہ اقبال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قریب قریب وہی باتیں کئی برس پہلے کہہ دینے کے باوجود اس کے متعلق اقبال کی نسبت بہت زیادہ غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ مگر اس کی وجہ کیا ہے کہ اقبال اور اکبر دونوں نے اظہار کے لیے اصناف شعری کو نثر پر ترجیح دی؟ ایک وجہ تو یہ ہے کہ مشرق کے لوگوں کا مزاج جذباتی اور تخیلی زیادہ ہے اور منطقی و استدلالی بہت کم۔ اس لیے قدرتاً انہیں جذبے اور تخیل کی زبان زیادہ متاثر کرتی ہے۔ عرب' ایران اور ہندوستان وغیرہ میں شاعر کا حلقہ اثر نثر نگاروں سے زیادہ وسیع ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں اکبر کی ایک اور مجبوری بھی تھی جس نے انہیں شاعری کو ذریعہ اظہار بنانے پر مائل کیا۔ وہ تھی انیسویں صدی کے نصف آخر میں انگریزوں کی دہشت اور ہیبت جو ہر دل پر قبضہ جمائے ہوئے تھی۔ ہندوستان کے محاذ سیاست پر ایک گھمبیر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس خاموشی میں کئی برس تک کانگرس کے چند ارکان کی صدا کسی وسیع صحرا میں تنکے کے گرنے سے زیادہ شور نہ اٹھا سکی تھی۔ ہندوستان میں سیاسی ہنگاموں کا آغاز بیسویں صدی کے شروع میں ہوا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد چالیس سال تک کسی نے انگریزی حکومت کی مخالفت کی بھی تو دھیمے اور مودبانہ لہجے میں اور کانگرس پر قبضہ رہا تو اعتدال پسندوں کا۔ ان حالات میں اکبر کے لیے بھی ممکن نہ تھا کہ وہ انگریزوں کو للکارتے۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ سرکاری ملازم تھے۔ چنانچہ وہ یا تو علامتوں کے ذریعے یا مزاحیہ انداز میں تنقید کا حق ادا کرتے رہے۔

سرد تھا موسم ہوائیں چل رہی تھیں برف بار
شاہد معنی نے اوڑھا ہے ظرافت کا لحاف (11)

لیکن شاعری اور خصوصاً اسلوب نے ان کے افکار کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں پیدا کر دیں۔ اس باب میں ہمارا مقصد یہ ہے کہ ظرافت کا لحاف اور علامتوں کا پردہ ہٹا کر شاہد معنی کا جلوہ سب کو دکھا دیا جائے۔

انگریزی غلبہ

افکار اکبر کے بنیادی طور پر دو حصے ہیں' پہلا حصہ منفی ہے اور دوسرا حصہ مثبت۔ منفی اشعار وہ ہیں جن میں انہوں نے تیزی سے رائج ہوتے ہوئے بعض رجحانات کو ہدف بنایا ہے اور مثبت حصہ وہ ہے جہاں انہوں نے بعض مٹتی ہوئی اقدار کے احیا کی کوشش کی ہے۔ اس لیے یہ کہنا غلط ہے کہ ان کے ہاں صرف تخریب کا جذبہ ہے تعمیر کا نہیں۔ البتہ

وہ تعمیر سے پہلے تخریب کے قائل ہیں اور بیشتر لوگ اسی کے قائل رہے ہیں۔ مولانا روم نے بھی تو کہا تھا:

ہر بنائے کہنہ کا بادان کنند
اول آن بنیاد را ویران کنند (۱۲)

اکبر پہلے تخریب کے قائل ہیں تو اس وجہ سے کہ ان کے دور میں بہت سے مخرب رجحانات پیدا ہو گئے تھے جن پر پورا وار کرنے سے پہلے کسی مثبت فکر کی تبلیغ موثر نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ مخرب رجحانات تھے کورانہ انداز میں مغربی تہذیب و تمدن کی پیروی کرنا' مغرب کی ہر بات کو برتر سمجھنا اور مشرق کی ہر چیز کو ادنیٰ اور پست قرار دینا۔ مغربی سائنس اور فلسفے کی ہر چیز کو حرف آخر تسلیم کرنا اور مذہب کو اس کے تابع بنانا۔ جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے ذہنوں کو مغرب نے اس حد تک تسخیر کر لیا تھا کہ وہ مغرب کی ہر چال کو اپنے مفاد میں تصور کرتے تھے۔ سیاسی غلامی سے بڑھ کر ذہنی غلامی کا آغاز ہو چکا تھا اور جب ذہنی غلامی قبول کر لی جاتی ہے تو پھر نجات کی کوئی امید باقی نہیں رہتی۔ اکبر کا عہد مغرب سے ہمہ جہتی مرعوبیت کا دور تھا۔(۱۳)عبدالماجد دریابادی اپنے رنگ میں اس دور کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں:

"اکبر کی شاعری کے کمال عروج و شہرت کا زمانہ بیسویں صدی کی دوسری دہائی ہے لیکن ان کی اصلاحی شاعری کی بنیاد انیسویں صدی کی آخری چوتھائی میں پڑ چکی تھی..... ہندوستان خصوصاً مسلمانان ہندوستان میں عین یہی زمانہ مغربی تمدن' مغربی معاشرت' مغربی علوم' غرض مغربیت کے ہر شعبے کے انتہائی عروج' مقبولیت و فروغ کا ہے....

مغرب کی اس زیرک و زمانہ شناس اور اقبال مندی کے لحاظ سے پرشباب قوم انگریز نے تیرو تبر' توپ و تفنگ سے کہیں زیادہ بے پناہ حربہ پروپیگنڈا کا استعمال کرنا شروع کر دیا اور اپنے ایجنٹوں' گماشتوں' کارندوں کو اسکول اور کالج کے مادی قالب میں بنا کھڑا کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر دل پر برطانیہ کی عظمت کا نقش' ہر زبان پر اقبال سرکار کا کلمہ۔ دادخواہی کے لیے گھر سے نکلئے تو قانون انگریزی' کتابیں انگریزی' عدالتیں انگریزی' لڑکوں کو پڑھنے بٹھائیے تو اسکول انگریزی' کالج انگریزی' کتابیں انگریزی' زبان انگریزی' سفر کے لیے باہر نکلئے تو سڑکیں انگریزی' سواری (ریل) انگریزی' ٹکٹ انگریزی' سفر کی منزلیں (اسٹیشن)

انگریزی، دکھ درد میں مبتلا ہو جایئے تو علاج کے لیے دوائیں انگریزی، تشخیص انگریزی، شفا خانے انگریزی، مرہم پٹی انگریزی، خط بھیجئے، پارسل منگایئے تو ڈاک انگریزی، ڈاک خانہ انگریزی، روپیہ جمع کرنے، بہی کھاتہ کھولنے کا شوق ہو تو بینک انگریزی، سیونگ بکس انگریزی، ورزش کھیل کے لیے دل للچائے تو کھیل انگریزی، فٹ بال، کرکٹ، ٹینس اور انٹا۔ شام کو سیر و تفریح کے لیے قدم اٹھایئے تو سامان تفریح انگریزی، پارک میں، لان میں، کلب میں، ہوٹل اور ریستوران میں رات کو رنگ رلیاں منانے کو جی چاہے تو تماشے انگریزی، تھیٹر کنسرٹ، آپیرا، ماضی کو جاننا چاہیے تو تاریخیں انگریزی، حال سے باخبر رہیے تو اخبارات انگریزی، تاربرقیاں انگریزی، پیشے انگریزی، بیرسٹری، وکالت، ڈاکٹری، انجینئری، عہدے انگریزی، علوم انگریزی، فنون انگریزی، صنائع انگریزی[۱۴] خلاصہ یہ ہے کہ زمین انگریزی، آسمان انگریزی۔

اب قوم تھی اور اس کے سر پر جادوئے فرنگ۔ ہر طرف سحر سامری کا دور دورہ، ہر سمت سے دجالی تہذیب کا حملہ۔ معیار کمال یہ ٹھہرا کہ انگریزی بولنا آ جائے، لب و لہجہ صاحب کا سا ہو جائے،[۱۵] ڈگریاں اور امتحانات سرکاری نصیب میں آجائیں، اپنی زبان بگاڑ کر بولی جائے.... اپنے ہاں کی ایک ایک چیز میں ذلت و حقارت نظر آنے لگی... اپنے ہاں کی شرم و حیا، حجاب و نقاب اس لیے قابل نفرت کہ میم صاحب کھلے بندوں دیکھتی دکھاتی پھرتی ہیں۔ جن و فرشتہ کا شمار اس لیے اوھام میں کہ مل اور اسپنسر ان کے قائل نہیں۔ عرش کا وجود اس لیے باطل کہ جغرافیے کی کتابوں میں اس کا ذکر نہیں۔ وحی، نبوت، توحید کے بنیادی مسائل اس لیے فرسودہ اور متروک کہ پادری صاحب اپنی گھڑی ہوئی مشرکانہ مسیحیت میں ان پر عقلی دلائل قائم نہ کر سکے۔ ڈاڑھی منڈانا اس لیے واجب کہ صاحب منڈاتے ہیں۔ سود جیسی حرام کمائی اس لیے جائز کہ صاحب کے دیس میں شہر شہر بینک کھلے ہوئے ہیں.... غرض عرش سے لے کر فرش تک، ذرے سے لے کر آفتاب تک، علم و عمل، معاشرت، اخلاق، عقائد کے دائرے میں کوئی شے ایسی نہ تھی جو صاحب کے نام کا کلمہ نہ پڑھ رہی ہو۔ ساری فضا اسی مرعوبیت سے معمور تھی۔ دانش فرنگ، حکمت مغرب، عقلائے فرنگ، اقبال سرکار، دانایان مغرب وغیرہ خدا جانے کتنے فقرے دور مرعوبیت کی یادگار علوم

متعارفہ کی طرح بے تکلف زبانوں پر چڑھ گئے اور ہماری زبان و ادب کا گویا جز ہو گئے....''(۱۶)

اس کے باوجود بہت سے لوگ سمجھتے تھے اور اب بھی سمجھتے ہیں کہ اگر ہندوستان برطانیہ کے ماتحت نہ آتا تو ہم تعلیمی، صنعتی، انتظامی اور تہذیبی اعتبار سے پس ماندہ ہوتے۔ جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے ذہنوں میں خدا جانے یہ تصور کیوں جاگزیں ہو گیا ہے کہ برطانوی حکومت نے ہندوستان میں نہ صرف امن و امان پیدا کیا بلکہ یہاں کے لوگوں کی خوش حالی کے لیے جدید ذرائع آمد و رفت اور رسل و رسائل پیدا کیے۔ عدالت اور پولیس کا نظام رائج کر کے سابقہ لاقانونیت کو ختم کیا۔ جدید سائنسی علوم کی تعلیم لوگوں کو دی۔ نہروں اور ریلوں کا جال بچھا دیا۔ جس سے پیداوار میں اضافہ اور نقل و حمل میں سہولتیں پیدا ہوئیں وغیرہم۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ برطانوی حکومت نے نسل'' بعد نسل یہ باتیں نصابی کتابوں کے ذریعے لوگوں کے ذہنوں میں راسخ کر دی تھیں۔(۱۷) یہ پروپیگنڈا ہمیں اس بری طرح سے متاثر کر گیا کہ ہم انگریزوں سے قبل کی حکومتوں کو بدانتظام، وحشی اور ظالم سمجھنے لگے۔ لیکن حقائق کیا ہیں؟ اس سے بیشتر لوگ بے خبر معلوم ہوتے ہیں۔ اکبر جب برطانوی حکومت کے ظلم و جور، لوٹ کھسوٹ اور سازشوں سے متعلق حقائق کی نقاب کشائی کرتے ہیں تو لوگ انہیں نفسیاتی کوتاہیوں کا شاخسانہ قرار دینے لگتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ خیالات اکبر کے احساس کمتری کی پیداوار ہیں یا نقادوں کے احساس کمتری نے برطانیہ کی لائی ہوئی ہر چیز کو تقدس کا درجہ بخش دیا ہے؟

استحصال

انگریزوں کی داخل نصاب کتابوں سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو بہت سے اعلیٰ پائے کے مورخین، ماہرین اقتصادیات، متخصصین قانون اور فاضلین تعلیم کی کتابوں میں تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان کے انتظامی معاملات بہتر بنانے کے پردے میں کیا کیا گل کھلائے؟ پہلے چند لوگوں کی عمومی آرا ملاحظہ کیجئے۔ اس کے بعد حکومت کے چند انتظامی شعبوں کا جائزہ لیا جائے گا۔ ان کے متعلق ماہرین کی آرا پیش کی جائیں گی اور ان کے ساتھ اکبر کے نظریات کا تقابل کیا جائے گا۔

ڈبلیو۔ ایس۔ بلنٹ نے ہندوستان کے بے شمار اضلاع میں گھوم پھر کر برطانوی حکومت کے ہندوستان کے باشندوں پر مرتب ہونے والے اثرات کا اس طرح جائزہ لیا ہے:

"I am disappointed," I wrote from Simla in April, 1879

"with India, which seems to me just as ill governed as the rest (of Asia), only with good intentions instead of bad ones, or none at all. There is just the same heavy taxation, Government by foreign officials, and waste of money one sees in Turkey. only let us hope the officials are fools instead of knaves."(18)

اسی مصنف نے اپنے روزنامچے میں ایک جگہ ونسٹن چرچل سے ملاقات کے تاثرات ذیل کے الفاظ میں تحریر کیے ہیں:

Winston sympathises much with my ideas about the native question in India, and in general about the enslavement of the coloured by the white- races. But he says he is an imperialist, and his Chief interest is in the condition and the welfare of the poor in England, who, he says, are far worse off than the poor in any part of the East.(19)

ذاتی گفتگو میں انسان بسا اوقات ایسے اعتراف کر لیتا ہے جو تحریروں اور تقریروں میں نہیں کرتا۔ انگلستان کے مقتدر ترین فرد کا یہ اعتراف محض ذاتی نہیں۔ ہندوستان میں پوری برطانوی پالیسی کا آئینہ دار ہے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ یہ ہمارے ہی ملک کے سرمائے کا وسیع پیمانے پر اخراج تھا جس نے ایسے حالات پیدا کیے۔ کارل مارکس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے متعلق یہ رائے دی تھی:

The misery inflicted by the British on Hindostan is of an essentially different and more intensive kind than all Hindostan had to suffer before... This is no distinctive feature of British colonial rule,(20) but only an imitation of Dutch, and so much so that in order to characterise the working of the British East India Company, it is Sufficient to repeat what Sir Stanford Raffles, the English Governor of Java, said of old Dutch East India Company; "The Dutch Company, actuated solely by the spirit of gain, and viewing their subjects, with less regard of consideration than a West India planter formerly viewed a gang on his estate, because the later had paid the purchase money of human property,

which the other had not, employed all the existing machinery of despotism to squeeze from the pepole their utmost mite of contribution, the last dregs of their labour, and thus aggravated the evils of a capricious and semi-barbarous government, by working it with all the practised ingenuity, of of politicians, and all the monopolising selfishness of traders."(21)

رامیش دت نے ہندوستان میں برطانوی حکومت کے ثمرات کا جائزہ ذیل کے الفاظ میں پیش کیا ہے:

"شاہنشاہی ہند کے متعلق تاریخ یہی فیصلہ کرے گی کہ عصر جدید کے ادارات میں وہ سب سے زیادہ عظیم الشان ادارہ ہے، لیکن آنے والے مورخین کو یہ دل خراش قصہ دہرانا پڑے گا کہ اس شہنشاہی نے ہندوستان میں امن تو قائم کیا لیکن وہ اہل ہند کو خوش حال نہ بنا سکی... یہ کہ صنعت و حرفت کا نام و نشان تک باقی نہ رکھا- یہ کہ کاشتکار ایسے سنگین اور تغیر پذیر محصول سے پس گئے جنہیں ادا کرنے کے بعد آمدنی میں سے پس انداز کرنے کے لیے کچھ نہیں بچتا تھا- یہ کہ محاصل کا بیشتر حصہ ایک طفل گم شدہ کی طرح انگلستان چلا جاتا تھا اور یہ کہ تباہ کن مسلسل قحط سے لکھوکھا نفوس کا صفایا ہو گیا تھا-"(۲۲)

برطانوی حکومت کے ثمرات و برکات کا ذکر سنتے سنتے لوگ اس قدر متاثر ہو گئے ہیں کہ برطانوی حکومت کے قبل کے تمام حکمرانوں کو غیر مہذب، ظالم اور مستحصل خیال کرنے لگے ہیں- حالانکہ صورت حال اس کے برعکس ہے- اگر صرف مغلیہ دور کے ہندوستان کا مقابلہ انگریزوں کے ہندوستان سے کیا جائے تو بالکل متضاد حقائق سامنے آتے ہیں جس سے برطانوی حکومت کے اس پروپیگنڈے کی قلعی کھل جاتی ہے کہ انہوں نے ہندوستان کو خوش حال اور پر امن ملک بنا دیا- حقیقت یہ ہے کہ انگریزوں کی حکومت سے قبل ہندوستان کا اقتصادی ڈھانچہ بیک وقت زرعی اور صنعتی تھا- ملک کے بیشتر باشندوں کی معیشت کا انحصار بے شک زراعت پر تھا مگر بڑے شہروں میں کارخانے بھی قائم تھے، جن میں ضروریات زندگی کی مختلف اشیا بنائی جاتی تھیں- ہر گاؤں یا قصبہ اپنے باشندوں کی ضروریات کے لیے خود کفیل وحدت کی حیثیت رکھتا تھا- کھانے پینے اور پہننے کی تمام ضروریات کاشتکاری سے پوری ہو جاتی تھیں اور حکومت کو لگان ادا کرنے کے بعد بھی اتنا کچھ بچ رہتا تھا کہ لوگ اطمینان کی زندگی گزار سکیں- شہروں میں مزدور بھی تھے اور ادنیٰ و متوسط درجے کے تاجر

بھی- مزدوری اشیا کے نرخوں کے مقابلے میں خاصی معقول تھی- ضروریات زندگی کے نرخ ارزاں تھے- شہنشاہ اکبر کے زمانے میں گندم روپے کی نوے سیر، چاول اسی سیر، باجرہ ایک سو اسی سیر، گھی پندرہ سیر اور چینی اٹھائیس سیر تھی- شاہ عالم ثانی کے انتہائی زوال آمدہ دور میں اگرچہ یہ چیزیں پہلے سے زیادہ گراں ہو گئی تھیں، پھر بھی گندم روپے کی ستر سیر تھی- چاول ایک سو بیس سیر(۲۳)، گھی تین سیر اور چینی چھ سیر تھی- معمولی نوکر اور مزدور کی تنخواہ کم ازکم تین یا چار روپے ماہوار ہوتی تھی- اس لیے وہ بخوبی گذر اوقات کر سکتا تھا(۲۴)- دربار سے وابستہ ملازمین اور افواج سے متعلقہ افراد کی تنخواہیں چار سے دس روپے ماہوار تک تھیں- اس سے ان کی فارغ البالی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے- زمینوں پر چونکہ لگان فصلوں کے پکنے کے وقت اور حقیقی پیداوار کے مطابق لگایا جاتا تھا، اس لیے کاشتکار مطمئن اور قرضوں کے عذاب سے محفوظ تھے- ان کی خوش حالی کی جھلکیاں بعض سیاحوں کے سفرناموں میں محفوظ ہیں- سترھویں صدی کا ایک سیاح Tavernier لکھتا ہے:

> It is not necessary that those who travel in India should provide themselves with food before-hand. Especially is this the case with the idolators who do not eat anything which has had life because even in the smallest villages rice, flour, butter, milk, beans and other vegetables, sugar, and other sweet ,meats, dry and liquid, can be procured in abundance.(25)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان حکومتوں میں اشیائے صرف کی افراط تھی- انگریزوں کے دور میں ہندوستان کے متعلق کسی سیاح کا یہ تاثر نہیں ہو سکتا تھا-

ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں مختلف صنعتیں ترقی پذیر تھیں- علاوہ ازیں گھریلو صنعتیں تھیں جو لوگوں کی ضروریات کو سستے داموں پورا کرتی تھیں- بڑی صنعتوں میں کپڑا خاص طور پر اہم تھا- باری لکھتے ہیں:

> "ہندوستان پرانے زمانے میں صنعتی ملک تھا- اس زمانے میں زراعت اور صنعت ایک ساتھ ترقی پر تھیں- ہندوستان کی بہت سی قیمتی اشیاء دوسرے ملکوں میں فروخت ہوتی تھیں.... افغانوں اور مغلوں کے دور میں ہندوستان نے صنعت و حرفت میں بہت زیادہ ترقی کی- ابن بطوطہ اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے:
> صلیبی جنگوں کے زمانے سے ہندوستان کی تجارت وینس اور جنیوا کی راہ سے

یورپ کے ملکوں سے ہو رہی ہے۔ ہندوستان کے لوگ خوش حال ہیں۔ محمد تغلق نے دہلی میں سوتی کپڑے کا ایک کارخانہ قائم کیا جس میں پانچ ہزار کاریگر روزانہ کام کرتے تھے' مارکو پولو ہمیں بتاتا ہے کہ راس امید اور شنگھائی کی تمام درمیانی بندرگاہوں میں ہندوستان کا بنا ہوا کپڑا افراط سے فروخت ہوتا ہے... مہذب دنیا میں ڈھاکا اور مرشد آباد کی ململ کا استعمال عظمت اور برتری کا ثبوت تھا۔ یورپ کے ہر ملک میں ان دو شہروں کی ململ اور چکن بہت زیادہ مقبول تھی۔ ہندوستان کی دوسری صنعتوں کی نسبت پارچہ بافی کی صنعت کو کمال حاصل تھا۔ ہندوستان سے سوتی اور اونی کپڑے' شال' دوشالے' ململیں' چھینٹیں برآمد کی جاتی تھیں۔ ریشم' کمخواب اور زربفت کے لیے احمد آباد دنیا بھر میں مشہور تھا۔ اٹھارویں صدی میں انگلستان میں ان کپڑوں کی اتنی مانگ ہو گئی تھی کہ اسے بند کرنے کے لیے حکومت کو بھاری ٹیکس لگانے پڑے تھے۔ پارچہ بافی کے علاوہ لوہے کے کام میں بھی ہندوستان بہت ترقی کر چکا تھا۔ لوہے سے تیار شدہ اشیا ہندوستان سے باہر بھیجی جاتی تھیں۔ اورنگ زیب کے عہد میں ملتان میں جہازوں کے لیے لوہے کے لنگر ڈھالے جاتے تھے۔ جہاز سازی میں بنگال نے بہت ترقی کر لی تھی۔ انیسویں صدی کے آغاز تک ہندوستان صنعت و حرفت میں انگلستان سے بڑھا ہوا تھا۔ انگلستان کے لیے تجارتی اور جنگی جہاز ہندوستان میں تیار ہوتے تھے... ایک انگریز کے الفاظ میں "عام آدمی کو سمجھانا مشکل ہے کہ ہماری حکومت سے پہلے ہندوستانی زندگی کبھی پر لطف تھی۔ کاروباری اور باہمت لوگوں کے لیے بھی کبھی آسانیاں میسر تھیں۔ مجھے پورا پورا یقین ہے کہ انگریزوں کے آنے سے پہلے کاروباری ہندوستانی نہایت آرام کی زندگی بسر کرتے تھے۔"(۲۶)

انگریزوں نے رفتہ رفتہ ہندوستان کے تمام اقتصادی ڈھانچے کو درہم برہم کر دیا۔ ہندوستانی صنعتی مصنوعات کی برآمد پر بھاری ٹیکس لگائے۔ انگلستان کی نوساختہ صنعتوں کو تحفظ دیا اور اس بات کی زبردست کوششیں کیں کہ ہندوستان محض زرعی ملک ہو کر رہ جائے جہاں سے نہایت سستے داموں انگلستان کے کارخانوں کے لیے خام مواد دستیاب ہوتا رہا کرے۔ پھر زمینوں کا بندوبست بھی اس طریقے سے کیا کہ کاشتکار مقروض ہو کر رہ گئے۔ انگریزوں نے جب بنگال کی دیوانی سنبھالی' اس کے سات برس بعد ولیم بولٹن نے

برطانوی حکومت کے ہندوستان کی تجارت پر اثرات بیان کرتے ہوئے لکھا تھا :

"All branches of the interior Indian Commerce are, without exception, entirely monopolies of the more cruel and ruinous nature; and so totally corrupted from every species of abuse, so to be in the last stages towards annihilation."(27)

یہ سلسلہ دراصل جنگ پلاسی ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ مغلوں کے ایک فرمان کی رو سے ایسٹ انڈیا کمپنی کو محاصل ادا کیے بغیر تجارت کرنے کی اجازت مل گئی تھی۔ اندرونی تجارت مقامی تاجروں کے قبضے میں تھی اور اس پر کمپنی کا کوئی حق نہیں تھا۔ مگر سیاسی قوت کے حصول کے بعد انہوں نے رفتہ رفتہ اندرونی تجارت بھی پوری طرح اپنے قبضے میں لے لی۔ یہ تجارت نمک، چھالیا اور تمباکو کی تھی۔ اس تجارت کو پوری طرح قبضے میں کرنے کے لیے انگریزوں نے انتہائی بددیانتی اور ظلم و ستم سے کام لیا۔ کلائیو نے اپنی ذاتی کمپنی بنائی جس میں کچھ اور لوگ بھی شریک تھے۔ انہوں نے دوسروں کے لیے ان اشیا کی تجارت ممنوع قرار دے دی۔ بنگال کے زمینداروں کو کلکتے لے جا کر اس مضمون کے حلف نامے پر کرنے پر مجبور کیا گیا :

I do oblige myself and give this in writing that excepting the English Society of Merchants, I will on no account, trade with any other person, and without their order I will not dispose of a single grain of salt. If such a thing should be proved against me, I will pay to the Sarcar (Government) of the said society a penalty of five rupees for every maund(28)

نتیجہ یہ کہ صرف نمک کی اس تجارت سے ایک سال میں کلائیو اور اس کے ساتھیوں نے تقریباً ۲۴ لاکھ روپے خرچ کر کے اس پر ۲۳ لاکھ روپے مزید کمائے۔ (۲۹) یہی کیفیت دیگر اشیا کی تجارت کی تھی۔

بنگال میں کپڑا بننے کی صنعت عروج پر تھی اور کپڑے کے کاریگر بڑے خوش حال تھے۔ انگریز تاجر اپنے ملازموں اور گماشتوں کو دیہاتوں میں بھیج کر کپاس کی پیداوار کا جائزہ لیتے تھے اور پھر زبردستی اور من مانی قیمت پر یہ تمام کپڑا خرید لیتے تھے۔ بولٹن لکھتا ہے :

The assents of the parties concerned was taken for

granted, and if they refused the offer of part payment in advance, the money was tied in their girdles and they were sent away with flogging.(30)

اس کا نتیجہ نکلا کہ کاریگروں نے کپڑا بننا چھوڑ دیا۔ ہزاروں بافندے کمپنی کے احکام کے ڈر سے دور دراز کے علاقوں میں فرار ہو گئے۔ فرار ہونے والے بافندوں کو کمپنی نے جرمانہ، قید اور کوڑے مارنے کی سزائیں دیں۔ فرار نہ ہونے والے بافندے روزانہ ظلم و ستم کا شکار ہوتے تھے۔ ولیم بولٹس لکھتا ہے:

The winders of raw Sik, called Nagaads, have been treated also with such injustice, that instances have been known of cutting of their thumbs, to prevent their being forced to wind Silk.(31)

اسی طرح ملک کے بالائی حصے سے کپاس کی آمد پر بھاری محصول عائد کر دیا گیا تاکہ اجارہ داری بالکل محفوظ ہو جائے۔ برکس آدمز نے لکھا ہے:

Possibly since the world began, no investment has ever yielded the profit reaped from the Indian plunder, because for nearly fifty years great- Britain stood without a competitor.(32)

دلچسپ بات یہ ہے کہ کمپنی کے ملازمین اشیا کو خریدنے کے لیے جو روپیہ لگاتے تھے وہ ہندوستان کے لوگوں سے ٹیکسوں کے ذریعے اکٹھا کیا جاتا تھا اور اس روپے سے نفع کما کما کر مسلسل اور متواتر انگلستان بھیجا جاتا تھا۔ دادا بھائی ناروجی کے اندازے کے مطابق "ہندوستان سے ہر سال بیس کروڑ روپے کا مال انگلستان جاتا ہے جس کے بدلے ہندوستان کو کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔"(۳۳)

یہ تو برآمد کی کہانی تھی درآمدی تجارت کا بھی یہی رنگ تھا۔ ہاتھ سے بنے ہوئے کپڑے میں انگلستان ہندوستان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ مگر جب صنعتی انقلاب کے سبب انگلستان میں پاورلوم لگائے گئے اور انہوں نے زیادہ کپڑا بنانا شروع کیا اس وقت انگلستان کے کپڑے پر ہندوستان میں دو فی صد ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا جبکہ ہندوستان کے کپڑے پر انگلستان کی حکومت نے دس سے تیس فی صد تک ٹیکس لگائے ہوئے تھے۔ چنانچہ مقامی کپڑا درآمدی کپڑے کے مقابلے میں مہنگا پڑتا تھا۔ اس پالیسی کی وجہ سے بافندوں نے مجبوراً اپنا آبائی پیشہ ترک کر دیا۔ ڈھاکا، مرشد آباد اور سورت کے شہروں کی آبادی بہت کم رہ گئی۔

لوگ زراعت کی طرف مائل ہوئے۔ انگلستان کے کارخانہ دار اور حکومت چاہتی بھی یہی تھی کہ ہندوستان محض خام مال کی منڈی بن جائے' اس لیے زراعت کی حوصلہ افزائی کی گئی اور اس میں بھی کیش کروپس(۳۴) کی طرف لوگوں کو مائل کیا گیا۔ چنانچہ غلے کی بجائے زیادہ سے زیادہ رقبہ کپاس کی کاشت کے لیے وقف رہنے لگا۔ حتیٰ کہ ہندوستان مکمل طور پر زرعی ملک ہو کر رہ گیا۔ رام گوپال نے لکھا ہے:

> In the current century one often heard the assertion that India was an agricultural country and that its backwardness was due to her peoples' inherent inferiority to those of Europe. The fact is that India was transformed from an agricultural-cummanufacturing country into a purely agricultural country by Britains, Industrial magnates.(35)

استحصال کے لیے صرف درآمدی اور برآمدی تجارت ہی کافی نہیں سمجھی گئی۔ اس کے لیے اور بھی بہت سے راستے نکالے گئے۔ جن کی وجہ سے ہندوستان اور بھی قلاش ہوا۔

انگریزوں نے اپنی حکومت کی توسیع اور لوٹ کھسوٹ کے لیے جو جنگیں لڑیں' ان میں صرف ہونے والا روپیہ ہندوستان کے خزانے سے حاصل کیا گیا حالانکہ ہندوستان کے لوگوں کا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ جب ہندوستان کی حکومت "کمپنی" سے تاج برطانیہ کو منتقل ہوئی تو اس کے ساتھ ہی سات کروڑ پاؤنڈ کی ذمہ داریاں بھی منتقل ہوئیں۔ مگر یہ ذمہ داریاں ہندوستان کے خزانے سے پوری کی گئیں۔ حکومتیں تعمیراتی منصوبوں کے لیے قرضے لیا کرتی ہیں مگر یہ قرضہ توسیع سلطنت کی غرض سے جنگیں لڑنے کے لیے لیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں ایل۔ ایچ۔ جنکز نے ذیل کے انکشافات کیے ہیں:

> The burdens that it was found convenient to charge to India seem preposterous. The cost of The mutiny, the price of the transfer of the comany's rights to crown, the expenses of simultaneous wars in China and Abyssinia, every governmental item in London that remotely related to India down to the fees of the charwomen in the India office and the expenses of ships that sailed but did not participate

in hostilities, and the cost of Indian regiments for six months, training at home before they sailed- all were charged to the account of unrepresented ryot. The Sultan of Turkey visited London in 1868 in State and his official ball was arranged for at the India Office and the bill charged to India. A-lunatic asylum in Ealing, gifts to members of a Zanzibar mission, the councillar and the diplomatic establishments of Great Britain in China and in Persia; part of the permanent expenses of the mediterranean fleet and the entire cost of a line of telegraph from England to India had been charged before 1870 to the Indian treasury.(36)

یہی کیفیت ریلوں کے نظام کی ہے۔ اس کا مقصد ہندوستان کو ذرائع آمد و رفت میں سہولتیں دینا نہ تھا بلکہ یہ استحصال کا ایک ذریعہ تھیں۔ ریلیں ہندوستان کے ذرائع آمدنی سے نہیں بنائی گئیں۔ اس کے لیے انگلستان کے تاجروں نے روپیہ لگایا جس کے لیے انہیں پانچ فی صد منافعے کی گارنٹی دی گئی۔ چنانچہ کھلے دل سے اس منصوبے پر روپیہ خرچ کیا گیا۔ کیونکہ بالاخر اسے ہندوستان کے خزانے سے پانچ فیصد منافع سمیت ادا کیا جاتا تھا۔ ۱۸۷۲ء تک چھ ہزار میل ریلوے لائن بچھائی گئی جس پر دس کروڑ پاؤنڈ خرچ ہوئے۔ ریلوے نے اپنا قرض کہیں ۴۴-۱۹۴۳ء میں جا کر ادا کیا اور اس کے تین برس بعد انگریز ہی رخصت ہو گئے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ریلوے سے ہندوستان کو کیا فائدہ ہوا۔ البتہ انگریزوں کے لیے یہ منصوبہ اس لیے مفید ثابت ہوا کہ اس سے خام مال کو باسانی اندرون ملک سے بندرگاہوں تک منتقل کیا جا سکتا تھا اور دوران جنگ فوج اور اسلحے کو لے جانے میں آسانی رہتی تھی۔ اس کے علاوہ ملک کے اندر باغی عناصر کو جلد از جلد دبایا جا سکتا تھا۔

انگریزی حکومت میں کاشتکاروں کی حالت بہت خراب ہو گئی۔ مغلوں کے دور میں اگرچہ مالیے کی شرح پچاس فیصد مقرر کی گئی تھی مگر درحقیقت یہ شرح وصول نہیں کی جاتی تھی بلکہ ہر سال فصل کے پکنے پر حکومت کے عمال موقع پر جائزہ لے کر شرح مقرر کرتے تھے جس میں قدرتی وسائل کی تباہ کاریوں سے ہونے والے نقصانات کی تلافی کرنے کا جذبہ موجود تھا۔ اس سلسلے میں مغلوں نے جو فرامین جاری کیے ہیں ان کے مطالعے سے یہ بات

واضح ہو جاتی ہے کہ انہیں عوام سے ہمدردی تھی۔ ذیل میں اورنگ زیب عالمگیر کا ایک فرمان گجرات کے دیوان کے نام درج کیا جاتا ہے۔ یہ فرمان بہت طویل ہے اس کے بعض نکات درج ذیل ہیں :

> First : They should practise benevolence to the cultivators, inquire into their condition and exert themselves judiciously and tactfully so that the cultivators may joyfully and heartily try to increase the cultivation, and every arable tract may be brought under tillage.
> Second: At the beginning of the year inform youself as far as possible, about the condition of every ryot, as to whether they are engaged in cultivtion or are abstaining from it. If they can cultivate, ply them with inducements and assurances of kindness; and if they desire favour in any matter show them that favure....If you find that peasants are unable to procure the implements of tillage, advance to them money from the state in the from of taqavi after taking security.(37)

اس فرمان سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ مغلیہ حکومت کاشتکاروں کی ہمدرد تھی اور ان پر کسی طرح کا ظلم نہیں کرنا چاہتی تھی بلکہ مقصد یہ تھا کہ کسانوں کے ساتھ نرمی کا سلوک کیا جائے اور ان کی حوصلہ افزائی کی جائے تاکہ فصل زیادہ سے زیادہ پیدا ہو جس سے حکومت کی آمدنی میں بھی اضافہ ہو اور کسان بھی خوش حال رہیں۔ مگر انگریزوں کی توجہ حکومت کی آمدنی بڑھانے پر ہی رہی۔ کاشتکاروں کی خوش حالی کی ذرہ برابر پروا نہ کی گئی۔ مغلیہ حکومت تو فصل کے پکنے پر اس کی کیفیت کے مطابق مالیہ وصول کرتی تھی۔مگر انگریزوں نے مالیہ کی ایک مستقل شرح مقرر کر دی اور اسے فصل کی کیفیت سے قطع نظر کر کے بڑی سختی سے وصول کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ فصل کسی آفت ارضی یا سماوی سے متاثر ہوتی تو کاشتکار مہاجنوں سے قرض لینے پر مجبور ہو جاتے اور جو کاشتکار ایک دفعہ قرض لے لیتا تھا وہ سود در سود کے چکر میں اس بری طرح الجھ جاتا تھا کہ دوبارہ کبھی قرض سے نجات نہیں پا سکتا تھا۔ آخر کار مہاجن اس کی زمین قرق کروا لیتا تھا۔ ہندوستان کے کاشتکاروں کے بارے

میں یہ بات مشہور تھی کہ وہ مقروض پیدا ہوتا ہے، مقروض زندگی گزارتا ہے اور مقروض ہی مر جاتا ہے۔ کاشتکار مجبور تھے۔ عدالتیں مہاجن کی طرف، حکومت مہاجن کی طرف... کسان بیچارے کیا کرتے۔ ان کی حیثیت غلاموں کی سی تھی۔ ایک سول جج نے مہاجنوں کے طریقہ واردات کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:

> The borrower agrees to pay 12 to 75 per cent by way of interest. Where the transaction is likely to go before a court of law, the percentage is camoufl-aged in some way or the other. If Rs. 100 is lent at 48 per cent, the sowcar (money- lender) takes a promissory note for Rs. 400 and puts down the interest at 12 per cent and privately agrees to take a hundred rupees and his interest at 48 per cent. In other cases he promises to lend Rs. 100 but deducts for the next year or two and actually lends Rs. 100 minus Rs. 24 or Rs. 100 minus Rs 48, but when he sues, he sues to recover Rs. 100 with interest at the stipulated percentage, so that he obtains interest twice over, one set when he actually lends the money by deducting from the capital, and another set when he recovers the decree amount. There are other similar methods of manipulating these bonds.(38)

غرض انگریزوں کے عہد حکومت میں کسانوں کی حالت نہایت خراب رہی اور اگر اس حقیقت پر نظر رکھی جائے کہ ہندوستان کی ستر فیصد آبادی کا انحصار زراعت پر ہے تو ملک کی بدحالی کا نقشہ پوری طرح سامنے آ جاتا ہے:

اکبر الہ آبادی جب برطانوی حکومت پر تنقید کرتے ہیں تو اگرچہ یہ تنقید ہمہ گیر اور حکومت کے ہر شعبے پر محیط ہوتی ہے مگر ہندوستان میں انگریزوں کی لوٹ کھسوٹ، معاشی استحصال اور ظلم و ستم کے واقعات خصوصی طور پر ان کے مد نظر رہتے ہیں۔ اگرچہ اکبر سے پہلے بھی ایک دو شاعروں نے ان واقعات کی طرف اشارے کیے ہیں لیکن ان کے ہاں حقائق پر علامتوں کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ مثلاً حالی کے مندرجہ ذیل شعر اسی لوٹ کھسوٹ کی پالیسی کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

نہ گل چھوڑے نہ برگ و بار چھوڑے تو نے گلشن میں
یہ گل چینی ہے یا لٹس ہے گلپیں یا ہے قزاقی

کھیت رستے پر ہے اور رہرو سوار
کشت ہے سرسبز اور نیچی ہے باڑ

برق منڈلاتی ہے اب کس چیز پر
ٹڈیاں کب کی گئیں کھیتی کو چاٹ

صحرا میں کچھ بکریوں کو قصاب چراتا پھرتا تھا
دیکھ کے اس کو سارے تمہارے آ گئے یاد احسان ہمیں

اکبر الہ آبادی کے ہاں بھی شروع شروع میں انگریزوں کے ظلم و ستم کے بیان کے لیے یہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ اردو غزل میں محبوب کو چونکہ ستم گر اور ظالم کہا جاتا ہے اس لیے اکبر نے انہی اسالیب کو انگریزوں کے ستم بیان کرنے کے لیے اپنا لیا۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ اس زمانے میں اکبر زیادہ تر غزل گوئی ہی کرتے تھے۔ اکبر نے ان اشعار میں یہ بتایا ہے کہ انگریزوں نے دہشت پھیلا کر لوگوں کو خوف زدہ کر رکھا ہے اس لیے وہ ان کی لوٹ کھسوٹ کے خلاف زبان نہیں کھول سکتے :

ضعف سے میں جو گھٹا اور بڑھا اس کا ستم
یاں زباں ہل نہ سکی وہ متحمل سمجھا

طاقت فریاد بھی مجھ میں نہ باقی رہ گئی
ظلم کرنا آپ کو مجھ پر اب آساں ہو گیا
انقلاب دہر دیکھا' بن گیا آقا غلام
قصر کا مالک جو تھا اب اس کا درباں ہو گیا

کچھ نہ پوچھ اے ہم نشین میرا نشیمن تھا کہاں
اب تو یہ کہنا بھی مشکل ہے وہ گلشن تھا کہاں

چھا گئی زردی چمن پر جلوۂ گل ہو چکا
چور صرصر کے دن آئے' دور بلبل ہو چکا

افسوس ہے گلشن کو خزاں لوٹ رہی ہے
شاخ گل تر سوکھ کے اب ٹوٹ رہی ہے

اشجار میوہ دار ہیں اس باغ میں تو ہوں
مجھ کو نصیب کچھ بھی نہیں سیر کے سوا

تشبیہ' استعارہ اور علامت کا استعمال اس لیے ضروری تھا کہ یہ اشعار جس زمانے میں کہے گئے ہیں وہ انگریزوں کی طاقت کے انتہائی عروج کا دور تھا۔ اس کے علاوہ غزل کی صنف کا مزاج بات کو کھل کر کہنے کی اجازت نہیں دیتا۔ مگر جب اکبر غزل کی صنف کی بجائے کسی اور صنف میں شعر کہتے ہیں تو بعض اوقات نہایت واضح لفظوں میں بتا دیتے ہیں کہ ہندوستان کی دولت انگلستان جا رہی ہے اور ملک اس لوٹ مار سے قحط زدہ ہو گیا ہے۔ کروڑوں عوام مر رہے ہیں اور انگریزوں کی تھیلیاں بھر چکی ہیں تجارت کے پردے میں انگریزوں کی اجارہ داری مسلط ہو چکی ہے۔ غرض وہ سب کچھ جو سیاست دانوں اور اقتصادیات کے ماہروں نے اعداد و شمار کی زبان میں کہا اکبر نے شاعرانہ زبان میں بیان کر دیا۔ بعض اوقات تو وہ اس استحصال سے اس قدر جذباتی ہو گئے ہیں کہ انہوں نے شاعری کے تقاضوں کا بھی خیال نہیں رکھا:

جس روشنی میں لوٹ ہی کی آپ کو سوجھے
تہذیب کی میں اس کو تجلّی نہ کہوں گا
لاکھوں کو مٹا کر جو ہزاروں کو ابھارے
اس کو تو میں دنیا میں ترقی نہ کہوں گا

تخت کے قابض وہی' دیہیم ان کے ہاتھ میں
ملک ان کا' رزق کی تقسیم ان کے ہاتھ میں

علم یورپ کا ہوا میداں وسیع
رزق میں ہندی کے تنگی ہو گئی

مطیع قوم میں رہا کیا ہے
صرف شیخی ہی اب بگھاریں گے

یہ بات غلط کہ ملک اسلام ہے ہند
یہ جھوٹ کہ ملک لچھمن و رام ہے ہند
ہم سب ہیں مطیع و خیرخواہ انگلش
یورپ کے لیے بس ایک گودام ہے ہند

ممکن نہیں لگا سکیں وہ توپ ہر جگہ
دیکھو مگر پیرز کا ہے سوپ(۳۹) ہر جگہ

جیب سے مفروری زر بے تحاشا دیکھیے
جلوۂ بازار مغرب کا تماشا دیکھیے

تہہ میں بٹن جب لگنے لگے جب دھوتی سے پتلون اگا
ہر پیڑ پہ اک پہرہ بیٹھا، ہر کھیت میں اک قانون اگا

مجھ کو تو اکبر کا یہ مصرع رہا کرتا ہے ورد
جمع ہے اولاد آدم ہند کے گیہوں کے گرد

تمہارے کھیت سے لے جاتے ہیں بندر چنے کیونکر
یہ بحث اچھی ہے اس سے حضرت آدم بنے کیونکر(۴۰)

بابو صاحب کا ہے یہ شکوۂ افلاس بجا
سچ تو کہتے ہیں کہ مچھلی نہ سہی بھات تو ہو

آپ گنوائیں شہد و شیر و کباب
یاں نمک بھی نہیں ہے نان کے ساتھ

برطانوی انتظامیہ

استحصال کا سب سے بڑا ذریعہ ہمیشہ کسی ملک کی انتظامیہ ہوتی ہے۔ حکمران شہری' عدالتی اور معاشرتی نظام کو اس نہج پر استوار کرتے ہیں کہ محکوم اس کے چکر سے نکل نہیں پاتا۔ انگریزوں نے ہندوستان میں جو نظام رائج کیا' اس کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانیوں کو محکومی کی ذلت کا احساس دلایا جائے۔ انہیں جب انتظامیہ سے واسطہ پڑے تو معلوم ہو کہ وہ الگ اور بالاتر مخلوق ہے۔ افسروں کو تربیت اس طرح سے دی گئی کہ ان میں احساس برتری پیدا ہو جائے اور وہ عوام کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگیں۔ ان کے رہنے کے لیے خوبصورت آبادیاں شہروں سے پرے بنائیں تاکہ یہ پر فضا آبادیاں دور سے دیکھنے پر ہی عوام میں احساس کمتری پیدا کر دیں۔ چھوٹے افسروں وغیرہ کی تنخواہیں کم رکھیں اور انہیں اختیارات زیادہ دیے تاکہ وہ ان کا ناجائز استعمال کریں۔ پولیس وغیرہ کے اختیارات اور تنخواہوں میں اتنا فرق رکھا کہ آپ ہی رشوت لینے کی ترغیب ہوئی۔ عدالتوں کا طریقہ اس قدر پیچیدہ رکھا کہ مقدمے کئی کئی سال تک فیصل نہیں ہوتے تھے۔ غرض کہ برطانیہ کا سارا انتظامی ڈھانچہ لوگوں پر حکومت کا رعب داب اور اثر ڈالنے کے کام آتا تھا۔

اکبر الہ آبادی برطانیہ کی عدالتی مشینری سے تعلق رکھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ انہیں مقدمات وغیرہ کا فیصلہ تو برطانوی قانون ہی کے مطابق کرنا پڑتا تھا مگر وہ اس مشین کے پرزے ہو کر نہ رہ گئے۔ انہوں نے اس پر تنقیدی نظر بھی ڈالی۔

انگریز افسر عموماً عیش پسند ہوتے تھے۔ خصوصاً ۱۸۵۷ء سے پہلے کے افسر تو عیش پرستی میں ضرب المثل تھے۔(۲۱) بعد میں اگرچہ حکومت کی گرفت انتظامیہ پر پہلے سے زیادہ سخت ہو گئی لیکن عیش پسندی برقرار رہی۔ اکبر نے ذیل کے اشعار میں عیش و طرب اور عشرت کے الفاظ اسی وجہ سے استعمال کیے ہیں:

ہم تو ان کے خیر طلب ہیں
ہم کیا ایسے سب کے سب ہیں

ان کے راج کے عمدہ ڈھب ہیں
سب سامان عیش و طرب ہیں

ہیں مست جام بادۂ عشرت کے خم سے آپ
الجھا رہے ہیں مجھ کو ستاروں کی دم سے آپ

انگریزوں نے ہندوستان میں افسر شاہی کا جو نظام قائم کیا اس کی بنیاد رعب، خوف اور ٹھاٹ پر رکھی گئی تھی۔ اعلیٰ افسروں کے پاس اتنے اختیارات تھے کہ لوگ ان سے خوف کھاتے تھے۔ ان کی تنخواہیں بہت زیادہ تھیں، معاشرت شاہانہ تھی، نذر نذرانہ اور رشوت سے اتنی رقم اکٹھی ہو جاتی تھی جو کئی کئی سال کی تنخواہوں سے جمع نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ عام لوگوں سے الگ تھلگ رہتے تھے تاکہ لوگوں پر ان کا دبدبہ قائم رہے۔ ان افسروں کے متعلق ایک مصنف لکھتا ہے:

Under the Company's rule, a collector, who rose to that position after ten or twelve years of sevice in subordinate posts, received at the end of each revenue collection, a cart-load of money. Such a prospect was bound to change values of life. The Collector's monthly salary was Rs. 1500 plus Rs.150 as house allowance.

There was a vast difference in status, first between British officers and their Indian subordinates and the people, and then between Indian Government Servants and common men.(42)

ہندوستان کے کم تنخواہ پانے والے ملازمین بھی محض حکومت سے متعلق ہونے کی وجہ سے اہم سمجھے جاتے تھے:

However small the salary, the very association with the Government was regarded as a priviledge which carried an amount of awe with it. A toll keeper receiving a salary of three rupees a month was much more important in society than a businessman whose earning was many times higher. (43)

افسروں کے دبدبے کے متعلق یہی مصنف لکھتا ہے:

To the mass of people, a British bureaucrat symbolized terror; to the educated middle classes he was an object of awe; to the rich he was the embodiment of government to whom submission was naturally due. He would tolerate nothing that had even the remote possibility of disturbing that psychology.(44)

اب یہی نقشہ اکبر کے کلام میں ملاحظہ کیجئے:

نہ کچھ انتظار گزٹ کیجئے
جو افسر کہے بس وہ جھٹ کیجئے

جو کہا اس نے، کیا منظور، کیا حرف نفی
ہم سراپا اب تو اس محفل میں "جی ہاں" ہو گئے

میں نے کہا کچھ خوف کلکٹر کا نہیں ہے
بولے کہ جو آ جائے ابھی وہ تو دبک جاؤ

انسپکٹر جو ہیں یہ خان بہادر صاحب
رعب حاکم دل دنیا پہ بٹھانے والے

آسائش عمر کے لیے کافی ہے
بی بی راضی ہوں اور کلکٹر صاحب

بولے چپراسی جو میں پہنچا بہ امید سلام
پھانکیے خاک آپ بھی صاحب ہوا کھانے گئے

ہزاروں ہی طریقوں سے ہم انگریزوں کو گھیرے ہیں
طواف ان کے گھروں کا ہے، انہی سڑکوں کے پھیرے ہیں

پولیس کا محکمہ برطانوی حکومت کے لیے نہایت کار آمد ثابت ہوا۔ پولیس کے سپاہیوں کو کم تنخواہوں کے باوجود اس قدر اختیارات دے دیے گئے کہ ان کا ناجائز استعمال لازم

تھا۔ رام گوپال نے ایک انگریز افسر کے حوالے سے لکھا ہے:

To be in anyway concerned in a criminal prosecution is regareded with such horror that the almost universal object of a person who has been robbed, is not to seek redress from the police, but to conceal the injury he has suffered that he may not be subject to the additional extortion of the government(۴۵)

اس پر مستزاد خفیہ پولیس کا محکمہ تھا جو لوگوں کے لیے عذاب جان بن جاتا تھا۔ رام گوپال کے بقول:

The most notorious of this class of Indian employees were those who belonged to the intelligence department. For over a century, since the occupation of Bengal, the British did not have an elaborate intelligence system in India. It was only when the political consciousness grew that they thought of appointing spies so that political activites might be reported to them. Only Indians who know local languages and not Englishmen who generally did not know them, could gather information and carry them to the British officers. They did the job with an amount of enthusiasm, steadfastness and application that could be expected of British nationals for their country. They managed to enter the inner circles of political parties, both of constitutional and revolutionary variety and kept government posted with the parties' plans. Some of the intelligence men were so shrewd that they were considered by party bosses as more ardent patriots than their genuine comrades. At times they sacrificed their meals, their sleep, and their comfort, to collect information which they believed would be vital to government. They allowed themselves to be subjected to the rigours of prison in order to keep government posted with the intention and plans of political prisoners.(46)

اکبر کے ہاں پولیس اور خفیہ پولیس کی کارگزاریوں کا ذکر بھی متعدد اشعار میں ملتا ہے:

تعلیم اس کی اچھی جو اپنے گھر میں خوش ہو
مذہب اسی کا اچھا جس کو پولیس نہ پکڑے

مولوی ہرگز نہ چھوڑیں گے خدا گو بخش دے
گھیر ہی لیں گے پولیس والے سزا ہو یا نہ ہو

ڈائری میں ہو گیا تھا اختلاف اندراج
لڑ گئے خفیہ پولیس سے "کل کراما" کاتبین

پولیس خفیہ پئے انسداد جرم ہے ٹھیک
نہ چاہیے کہ وہ ہو انسداد گپ کے لیے

ہم سے سکون خاطر یک لخت چھن گیا
تھانے کا اک سپاہی ہم سب کو گن گیا

خدمت بہت اہم ہے گروہ پولیس کی
پروا کرو کچھ ان کے الاؤنس کی، فیس کی

اکبر کو اس چیز کا پوری طرح احساس ہے کہ انتظامیہ کا ڈھانچہ جس بنیاد پر استوار کیا گیا ہے، اس کا لازمی نتیجہ بددیانتی اور رشوت ستانی ہے:

کرو نہ تعمیر گھر کی اکبر حدود میونسپل کے اندر
یہ اہل کاران بددیانت بنیں گے پھوڑا بغل کے اندر

پرچہ رکھا جو اس نے میں یہ سمجھا
پاکٹ میں یہ بیس روپے کا نوٹ گیا

عدالتیں

انگریزوں نے ہندوستان میں جو قوانین نافذ کیے، ان میں ہمواری اور یکسانی نہیں تھی۔ انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے کچھ روایتی قوانین منسوخ کر دیے اور کچھ برقرار

رکھے اور باقی معاملات میں برطانوی قانون نافذ کر دیا۔ یہ بات بحث طلب ہے کہ قانون کا مقصد اور طریقہ انصاف کیا ہونا چاہیے مگر اتنی بات مسلمہ ہے کہ اچھا قانون وہ ہے جس کی بنیاد سماجی انصاف اور اخلاق پر ہو۔ اخلاق کی بنیاد بھی اسی چیز پر قائم ہے کہ ہم دوسروں کے ساتھ اس طرح کا سلوک نہ کریں کہ اگر ویسا ہی سلوک دوسرے لوگ ہمارے ساتھ کریں تو ہمیں ناپسند آئے۔ گویا قانون کا مقصد یہ ہے کہ وہ لوگوں کو اپنی حدود کے اندر رہنا سکھائے۔ قانون کی تشریح و تفسیر کا کام عدالتوں کے سپرد ہوتا ہے اور اگر کسی کو قانون کے مطابق انصاف سے محروم کیا گیا ہے تو عدالتیں اسے اس کا حق دلانے کی پابند ہوتی ہیں۔ انگریزی دور حکومت میں قانون سازی اور حصول انصاف دونوں چیزیں بہت کچھ اصلاح کی متقاضی رہیں۔ قانون ایسے بنائے گئے جن کی بنیاد ہر کسی سے انصاف پر نہیں تھی بلکہ بعض اوقات تو ان کا مقصد ظالموں کو تحفظ دینا ہوتا تھا۔ عدالتوں کا طریق کار بہت طویل اور مہنگا تھا۔ مثال کے طور پر کاشتکاروں اور مہاجنوں کے لیے بننے والے قوانین کا مقصد مہاجنوں کے روپے کا تحفظ تھا۔ اس سلسلے میں گیرٹ لکھتا ہے:

"Until the co-operative movement helped to organise and regularise debt, the only European contribution was to establish a complicated and expensive form of civil law, and to cover India with enough police to prevent the sowkar's extortion being tempered by assasination."(47)

قانون سب کے لیے یکساں ہوتا ہے مگر برطانوی قانون اور عدالتیں نسلی امتیاز کی قائل تھیں۔ یوروپین لوگوں کے لیے عدالتیں مختلف تھیں اور ہندوستانیوں کے لیے مختلف۔ البرٹ بل، جس کا مقصد ہندوستانی ججوں کو برابری کے حقوق دینا تھا، انگریزوں کی شدید مخالف کی وجہ سے اس قدر بدل دیا گیا کہ اس کی روح ہی ختم ہو گئی۔ مندرجہ ذیل اقتباس سے قانون کی عدم مساوات ظاہر ہے:

European British subjects, until 1872, could only be tried or punished by one of high courts. It was then enacted that European British subjects should be liable to be tried for any offences by magisterates of highest class, who were also justices of peace, and by judges of session courts; but it

was necessary in both cases that the magisterate or judge should himself be a European British subject.(48)

آرتھر کنیرڈ نے عدالتوں کی بے انصافیوں کو دیکھ کر ان کے بارے میں اس طرح اظہار بیزاری کیا ہے:

> No man in his senses will resort to a court of law in Bengal. The result is only sure to that side which can lie with most assurances, and bribe with the largest purpose. What with delay, the inefficiency of the magisterates and judges, the unblushing corruption which prevails, from the highest to the lowest of official, the civil servant only excepted, the justice is the scarest of all commodities in Bengal.(49)

برطانوی عدالتوں کا مقصد برطانوی حکومت کا دوام تھا۔ ان کا کام یہ تھا کہ ہر اس شخص کو تحفظ دیا جائے جو برطانوی حکومت کا دوام چاہتا ہو اور ہر اس شخص کو سزا دی جائے جو اس کا مخالف ہو۔

اکبر برطانوی عدالتوں کے ساتھ مدت مدید تک وابستہ رہے۔ بطور وکیل انہیں عدالتوں میں کیس پیش کرنے پڑے اور بطور جج انہوں نے بہت مقدمات سنے۔ یہ ممکن نہیں کہ انہیں ان عدالتوں کے نظام کا نقائص کا پورا پورا اندازہ نہ ہو۔ لیکن انہوں نے ان کے بارے میں نسبتاً کم لکھا ہے۔ اس سلسلے میں ان کے کلام میں جو اشارے کنائے پائے جاتے ہیں' ان سے اندازہ تو ہو جاتا ہے کہ وہ اس کے نقائص سے واقف ہیں مگر یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ وہ کھل کر اس کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ بعض اشعار میں کچھ باتیں اشارے کنائے میں بیان کی گئی ہیں:

عدالتوں کے پیچیدہ طریق کار کی طرف یوں اشارہ کیا ہے:

پہنچنا داد کو مظلوم کا مشکل ہی ہوتا ہے
کبھی قاضی نہیں ملتے' کبھی قاتل نہیں ملتا

منظور اے دل ہماری عرضی ہو گئی
اس وقت کہ جب خدا کی مرضی ہو گی

تو رہ بیدار اور مصروف جسٹس
سمجھ لے بے اثر نیٹو کی گھس گھس

قانون میں نسلی تفاوت کی طرف یوں اشارہ کیا ہے

عدل انگلش من سے تو نیند آ رہی ہے شیخ کو
بابوؤں کی شورش البتہ جہاد انگیز ہے

منطق بھی ہے قانون شہادت بھی ہے موجود
سب ہیچ مگر آپ کی واللہ کے آگے

قانون کی نظر میں انگریز اور مقامی لوگوں کے فرق کی طرف یوں اشارہ کیا ہے :

اس اکھاڑے میں اڑنگے دیکھ کر قانون کے
شیخ نے تہمد سے ہجرت کی طرف پتلون کے

آئین بھی بدلتے ہیں نیت کے ساتھ روز
امید بے اصول سے اب دل نفور ہے

ذہنی غلامی کسی قوم کے لیے سب سے زیادہ خطرناک بیماری ہوتی ہے۔ حاکم قوم یہ چاہتی ہے کہ محکوموں کا ذہن بدل دیا جائے۔ انہیں اپنی روایات' نظریات اور تہذیب سے متنفر یا کم از کم ناواقف کر دیا جائے۔ طویل غلامی کے بعد اکثر یہ ہوتا ہے کہ محکوم قومیں اپنے حاکم کی نقالی پر فخر کرتی ہیں اور اپنی قدیم روایات پر ہنستی ہیں۔ یہی صورت حال ہندوستان میں پیدا ہوئی۔ انگریز دیکھ چکے تھے کہ ہندوستان کے لوگ ۱۸۵۷ء جیسا ہنگامہ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اس کے امکانات کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کی غرض سے یہ منصوبہ بنایا کہ نئی نسلوں کو اپنے آباواجداد کی روایات سے منقطع کر دیا جائے۔ اکبر الہ آبادی اس نکتے کو بخوبی سمجھتے تھے۔ انہوں نے ایک بار قمرالدین بدایونی مصنف "بزم اکبر" سے جو گفتگو کی وہ اس بات پر روشنی ڈالتی ہے :

"فرمایا مغرب ہماری کس چیز کا دشمن ہے؟" میں نے عرض کیا "مذہب کا" فرمایا "نہیں اہل مغرب کے نزدیک مذہب خود کوئی قابل احترام شے نہیں ہے۔ پھر ان کی بلا سے آپ مسجد میں جان دیں یا گرجا میں مریں' البتہ زندگی بھر ان کا پاٹ اٹھانے میں پس و پیش نہ کریں۔ گرجا خود ان کے لیے ایک لطف نظر اور حظ

نفس کا مرکز ہے۔" میں نے عرض کیا "اہل مغرب ہماری دولت کے دشمن ہیں۔" فرمایا: "ہاں دولت کے دشمن کبھی تھے' لیکن اب ہمارے پاس دولت رہی کہاں اور ان کی دشمنی ہے کہ اب تک بہ پایان نمی رسد۔" میں نے عرض کیا " آپ فرمایئے میری سمجھ میں نہیں آیا۔" فرمایا: "اہل مغرب ہمارے اس تخیل کے دشمن ہیں کہ 'پدرم سلطان بود' ہم اب تک نہیں بھولے اور اس وجہ سے ہم کو مٹی میں ملانے اور پست فطرت لوگوں کو ہم پر مسلط کرنے کے درپے ہیں کہ یہ تصور ہمارے ذہنوں سے نکل جائے کہ ہم حاکم قوم (Ruling Nation) کے افراد ہیں۔ ان کو یہ خوف بھی ہے کہ اگر ان کی حکومتوں کے لیے کچھ مضر ثابت ہو گا تو مسلمانوں کا یہی جذبہ ہو گا کہ "مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا"۔ دیکھو میں نے انہی خیالات کے تحت یہ شعر کہا ہے:

نہ ہیں دین کے اور نہ ہیں دھن کے دشمن
فقط ہیں وہ اپنے میاں پن کے دشمن

اور سنئے:

آپ اکبر لاکھ مشق خوش کلامی کیجئے
کتنا ہی اظہار اعزاز دوامی کیجئے
دوستی کی آپ سے فرصت نہیں اس شوخ کو
یا کھسکئے سامنے سے یا غلامی کیجئے (۵۰)

نظام تعلیم

ہندوستان کے لوگوں کے لیے جس قسم کا نظام انگریزوں نے رائج کیا (وہ انتظامی ڈھانچا ہو یا تعلیم) ان سب کا مقصد ایک ہی تھا کہ یہاں کے لوگوں خصوصاً مسلمانوں سے شوکت پاستان اور عظمت ماضی کا تصور چھین لیا جائے' اور اس کی بجائے انہیں دوامی غلامی کا طوق پہنا دیا جائے تاکہ وہ دوبارہ ۱۸۵۷ء جیسی بغاوت نہ کر سکیں۔ اس مقصد کے لیے سب سے زیادہ 'مفید' کام تعلیمی اداروں سے لیا جاسکتا تھا۔ چنانچہ یورپ سے اساتذہ در آمد ہوئے تعلیمی ادارے بنائے گئے اور ایسا نظام تعلیم رائج کیا گیا جس نے چند برسوں میں لوگوں کے ذہنوں کو بدل کر رکھ دیا۔ بقول اکبر:

توپ کھسکی پروفیسر پہنچے
جب بسولا ہٹا تو رندہ ہے

برطانوی حکومت کے اس نظام تعلیم کے متعلق اکبر کے خیالات کی تصدیق خود برطانوی مصنفین کی تحریروں سے ہو جاتی ہے جنہوں نے غیر مبہم الفاظ میں اس کے مقاصد بیان کر دیے ہیں۔ انہوں نے جو باتیں چھپانے کو کوشش کی ہے' اس کا تکملہ مقامی مصنفوں نے مہیا کر دیا ہے۔ غرض انگریز کے تعلیمی نظام کے متعلق ایک مکمل نقشہ ہمارے سامنے موجود ہے۔

انگریزوں نے ہندوستانیوں کو تعلیم دینے کی ذمہ داری اس لیے قبول کی کہ اس سے ان کے چار بڑے مقاصد وابستہ تھے۔ اول یہ کہ جدید علوم بالخصوص فلسفہ اور سائنس وغیرہ لوگوں کے دلوں سے اپنی قدیم روایات کی بابت نفرت پیدا کر دیں گے اور بالعموم مذہب بیزاری پر منتج ہوں گے۔ دوم یہ کہ ہندوستان میں ایک ایسا گروہ پیدا ہو گا جو انگریزی تہذیب و معاشرت کو اپنے لئے ایک مثالی نمونہ قرار دے گا۔ اور اس کی تقلید کرے گا۔ سوم اس سے انتظامیہ کے معمولی اور کم تنخواہ پانے والے عہدے دار پیدا ہوں گے جو انگلستان سے منگوائے جانے والے ملازموں کے مقابلے میں بہت کم تنخواہ پر کام کریں گے۔ اس کے علاوہ وہ برطانوی حکومت کی بقا کو اپنی بقا سمجھتے ہوئے سلطنت برطانیہ کے استحکام میں مصروف رہیں گے۔ چہارم یہ کہ اس سے برطانوی تہذیب اور عیسائیت کا فروغ ہو گا۔

پہلے دو مقاصد کے حصول کا طریقہ یہ تھا کہ ہندوستان کے پرانے نظام تعلیم کے نقائص بڑھا کر بیان کیے جائیں۔ اس کے نصابات پر شدید نکتہ چینی کی جائے اور ان میں بیان کیے گئے نظریات اور روایات کے متعلق احساس کمتری پیدا ہو۔ بومان بہرام اس کی وضاحت یوں کرتے ہیں :

> The laws of the Hindus and the Mahammadans were pronounced to be congeries of contradictory maxims, tyrannical and absurd in their detailed injunctions and little fit to raise the people higher in the scale of civilization, their literature unbracing in moral tone, and though in some parts beautiful, yet on the whole inferior to that of England; their system of philosophy, a collection of fanciful and false notions; their abstract sciences packed with errors; their medicine a pseudoscience; their ethics unedifying. The Anglicists disregarded what was true and beautiful and scientifc in Sanskrit and Arabic Literatures and

Sciences, or at best damned it with faint praise, but fastened eagerly upon its blemishes and deficiencies for purposes of ridicule and depreciation. (51)

میکالے ہندوستان میں انگریزی تعلیم کے مقاصد کی طرف یوں اشارہ کرتا ہے:

I feel... that it is impossible for us with our limited means, to attempt to educate the body of the people- we must at present do our best to form a class who may be interpreters between us and millions whom we govern- a class of persons, Indian in blood and colour, but English in tastes, in opinions, in morals and in intellect.(52)

انگریز ماہرین تعلیم کا یہ خیال تھا کہ ہندوستان کا پرانا نصاب تعلیم خطرناک ہے۔ اس کو پڑھ کر لوگ سلطنت برطانیہ کے وفادار نہیں بن سکتے:

As long as the natives are left to brood over their former independence, their sole specific for improving their condition is, the immediate and total expulsion of the English. A native patriot of the old school has no notion of any-thing beyond this: his attention has never been called to any other mode of resorting the dignity and prosperity of the country. It is only by the infusion of European ideas, that a new direction can be given to the national views.(53)

یورپی تعلیم کے حصول سے مزاج میں تغیر آ جاتا ہے' لوگ اپنے ماضی سے نفرت کرنے لگتے ہیں اور ان کی خواہش ہوتی ہے کہ انگریزوں کے زیر سایہ حفاظت سے رہیں اور ویسے ہی لگیں:

Instead of regarding us with dislike, they court our society and look upon us as their natural protectors and benefactors: The summit of their ambition is, to resemble us, and under our auspices, they hope to elevate the character of their countrymen and to perpare them by gradual steps for the enjoyment of a well regulated and therefore a secure

and a happy independence. So far from having the idea of drowning the English into the sea uppermost in their minds, they have no notion of any improvement but such as rivet their connection with the English, and makes them dependent upon English protection and instruction. In the re-establishment of the old native government they see only the destruction of their most cherished hopes, and a state of geat personal insecurity for themselves.(54)

ان کے خیال میں ہندوستان کے لوگ جدید علوم کو پڑھیں گے تو قدیم نظریات کو ترک کر دیں گے۔ اسی طرح نئے علوم ان کی مذہبی کتابوں کی خامیاں بھی ان پر ظاہر کردیں گے :

In India all system of knowledge are regarded as sacred, being contained in books which are accounted of divine authority. All of these are thickly interspersed with glaring errors; consequently it is impossible for young men to complete a course of high English Education without discovering that the truths of our history, chronology and science generally come into constant and fatal collision with the opposing errors in their own systems.(55)

اسی طرح جدید تعلیم کو عیسائیت کی تبلیغ و ترویج کا ایک ذریعہ بنایا گیا۔ خصوصاً مشنری اداروں میں تبلیغ اور بائبل کی تدریس پر بہت زور دیا جاتا تھا۔

Missionaries encouraged education not as an end in itself but a means to evangelization.(56)

اکبر الہ آبادی ان مقاصد سے بخوبی آگاہ تھے۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ حاکم محکوم قوم کے نفع کے لیے کبھی اقدام نہیں کرتے۔ اصلاحات کا مقصد ہمیشہ اپنی سلطنت اور مفادات کا استحکام ہوتا ہے۔ قرآن مجید کی سورہ النمل(۵۷) میں آیا ہے :

ان الملوک اذا دخلوا قریتہ" افسدوہا و جعلوا اعزۃ اھلھا اذلتہ" (ج) (۵۸) حکمرانوں کی یہی فطرت ہوتی ہے۔ برطانوی حکمرانوں کی بھی یہی فطرت تھی بلکہ بعض دیگر حکمرانوں سے زیادہ ہی تھی، اس لیے انہوں نے ہندوستان کے لوگوں کو اگر تعلیم دینا چاہی تو اس کے پس

پشت کچھ مقاصد تھے۔ جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے' اکبر کے نزدیک انگریزوں کا ایک بڑا مقصد لوگوں کو اپنے آباواجداد کے کارناموں سے غافل کرنا تھا کیونکہ آباواجداد کے افسانے محکوموں کے جوش اور جذبے کو زندہ رکھتے ہیں۔ بقول اکبر:

نقص تعلیم سے اب اس کی سمجھ ہی نہ رہی
دل تو بڑھ جاتا تھا اجداد کے افسانے سے

اور اس کے ساتھ وہ لاجواب شعر ہے جو جدید تعلیم کے نتائج کی طرف اشارہ کرتا ہے:

شیخ مرحوم کا قول اب مجھے یاد آتا ہے
دل بدل جائیں گے' تعلیم بدل جانے سے

غرض اس جدید تعلیم پر اکبر کا سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ اس نے یہاں کے لوگوں کے اذہان تبدیل کر دیے ہیں۔ لوگ سپنسر' مل' ڈارون' ہکسلے وغیرہ کے مطالعے سے جدید فلسفیانہ نظریات سے کچھ نہ کچھ واقف ہو گئے تھے۔ انگریزوں نے چونکہ انہی جدید تعلیم یافتہ لوگوں کو تقرب سے نوازا تھا اور ان کے لیے نوکریوں کا بندوبست کیا تھا اس لیے ایک غریب اور مفلوک الحال معاشرے میں ان کے رعب داب کا قائم ہو جانا ضروری تھا۔ ان لوگوں نے ایسے فلسفے پڑھے جو نفع پرستی کی طرف لے جاتے تھے۔ قوم یا جماعت کی بجائے انفرادیت پر زور دیتے تھے اس لیے ان کو پڑھ کر لوگ اپنے مقام اور ذات کو بلندی پر لے جانے کی کوششوں میں مشغول ہو گئے اور مفاد قومی کو پس پشت ڈال دیا۔ چونکہ ان تازہ واردان کو معاشرے میں انگریزوں نے مرتبہ دلوایا تھا اس لیے وہ انگریزی تعلیم و تہذیب اور معاشرت کے زبردست حامی بن گئے انگریزوں کی طرح رہتے تھے اور انگریزی بولنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ ورڈزورتھ' شیکسپئر اور پوپ کے شعر پڑھتے تھے اور یورپی فلسفیوں کے اقوال کے حوالے دیتے تھے۔ وہ قدیم تعلیم یافتہ لوگوں کو ان پڑھ سمجھتے تھے۔ اپنے آباواجداد سے باغی تھے۔ اکبر ذیل کے اشعار میں نئی تعلیم کے انہی نتائج کو ظاہر کرتے ہیں:

سینہ میرا ہے دل نہیں ہے میرا
میری نہیں بات گو زبان میری ہے

کیا کہوں اس کو میں بدبختی نیشن کے سوا
اس کو اب آتا نہیں کچھ امیٹیشن کے سوا

غزالی و رومی کی بھلا کون سنے گا
محفل میں چھڑا نغمہ اسپنسر و مل ہے

پنڈت ہو کہ مولوی ہو دونوں بیکار
انسان کو گرایجویٹ ہونا اچھا

فخریہ میں نے جو اشعار پڑھے سعدی کے
فخریہ آپ سنانے لگے نظم ملٹن
شیخ سعدی تو بزرگوں میں تھے میرے اے دوست
آپ کے کون تھے ملٹن یہ سنوں قبلہ من

ہماری محفلیں اب بھی لطیف اجزا سے مملو ہیں
بزِ اخفش تھے پہلے اور اب اسپنسر کے ٹٹو ہیں

خامے سے کام لیتے ہیں بے کار عقل ہے
یا ترجمہ ہے یا تو کتابوں کی نقل ہے

باپ ماں سے، شیخ سے، اللہ سے کیا ان کو کام
ڈاکٹر جنوا گئے، تعلیم دی سرکار نے

طفل سے بو آئے کیا ماں باپ کے اطوار کی
دودھ تو ڈبے کا ہے، تعلیم ہے سرکار کی

ولولے لے کے نکلنے لگے کالج کے جوان
شرم مشرق کے عدو' شیوهٔ مغرب کے شہید

مرزا غریب چپ ہیں ان کی کتاب ردی
بدھو اکثر رہے ہیں صاحب نے یہ کہا ہے

اس کے علاوہ اکبر مغربی تعلیم کے عام انداز سے بھی مطمئن نہیں تھے۔ ان کے نزدیک ہندوستان میں انگریزی تعلیم سے لوگوں کو صرف یہ فائدہ ہوا کہ اس سے وہ معمولی درجے کی ملازمتیں حاصل کرنے کے قابل ہو گئے:

میں کیا کہوں احباب کیا کار نمایاں کر گئے
بی۔ اے۔ کیا' نوکر ہوئے' پنشن ملی اور مر گئے

گویا اس تعلیم کا مقصد خاص حالات میں کام کرنے والے خواندہ افراد پیدا کرنا تھا۔ لائق' باہنر اور ذہین افراد پیدا کرنا نہ تھا۔ ہندوستان میں انگریزی تعلیم زیادہ تر آرٹس کے مضامین تک محدود رہی۔ سائنس اور سائنسی ترقیات کے متعلق جدید خطوط پر تعلیم دینا انگریزوں کا منشا ہی نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں آرٹس کے عام مضامین تو بے شمار اداروں میں پڑھائے جاتے تھے لیکن سائنس' زراعت' صنعت و حرفت' طب' انجنیری وغیرہ کی تعلیم دینے والے ادارے خال خال تھے۔ ان تعلیمی اداروں کی قلت کا اندازہ مندرجہ ذیل معلومات سے لگایا جا سکتا ہے:

1- In 1901-02, there were four medical colleges in India.(59)
2- In 1901-02, there were four engineering colleges (with 865 students) in India.(60)
3- In India, Agricultural education is of the utmost importance because the vast majority of the population lives on land. And yet, for some reason or the other, very little was achieved in Agricultural Education during the period under review.(61)
4- In 1901-02 there were four institutions for veternary education.(62)
5- In 1901-02 there were four school of Art.(63)

6- During the next twenty years very little action was taken by the Government to promote Industrial and Technical Education.(64)

ہندوستان جیسے وسیع اور گنجان آبادی والے ملک کے لیے سائنس اور صنعت و حرفت کی تعلیم کا یہ بندوبست ظاہر ہے کہ افسوس ناک عدم تناسب کو ہمارے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ اکبر الہ آبادی تعلیم کے اس سائنسی اور تکنیکی پہلو کو نظر انداز ہوتا ہوا دیکھ رہے تھے اس لیے انہوں نے بار بار اپنے شعروں میں لوگوں سے کہا ہے کہ اگر جدید تعلیم حاصل کرنی ہے تو سائنس اور ٹکنالوجی کی حاصل کرو کلرک بنانے والی تعلیم کے پیچھے بھاگنا تضیع اوقات ہے۔ اس پہلو پر کلام اکبر میں بہت زور دیا گیا۔ انگریز ہمیں جو نامکمل تعلیم دے رہے ہیں اس کی طرف ذیل کے اشعار میں اشارہ کیا ہے:

انجن آیا نکل گیا زن سے
سن لیا نام آگ پانی کا
بات اتنی اور اس پہ یہ طومار
غل ہے یورپ پہ جانفشانی کا
علم پورا اگر سکھائیں ہمیں
تب کریں شکر مہربانی کا

صنعتی، زرعی اور سائنسی تعلیم کے حصول کی طرف لوگوں کو یوں راغب کیا ہے:

تکمیل میں ان علوم کے ہو مصروف
نیچر کی جو طاقتوں کو کر دیں مکشوف
لیکن تم سے امید کیا ہو کہ تمہیں
عہدہ مطلوب ہے، وطن ہے مالوف

گل پھینکے ہیں یورپ کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے نیچر و سائنس بھلا کچھ تو ادھر بھی

ہر ایک کو نوکری نہیں ملنے کی
ہر باغ میں یہ کلی نہیں کھلنے کی

کچھ پڑھ کے تو صنعت و زراعت کو دیکھ
عزت کے لیے کافی ہے اے دل نیکی

تعلیم وہ خوب ہے جو سکھلائے ہنر
اچھی ہے وہ تربیت جو روحانی ہے

وہ باتیں جن سے قومیں ہو رہی ہیں نامور سیکھو
اٹھو تہذیب سیکھو، صنعتیں سیکھو، ہنر سیکھو
بڑھاؤ تجربے، اطراف دنیا میں سفر سیکھو
خواص خشک و تر سیکھو، علوم بحر و بر سیکھو
خدا کے واسطے اے نوجوانو ہوش میں آؤ
دلوں میں اپنے غیرت کو جگہ دو، جوش میں آؤ

دوڑاؤ تدبیر کے ریشے
قوم میں پھیلیں فن اور پیشے
صنائی کے چلاؤ تیشے
تاکہ کٹیں افلاس کے ہشے

انجینئری نہ آئے تو ایجاد کیا کریں
قائم عروج قوم کی بنیاد کیا کریں

ناقص اور نامکمل جدید تعلیم پر مجموعی طور پر مندرجہ ذیل شعر میں بہت اچھا تبصرہ کیا گیا ہے:

تعلیم جو دی جاتی ہے ہمیں وہ کیا ہے فقط بازاری ہے
جو عقل سکھائی جاتی ہے وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے

مغربی تعلیم کے مندرجہ بالا نقائص کے علاوہ اکبر کا اس پر دوسرا بڑا اعتراض اخلاقی نوعیت کا ہے۔ تعلیم کا مقصد روٹی کمانا نہیں۔ حصول علم بذات خود مقصد ہے، کسی دوسرے مقصد کے حصول کا ذریعہ نہیں۔ ہمیں علم اس لیے حاصل کرنا چاہیے کہ یہ ہماری متجس

فطرت کو مطمئن کرتا ہے اور مزید تجسس پر اکساتا ہے اور معاشرے کو بہتر بنانے کا شعور عطا کرتا ہے۔ مگر انیسویں صدی میں یورپ کے عقلیت پسند لوگ یہ سمجھنے لگے تھے کہ جس چیز کا کوئی مادی فائدہ نہیں، وہ بیکار ہے۔ اس لیے تعلیم کا مقصد نفع اندوزی قرار پایا۔ اکبر اس کی طرف طنزیہ اشارہ کرتے ہیں :

پڑھ کے انگریزی میں دانا ہو گیا
کم کا مطلب ہی کمانا ہو گیا

یورپی اقوام اسی انتفاعیت کے فلسفے کے زیر اثر دوسری نفع پسند قوموں سے بھڑ گئیں جس کا نتیجہ انسانوں کی بڑے پیمانے پر ہلاکت کے سوا کچھ نہ نکلا :

کیوں کر کہوں کہ کچھ بھی نہیں فیر کے سوا
سب کچھ علوم غرب میں ہے خیر کے سوا

سائنس نے بگاڑ دیا ہے مزاج غرب
اب صرف زہر حرب سے ہو گا علاج غرب

اکبر کے نزدیک تعلیم ایسی ہونی چاہیے جو انسانوں کو تہذیب، دیانت اور شرافت سکھائے، انہیں روحانی ترقیاں اور اطمینان قلب بخشے۔ مگر جو تعلیم قوموں اور انسانوں کو گروہوں میں بانٹ دے، مختلف طبقات میں منافرت پیدا کرے اور محض مادی مفادات کے حصول کی طرف مائل کرے وہ قابل ترویج نہیں ہے اور اس سے عالم انسانیت کی تذلیل نہیں کی جانی چاہیے۔ تعلیم کے ان پہلوؤں کی طرف اکبر نے ذیل کے اشعار میں اشارے کیے ہیں :

علوم دنیوی کے بحر میں غوطہ لگانے سے
زبان گو صاف ہو جاتی ہے دل طاہر نہیں ہوتا

نئی تعلیم کو کیا واسطہ ہے آدمیت سے
جناب ڈارون کو حضرت آدم سے کیا نسبت

خدا پرست بنائے گا کیا وہ لٹریچر
کرے جو طبع کو بے قید اور گناہ پسند

نئی تہذیب میں بھی مذہبی تعلیم شامل ہے
مگر یونہی کہ گویا آبِ زمزم مے میں داخل ہے

دوا ہے کالج اور کونسل سو اس کی ہے فراوانی
غذا ہے راحتِ دل اور وہ دولت بہت کم ہے

بے سود ہے گنج و مال و دولت کی تلاش
ذلت ہے دراصل جاہ و شوکت کی تلاش
اکبر تو سرورِ طبع کو علم میں ڈھونڈھ
محنت میں کر سکون و راحت کی تلاش

حاصل کرو علم، طبع کو تیز کرو
باتیں جو بری ہیں ان سے پرہیز کرو
قومی عزت ہے نیکیوں سے اکبر
اس میں کیا ہے جو نقلِ انگریز کرو

انسان یا بہت سے دلوں کو ملا سکے
یا کوئی شے مفیدِ خلائق بنا سکے
ہم تو اسی کو علم سمجھتے ہیں کام کا
پڑھنے کو مستعد ہیں جو کوئی پڑھا سکے

ہم ایسی کل کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

مجھے اس درس سے خواہش تھی روحانی ترقی کی
یہاں ہر چیز لیکن مادی و عنصری نکلی

اکبر اس بات سے مایوس تھے کہ مغربی تعلیم ہمارے نوجوانوں کو اپنی تہذیب' تاریخ' مذہب' قوم اور ذہنی سرمائے سے غافل کر رہی ہے۔ ہم یورپ کی ہر بات کو صحیح اور ایشیا کی ہر بات کو غلط سمجھتے ہیں۔ اپنے شاعروں اور فلسفیوں سے ناواقف ہوتے جاتے ہیں اور موقع بے موقع یورپ کے لکھنے والوں کے حوالے دیتے ہیں۔

غزالی و رومی کو بھلا کون سنے گا
محفل میں چھڑا نغمہ اسپنسر و مل ہے

وہ حافظہ کہ مناسب تھا ایشیا کے لیے
خزانہ بن گیا یورپ کی داستانوں کا

خامے سے کام لیتے ہیں بیکار عقل ہے
یا ترجمہ ہے یا تو کتابوں کی نقل ہے

نہ سن تو قرآں کا وعظ بھائی خوشی سے تقلید بکسلے کر
پھرے گا کیمپوں میں آخر اک دن دیا سلائی کا بکس لے کر

وہ فقط وضع کے کشتے ہیں نہیں قید کچھ اور
بھینس کو گون پنھا دیجئے عاشق ہو جائیں

سرسید کے متعلق نظریات

جدید تعلیم کے موضوع کے ساتھ ہی ایک، اور مضمون کثرت سے اکبر کے کلام میں موجود ہے۔ اس مضمون کی ایک ظاہری علامت سرسید احمد خاں ہیں مگر درحقیقت اس کا ہدف جدید تعلیم یافتہ افراد ہیں۔ اکبر نے کہیں ان لوگوں کا مضحکہ اڑایا ہے اور کہیں سنجیدگی سے دلائل کے ساتھ ان کی باتوں کو رد کیا ہے۔ جدید تعلیم یافتہ افراد میں سے بیشتر مسلمان علی گڑھ کالج سے تعلیم حاصل کر کے نکلے تھے اس لیے اکبر کی تنقید کا نشانہ علی گڑھ کالج بھی بنا ہے۔ اور چونکہ علی گڑھ کالج سرسید احمد خاں کا کارنامہ تھا اس لیے سرسید احمد خاں بھی اکثر اوقات موضوع شعر بن جاتے ہیں۔ علی گڑھ' سرسید احمد خاں اور جدید تعلیم یافتہ

افراد ایک ہی مثلث کے تین ضلع تھے۔ سرسید اپنی جدوجہد کو تعلیم تک ہی محدود رکھتے تو ان کی زیادہ مخالفت نہ ہوتی۔ بدقسمتی سے انہوں نے ایک مصلح اور مجدد کا کردار بھی ادا کرنا شروع کر دیا۔ ان کی سب سے زیادہ مخالفت ان کے مذہبی مضامین کی وجہ سے ہوئی۔ ان کی تفسیر قرآن میں جو بات انتہا تک جا پہنچی' اس کا آغاز بہت پہلے سے بعض مضامین میں ہو چکا تھا۔ ان کے مذہبی نظریات عام مسلمانوں سے اس قدر مختلف تھے کہ بعض لوگ' جو تعلیمی میدان میں ان سے تعاون کرنا چاہتے تھے' وہ بھی ان خیالات کی وجہ سے ان سے الگ رہے۔ ان کے قریبی رفقا مثلاً محسن الملک' نذیر احمد' حالی' وقارالملک اور شبلی تک ان کے بیشتر مذہبی نظریات سے اتفاق نہیں رکھتے تھے۔ اس لیے دوسرے لوگوں کو ان سے جس قدر اختلاف ہو سکتا تھا ظاہر ہے۔ ان نظریات کا دائرہ تصور باری تعالیٰ سے لے کر معمولی معمولی معاشرتی مسئلوں تک پھیلا ہوا تھا۔ سرسید احمد خاں اور ان کے مداح یہ کہتے ہیں کہ ان کے ہاں بیشتر نظریات وہی ہیں جو زمانہ قدیم سے اسلامی تاریخ میں چلے آتے ہیں۔ مگر حالی نے "حیات جاوید" میں لکھا ہے کہ ستاون مسائل میں انہوں نے مروجہ عقائد کا اتباع کیا ہے جبکہ تیرہ مسائل میں انہوں نے ذاتی اجتہاد کیا ہے(۶۵)۔

اس سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ سرسید نے اتنا بڑا مجتہد بننا چاہا جتنا عالم اسلام میں پہلے کوئی نہ ہوا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ وہ اکثر امام رازی' معتزلہ' امام غزالی اور ابن رشد وغیرہ کی آرا کو اپنی تائید میں پیش کرتے ہیں۔ مگر مختلف افراد نے فرداً فرداً جو کچھ لکھا ہے اگر ان سب کو مع اضافوں کے ایک جگہ جمع کر دیا جائے تو ایک ایسی چیز بن جاتی ہے جو عام مسلمانوں کے عقائد سے بے حد مختلف ہے۔ سرسید کی مخالفت کا سب سے بڑا سبب یہ رہا ہے۔

سرسید احمد خاں کے ان نظریات کی تہ میں جدید علوم بالخصوص سائنس اور فلسفے کی ترقیوں کا خوف چھپا ہوا ہے۔ انیسویں صدی کے انگلستان میں سائنس اور فلسفہ لوگوں کو تیزی سے لامذہب بنا رہا تھا۔ اس زمانے میں عقلیت اور منطقیت اور نیچریت کے الفاظ پورے یورپ کے ذہن پر چھا گئے تھے۔ انگلستان' فرانس اور جرمنی میں خاص طور پر اس قسم کو بڑا عروج حاصل ہوا تھا۔ سائنسی ترقیوں اور ایجادوں نے لوگوں کو یقین دلا دیا تھا کہ انسان ہر چیز پر قادر ہے۔ چنانچہ ہر چیز کو سائنسی فارمولوں کے مطابق سمجھنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ بشیر احمد ڈار لکھتے ہیں :

The popularity of Naturalism in Europe due to the increasing sucesses of science had its effect on the development of religious thought. Its main slogans were nature and reason... The movement started with a critical opposition to authority and tradition and a belief that human reason was able to solve all problems and cure all ills. It soon developed (1) Rational (2) Logic (3) Naturalism, into the form of a rational or natural religion.(66)

اس عقل کا نتیجہ اس طرح ظاہر ہوا کہ لوگ یہ سمجھنے لگے کہ:

"What man could not comprehend must on that account be rejected as false.(67)

سرسید نے لوگوں کو تعلیم جدید کی طرف راغب کیا تھا۔ اس کے نتائج یورپ کی حد تک ان کے سامنے تھے، اس لیے انہیں خوف تھا کہ ہندوستان کے مسلمان بھی لامذہب ہو جائیں گے۔ اس وجہ سے انہوں نے قرآن کو عقل اور فطرت کے معیاروں کے مطابق بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی تاکہ جدید تعلیم کے حصول کے باوجود لوگ مسلمان ہی رہیں۔ اس لیے انہوں نے قرآن کی وہ تمام چیزیں جو خلاف معمول تھیں، معمولی اور عام فہم بنا کر پیش کیں۔ ان کی یہ کوشش اس لحاظ سے قابل تحسین ہے کہ ان کا مقصد نیک تھا مگر اس کی بنیاد غلط تھی۔ سرسید کا خیال تھا کہ قرآن کریم خدا کا قول ہے اور فطرت فعل ہے اور چونکہ خدا کے قول و فعل میں کوئی تضاد نہیں ہو سکتا اس لیے قرآن میں جو کچھ کہا گیا ہے، وہ فطرت سے سرمو انحراف نہیں کر سکتا، اور اگر اس میں ہمیں کچھ باتیں خلاف عقل نظر آتی ہیں تو یہ ہمارے اپنے فہم کی کوتاہی ہے۔ مگر قرآن میں بے شمار ایسی باتیں موجود ہیں جو عقل اور فطرت کے مطابق نہیں ہیں۔ اس تضاد کو حل کرنے کے لیے سرسید نے ان تمام باتوں کی عقلی توجیہ کی۔ یہ بات اس لیے غلط ہے کہ خدا قادر مطلق ہونے کی حیثیت سے اس بات پر حاوی ہے کہ کسی وقت بھی فطرت کے قوانین کو معطل کر کے مافوق الفطرت کو وجود میں لائے۔ معجزات وغیرہ کی اصلیت یہی ہے۔ مگر سرسید اس بات کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ خدا نے جو قانون قدرت بنا دیا ہے، اس کو وہ کبھی نہیں توڑتا۔ یہی سرسید احمد خاں اور عام مسلمانوں میں اختلاف کی بنیاد ہے۔

اب اگر خدا نے قانون قدرت بنا دیا ہے اور یہ قانون قدرت دائمی ہے تو خدا کی اپنی

حیثیت کیا ہے؟ سرسید احمد خاں کے نزدیک خدا کی حیثیت "سبب اول" کی ہے، یعنی کائنات میں ایک بات دوسری بات کا نتیجہ ہوتی ہے اور دوسری بات تیسری کا، حتیٰ کہ یہ سلسلہ اسباب پیچھے ہٹتے ہٹتے خدا تک پہنچتا ہے جو ہر شے کے آغاز کا سبب اول ہے، جہاں سے دیگر اسباب یکے بعد دیگرے وجود میں آتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح خدا کے قادر مطلق ہونے کی نفی ہو جاتی ہے۔ جب خدا کے بارے میں سرسید اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ وہ سبب اول ہے اور کائنات اسباب و علل کا ایک سلسلہ ہے تو لا محالہ تمام مافوق الفطرت واقعات کوئی وجود نہیں رکھتے۔ یہاں پہنچ کر سرسید الجھن کا شکار ہو جاتے ہیں کیونکہ قرآن مجید میں جنت، دوزخ، فرشتہ، جن، شیطان، خضر، وحی اور معجزات وغیرہ کا ذکر آتا ہے اور یہ ساری چیزیں مافوق الفطرت ہیں۔ چنانچہ سرسید ان تمام چیزوں کو قانون قدرت اور فطرت و عقل کے مطابق بنا کر پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً سرسید ایک جگہ حضرت آدم کے قصے کے متعلق قرآنی آیات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اس قصے میں چار فریق بیان ہوئے ہیں۔ ایک خدا، دوسرے فرشتے (یعنی قوائے ملکوتی)، تیسرے ابلیس یا شیطان (یعنی قوائے بہیمی)، چوتھے آدم (یعنی انسان) جو مجموعہ ان قوا کا ہے اور جس میں عورت و مرد دونوں شامل ہیں۔" (۶۸)

گویا فرشتے اور ابلیس محض علامتی حیثیت رکھتے ہیں اور انسانوں کی روحانی اور حیوانی قوتوں کی علامتیں ہیں۔

اسی طرح حضرت ابراہیم اور حضرت لوط کے پاس جو فرشتے آئے، انہیں سرسید نے خدا کے بھیجے ہوئے انسان قرار دیا ہے۔ (۶۹) انہوں نے ایک اور مضمون میں دعویٰ کیا ہے کہ جادو کا جو ذکر قرآن مجید میں کیا گیا ہے، اس سے یہ مراد نہیں کہ جادو کا وجود دنیا میں ہے، بلکہ اس کا مطلب ہے کہ "اس زمانے کے لوگ ایسا سمجھتے تھے۔ (۷۰)

حضرت موسیٰ کے معجزوں کے متعلق تو سرسید نے تاویلات کی انتہا کر دی ہے۔ عصا کے معجزے کے متعلق لکھتے ہیں:

> یہ کیفیت جو حضرت موسیٰ پر طاری ہوئی، اسی قوت نفس انسانی کا ظہور تھا جس کا اثر ان پر ہوا تھا۔ یہ کوئی معجزہ یا مافوق الفطرت بات نہ تھی.... حضرت موسیٰ میں ازروئے فطرت و جبلت کے وہ قوت نہایت قوی تھی جس سے اس قسم کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔ انہوں نے اس خیال سے کہ وہ لکڑی سانپ ہے، اپنی لاٹھی پھینکی اور وہ ان کو سانپ یا اژدہا دکھائی دی۔ یہ خود ان کا تصرف اپنے

خیال میں تھا۔ وہ لکڑی لکڑی ہی تھی' اس میں فی الواقع کچھ تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔(۷۱)

یہی بات معجزہ ید بیضا کے متعلق لکھی ہے(۷۲)۔ دریائے نیل کے عصا سے پھٹ جانے اور فرعون کے زمانے میں کثرت سے حشرات الارض کے پیدا ہونے کی بھی اسی قسم کی عقلی توجیہیں کی ہیں۔ اسی طرح حضرت موسیٰ کے خدا سے ہم کلام ہونے کو "خدا کی آواز نہیں" بلکہ ان الفاظ کا "اثر قرار دیا ہے جو انہی کے نفس کی آواز تھے جو ان کے کان میں آئی ہے"(۷۳) خدا کی تجلی کے پہاڑ پر نازل ہونے کے واقعے پر لکھتے ہیں:

"حضرت موسیٰ نے پہاڑ پر جو آگ دیکھی وہ حقیقتاً آگ ہی تھی جو کسی نے جلائی تھی۔ خدا کی تجلی نہ تھی۔"(۷۴)

حضرت خضر کے بارے میں سرسید نے لکھا ہے کہ قرآن میں ان کے متعلق ایک لفظ بھی موجود نہیں۔ حضرت موسیٰ کو جو بزرگ راہنما ملے اور اس شرط پر راہنمائی کے لیے تیار ہوئے کہ حضرت موسیٰ جو کچھ دیکھیں گے اس کے بارے میں وضاحت نہیں مانگیں گے' ان کے بارے میں سرسید کا خیال ہے:

"قرآن مجید سے صرف اس قدر پایا جاتا ہے کہ جب موسیٰ لوٹ کر پھر مجمع البحرین پر آئے تو وہاں ایک اور شخص ان کو ملا... معلوم ہوتا ہے کہ وہ شخص جو ملا' وہ راستے کا اور اس کے نواح کا واقف کار تھا۔(۷۵)

اس کے بعد جو تین واقعات پیش آئے' یعنی کشتی کو ناقص کرنا' دیوار کی مرمت کرنا اور ایک شخص کو قتل کر دینا' ان کی بھی سرسید نے عقلی توجیہ کی ہے اور لکھا ہے کہ "کشتی کے ناقص کر دینے کی جو وجہ اس شخص نے بتائی وہ نہایت صاف ہے۔ وہ جانتا تھا کہ وہاں کا بادشاہ ظالم ہے۔ دیوار کو اس نے اس لیے درست کر دیا کہ اس کو پہلے سے معلوم ہو گا کہ اس کے نیچے یتیموں کے باپ کا رکھا ہوا مال ہے۔(۷۶) غلام کا مار ڈالنا البتہ زیادہ غور کرنے کے لائق ہے.... جس کو غلام کہا گیا ہے وہ بالغ تھا اور ڈاکے ڈالا کرتا تھا.... پس صاف ظاہر ہے کہ وہ واجب القتل تھا اور اتفاقاً اس کو مل گیا اور اس نے مار ڈالا۔"(۷۷) غرض خضر نام کا کوئی شخص موجود نہیں اور ان تمام واقعات میں کوئی ایسی بات نہیں جو عجیب ہو اور عام حالات انسانی کے مطابق واقع نہ ہوئی ہو۔(۷۸) سرسید نے اسی قسم کی تاویلیں حضرت عیسیٰ کے معجزات کے متعلق بھی کی ہیں۔(۷۹)

اصحاب کہف کے بارے میں انہوں نے لکھا ہے کہ ایک عام واقعہ ہوا تھا اور بعد میں

اس کے ساتھ لوگوں نے قصے کہانیاں وابستہ کر دیں۔ آیت میں ہے کہ "اے محمد! کیا تو نے سمجھا ہے کہ اصحاب کہف اور رقیم میری عجیب نشانیوں میں تھے...." آیت میں اس کے عجیب ہونے کی نفی سے یہ مراد ہے کہ وہ ایک معمولی واقعہ ہے جو انسانوں پر گزرا ہے۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔(۸۰)

غرض اس طرح بے شمار خیالات سرسید احمد خاں کی تحریروں میں موجود ہیں جن میں تمام خارق عادت اور مافوق الفطرت چیزوں کی عقلی توجیہ کی گئی ہے اور ان سب کی تہ میں ایک ہی بات چھپی ہوئی ہے کہ کہیں جدید تعلیم کے سبب لوگ مذہب سے بالکل ہی باغی نہ ہو جائیں۔ مگر سرسید احمد خاں ان تحریروں کے منطقی نتائج تک نہیں جاتے۔ جب کائنات اٹل قانون قدرت کے مطابق چل رہی ہے تو خدا کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے؟ اگر کسی خارق عادت چیز کا وجود نہیں اور نہ ہو سکتا ہے تو لوگوں کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ اس خدا کی رضا کے لیے اپنے آپ کو ڈھالیں جو محض "سبب اول" ہے اور کائنات کے نظام میں ایک فعال قوت نہیں ہے۔ لوگوں کے لیے' خواہ وہ جدید تعلیم یافتہ افراد ہوں یا قدیم' اگر مذہب کی کوئی اہمیت ہو سکتی ہے تو محض ایک قادر مطلق خدا کے احساس سے۔ اگر یہ تصور درمیان سے اٹھا دیا جائے اور لوگوں سے کہا جائے کہ: محض نیکی کی خاطر نیکی کرو اور برائی سے باز رہو' تو بہت سی باتیں جو از روئے مذہب نیک ہیں' متنازعہ فیہ ہو جاتی ہیں۔ ایک لامذہب شخص کا ضابطہ اخلاق ایک مذہبی شخص کے ضابطہ اخلاق سے سراسر مختلف ہو سکتا ہے بلکہ اگر کوئی سرے سے اخلاق پر اعتماد ہی نہ رکھتا ہو تو اسے قایل نہیں کیا جا سکتا۔ ان بحثوں سے سرسید احمد خاں کا مقصد لوگوں کو گمراہی سے بچانا اور دین کے دائرے میں رکھنا ہے مگر ان کا نتیجہ مذہب سے آزادی کی صورت میں نکلتا ہے۔

اکبر الہ آبادی سرسید کے ان مذہبی نظریات میں سے بیشتر کو غلط سمجھتے تھے۔ ایک شعر میں سرسید کی تفسیر کے متعلق کہتے ہیں:

سحر مسلم شکایت با خدا کرد
کہ تفسیرش بما دیدی چہا کرد

ایک اور جگہ طنزیہ انداز میں لکھتے ہیں:

میری قرآن خوانی سے نہ ہوں یوں بد گماں حضرت
مجھے تفسیر بھی آتی ہے' اپنا مدعا کہئے

اس طرح خضر کے متعلق سرسید کی رائے کا ایک مضمون میں مضحکہ یوں اڑایا ہے:

"لوگ سچ کہتے تھے کہ حضرت خضر کی عمر بڑی ہے۔ مدت دراز سے سرسید صاحب اپنی تحقیق کی تلوار سے بہت سی مذہبی چیزوں کو ملک عدم کی طرف کھٹا کھٹ بھیج رہے ہیں لیکن حضرت خضر ابھی تک بچے ہوتے تھے۔ نہیں معلوم سید صاحب کی فروگذاشت تھی یا حضرت خضر کی روپوشی، بہرحال بھاگے ہوئے ضرور تھے۔ "تہذیب الاخلاق" کی پہلی جلد میں ایک مضمون دیکھا "خضر کوئی چیز نہیں" لیجئے اتنے دنوں تک تو حضرت خضر زندہ رہنے پائے اور صرف اب عالم موجودات سے سدھارنے پر مجبور ہوئے۔" (۸۱)

اکبر سرسید کے ان نظریات کے علمی پہلوؤں کی طرف بہت کم التفات کرتے ہیں۔ وہ محض ان کے نتائج کو بنیاد بنا کر تنقید کرتے ہیں کیونکہ ان کے نتائج جو نکل رہے تھے، وہ ہر طرح سے حوصلہ شکن تھے۔ لوگ مذہب سے برگشتہ ہوئے جاتے تھے اور بزرگان دین کی عزت و تکریم سے غافل۔ اکبر سمجھتے تھے کہ مسلمان قوم پر اس قدر نازک دور آ چکا ہے کہ اس وقت اس طرح کی مذہبی بحثوں کو چھیڑنا نامناسب ہے۔ قوم کی حالت ایک مردے کی سی ہے یا زیادہ سے زیادہ ایک نہایت ضعیف مریض کی۔ اس ضعیف مریض کو تندرست کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کا دل اطاعت الٰہی سے قوی کیا جائے۔ اس صورت میں ممکن ہے یہ بچ نکلے مگر مذہبی بحثوں اور موشگافیوں سے اس کی وفات یقینی ہو جائے گی۔ اکبر چاہتے تھے کہ سرسید لوگوں کو اطاعت الٰہی کی طرف راغب کریں اور اس قسم کی بحثیں نہ چھیڑیں:

بحث سے پھیر کے طاعت پہ کریں دل کو رجوع
پیر وہ ہیں کہ جو ہوں اہل کرامات ایسے

مگر یہاں یہ حالت تھی کہ عقیدوں کی اصلاح پر زور تھا، ترمیم ملت کا ہنگامہ تھا اور اس بات کا خیال نہیں تھا کہ جاں بلب قوم اس بڑے آپریشن سے جانبر بھی ہو سکے گی یا نہیں:

ادھر خیال نہیں مصلحان نیشن کا
کہ فرط ضعف نہیں وقت آپریشن کا

بہرحال سرسید نے یہ عمل جراحی کیا اور نتیجہ سب کے سامنے ہے۔ لوگ اصلاح مذہب کی بجائے مذہب ہی کو ترقی کے لیے سد راہ سمجھنے لگے اور دوسری قوموں کی تقلید اور درآمدی نظریات کو قبول کرنے پر فخر کرنے لگے۔ اکبر نے اس کے نتائج اسی زمانے میں دیکھ لیے تھے۔ چنانچہ سب نے دیکھا کہ جلد ہی لوگ سرسید کی قائم کردہ حدود کو توڑ کر کہیں آگے نکل گئے:

گزشتہ آں قدر یاراں زحد سید اے اکبر
کہ آں مرحوم اکنوں درشمار شیخ می آید

ان باتوں کے صریحاً دو نتیجے نکلے یعنی لوگوں نے کفر و الحاد قبول کر لیا اور بعض لوگ مذہبی قیدوں کے اٹھ جانے سے انگریزوں کے نقال بن گئے۔ اکبر لکھتے ہیں :

کر گئے تھے حضرت سید عقیدوں کو درست
چرخ نے رسموں کا بھی آخر صفایا کر دیا

کچھ خاک میں ملیں گے تو کچھ ہوں گے جزو غیر
یہ مسئلہ صحیح ہے گو دل خراش ہے

مذہب کو لیا تو بحث میں سر ٹوٹا
چاہی اصلاح تو خدا ہی چھوٹا

اس فرقہ نو کو میں نے دیکھا اکبر
اسلام ان کی نظر میں ملحوظ نہیں

اکبر کو سرسید احمد خاں سے ایک شکایت یہ تھی کہ انہوں نے علی گڑھ کے تعلیمی مرکز کو مسلمانوں کی ظاہری چمک دمک اور دنیوی ترقی تک محدود کر دیا ہے۔ وہاں طلبہ کو ظاہری ٹیپ ٹاپ اور انگریزی وضع قطع اور انگریزی کھیلوں وغیرہ کا شائق بنایا جاتا ہے مگر انہیں اچھے انسان نہیں بنایا جاتا۔ وہ علم کے شائق نہیں بنتے۔ انہیں عملی زندگی کی تربیت بھی نہیں دی جاتی۔ صرف انہیں معمولی ملازمتوں کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ کالج کا ایک بڑا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو انگریزوں کے قریب لایا جائے اور ان کے لیے کچھ مراعات حاصل کی جائیں۔ اس وجہ سے سرسید نے پرنسپل اور سینئر اساتذہ ہمیشہ انگلستان سے بلوائے اور انہیں بڑی بڑی تنخواہوں پر ملازم رکھا۔ ان اساتذہ کا بھی اپنا ایک مقصد تھا اور وہ یہ تھا کہ مسلمانوں کو انگریزوں کا مکمل وفادار بنا دیا جائے۔ چنانچہ طلبہ کی تربیت اس ڈھب پر کی جاتی تھی کہ وہ اپنی فلاح کو انگریزی حکومت کے دوام سے وابستہ سمجھیں۔ ذیل میں "ہسٹری آف ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ" مصنفہ بھٹناگر سے بعض اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں

جو علی گڑھ کالج کے ماحول کی وضاحت کرتے ہیں اور وہاں کے فارغ التحصیل طلبہ کے مزاج کو ظاہر کرتے ہیں:

The exterior adjuncts of Western Culture seemed to abide, while education tended to become a tool for securing jobs. The responsibility for this develoment lies with the European staff which was mainly interested in games, dinning halls, the Union Club and other social activites....

The british officers flattered the students of the college by appreciating their Western outlook. In 1888, Sir Aukland Calvin, the then lieutenent governor of U.P. said: "The students of Aligarh have the same traits as the students of the British public schools and Universities. They have fashioned themselves on British desires and they naturally expect us to appreciate it. (82)

For Sir syed, loyalty to British government was one of the means for the achievement of educational progress.... In Beck's case loyalty to British government was the end of the education of Mohammadans, the means to keep them loyal since English education secured jobs and brought honour. (83)

Sir syed was fascinated by the personality of Beck while Beck looked upon Sir syed as a good medium through whom he could work for the empire. (84)

کالج کے ایک پرنسپل مارسن(۸۵) نے انتظامیہ سے اختلاف کی وجہ سے استعفا دے دیا۔ اس واقعے کے متعلق میرولایت حسین اپنی یادداشتیں قلمبند کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

Morrison would have been obliged to withdraw his resignation had a concerted action been taken. But Sahibzada Aftab Ahmad Khan told Mir Sahib that Morrison was not loyal to Muslims and only

watched the interst of the British Government. He was happy that Morrion was leaving.(86)

سر رضا علی تحریر کرتے ہیں:

"میرے زمانے میں علی گڑھ میں کرکٹ اور فٹ بال کھیلنے والوں کی خاص قدر تھی- ادبی مذاق پیدا کرنے یا طلبہ کا علمی ذوق بڑھانے یا ان کی ہمت بندھانے کا خیال نہ اساتذہ کو تھا' نہ ٹرسٹیوں کو- خود مسٹر بیک کھلم کھلا فرماتے تھے کہ رنجیت سنگھ جی(۸۷) (کرکٹ کے مشہور کھلاڑی جو بعد میں نوانگر کے مہاراجہ ہوئے) دادا بھائی نورو جی (پارلیمنٹ کے پہلے ہندوستانی ممبر) سے کہیں زیادہ قابل قدر ہیں- مسٹر بیک کے چہیتے طلبہ سب کھلاڑی تھے.... ادبی ذوق رکھنے والے طلبہ کی موجودگی صرف روا رکھی جاتی تھی- وہ کسی تحسین و آفرین کے مستحق نہ سمجھے جاتے تھے- مولوی عزیز مرزا مرحوم اور خواجہ غلام الثقلین مرحوم اپنے اپنے دور کے بہترین علمی اور ادبی مذاق رکھنے والے طالب علم تھے- ہم عصر ان دونوں صاحبوں کی بڑی قدر کرتے تھے مگر کالج کے ارباب حل و عقد کی آنکھوں میں ہمیشہ کھٹکتے ہی رہے- غلام حسین مرحوم بھی جب تک علی گڑھ میں رہے' مورد عتاب ہی رہے- مولانا محمد علی کی جو تھوڑی بہت قدر ان کی طالب علمی کے زمانے میں تھی' وہ ان کی ذاتی قابلیت کے باعث نہ تھی بلکہ مولانا شوکت علی (کرکٹ کے مشہور کپتان) کے بھائی ہونے کی وجہ سے تھی- جسم کی تربیت نہایت ضروری چیز ہے مگر کھیل کود ذریعہ ہے ایک مقصد حاصل کرنے کا... اصل مقصد کو چھوڑ کر ذریعے کو خود مقصد بنا لینا بالکل غلط طریقہ ہے- مگر یہ طریقہ میرے زمانے میں علی گڑھ کی مقدس روایات میں داخل تھا(۸۸)-"

آرچ بولڈ کے زمانے تک' ظاہر داری کی حد تک ہی سہی' کالج کی انتظامیہ مسلمانوں کے بارے میں کوئی توہین آمیز بات نہیں کرتی تھی مگر بعد میں اس قسم کے بہت سے واقعات ہوئے جو مسلمانوں کی توہین اور تذلیل کی خاطر جان بوجھ کر کیے گئے- قائم مقام پرنسپل Cornah کے متعلق یہ سطور ملاحظہ ہوں:

Cornah used to make silly and offensive remarks in the class,e.g. speaking of the Sultan of Turkey he said, If I had the power I would make Abdul Hamid the Sultan of Turkey, my fan-puller- the pankha, coolie.(89)

اسی طرح ایک اور پرنسپل کا یہ حال تھا:

Mr. Towel made students and their Indian colleagues wait for long hours in his veranda, If they ever went to see him at his residence. Such insulting behaviour was a common recurrence. (90)

کالج سے جو نتائج ظاہر ہوئے ان میں سے ایک نتیجہ یہ بھی تھا:

We find Dr. Ziauddin Ahmad, the officiating principal, complaining in May 1913: "The young men do not show reverance to elderly persons who have grown grey in the service of the community." Mr. Badruddin who passed his B.A. in 1910 writes: "The students have taken to make fun of the old fashioned and religious minded persons. They try their wit on those who do not put on western dress but keep beards.(91)

اور دوسرا نتیجہ یہ:

Sayed Iqbal Hassan Shad, an old boy, wrote from Edinburgh, on December 5, 1917, to the Editor of Aligarh monthly: "Remembering my Aligarh days I feel that every student should remember that to pass B.A, M.A. is not his sole aim. Humour, games and sports in most cases become the be all of an Aligarh student. I, too have had the same view. But my eyes are now opened.(92)

اس بحث سے یہ نتائج نکلتے ہیں کہ علی گڑھ کالج کے قیام سے سرسید کا مقصد مسلمانوں کو ملازمتیں دلانا تھا۔ اور انگریزوں کا مقصد مسلمانوں کو برطانوی سرکار کی وفادار رعایا بنانا تھا۔ کالج میں زیادہ زور تعلیم و تدریس کی بجائے کھیل تماشوں اور غیر نصابی سرگرمیوں پر دیا جاتا تھا، اس لیے طلبہ امتحانات پاس تو کر لیتے تھے مگر ان قابلیت میں پیدا نہیں ہوتی تھی۔ وہ لباس، گفتگو اور عادات میں انگریزوں کی تقلید کو باعث فخر سمجھتے تھے اور اپنی قوم کے پرانی وضع کے بزرگوں کا مذاق اڑاتے تھے۔

ان اقتباسات کو پڑھ کر علی گڑھ کے متعلق اکبر کی تنقید پڑھی جائے تو وہ مبنی بر

انصاف نظر آنے لگتی ہے۔ اکبر کو بھی علی گڑھ کے ادارے پر زیادہ تر اسی قسم کے اعتراضات ہیں وہ علی گڑھ کے قیام کو محض حصول ملازمت کا ذریعہ قرار دیتے ہیں:

میں کیا کہوں احباب کیا کار نمایاں کر گئے
بی۔ اے کیا نوکر ہوئے پنشن ملی اور مر گئے

ہاں علی گڑھ کی بھی تم تشبیہ لو
اک معزز پیٹ بس اس کو کہو

ایمان بیچنے پہ ہیں اب سب تلے ہوئے
لیکن خرید ہو جو علی گڑھ کے بھاؤ سے

تکمیل میں ان علوم کے ہو مصروف
نیچر کی جو طاقتوں کو کر دیں مکشوف
لیکن تم سے امید کیا ہو کہ تمہیں
عہدہ مطلوب ہے وطن ہے مالوف

کالج کے انگریز شاف کا مقصد جدید تعلیم یافتہ لوگوں کو اپنا مقلد اور سرکار انگریزی کی وفادار رعایا بنانا تھا۔ اس کا ذکر بھی کلام اکبر میں متعدد جگہ ہوا ہے:

اک انگریز نے بات یہ کہہ دی
جس نے ترقی وہ دی یہ دی
اس بازی کی ہمیں نے شہ دی
کیسے سید، کیسے مہدی

علی گڑھ کو شرف بخشا ہے اقبال نصاریٰ نے
کہ جو مسلم اٹھا شوق ترقی میں یہیں آیا

اب انہی کے کوچے کی دھوم ہے، نہیں کرتا ذکر ارم کوئی
انہیں ضد بھی تھی اسی بات کی کہ نہ ذکر باغ ارم رہے

تعلیم جو دی جاتی ہے ہمیں وہ کیا ہے فقط بازاری ہے
جو عقل سکھائی جاتی ہے وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے

طلبہ انگریزوں کے نقال، ملت کے نکتہ چیں اور اپنے بھائیوں کے ہزال بن گئے۔ اپنی تاریخ، روایات، لباس، زبان اور مذہب سے نفرت کرنے لگے:

اپنے بھائی کے مقابل کبر سے تن جایئے
غیر کا جب سامنا ہو بس قلی بن جایئے
فلسفہ الحاد کا کر لیجئے فوراً قبول
مذہبی محفل میں لیکن مثل دشمن جایئے

کیا کہوں اس کو میں بدبختی نیشن کے سوا
اس کو آتا نہیں اب کچھ امیٹیشن کے سوا

سوپ کا شائق ہوں یخنی ہو گی کیا
چاہیے کٹلٹ، یہ قیمہ کیا کروں
لیتھ برج کی چاہیے ریڈر مجھے
شیخ سعدی کی "کریما" کیا کروں

انکار نہیں نماز روزے سے مجھے
لیکن یہ طریق اب ہے فیشن کے خلاف

مذہب چھوڑو ملت چھوڑو صورت بدلو عمر گنواؤ
صرف کلرکی کی امید اور اتنی مصیبت توبہ توبہ

چھوڑ لٹریچر کو اپنی ہسٹری کو بھول جا
شیخ و مسجد سے تعلق ترک کر اسکول جا
چار دن کی زندگی ہے، کوفت سے کیا فائدہ
کھا ڈبل روٹی، کلرکی کر، خوشی سے پھول جا

غرض خلاصہ کلام بقول اکبر یہ ہے کہ قوم سمجھنے لگی ہے:

موقع بحث نہیں صاحب اقبال ہیں آپ
میری ہر بات بری آپ کی ہر بات اچھی

علی گڑھ کالج محض ایک تعلیمی ادارہ نہیں تھا بلکہ یہ سرسید احمد خاں کے سیاسی فلسفے کا حصہ تھا۔ واضح کیا جا چکا ہے کہ سرسید احمد خاں کو خوف تھا کہ انگریز ہندوستان سے کبھی نہیں جائیں گے۔ اگر مسلمانوں نے بغاوت کرنے کی کوشش کی تو ان کا حشر پھر ۱۸۵۷ء کا سا ہو گا۔ اس سیاسی فلسفے کی رو سے مسلمانوں کو بچانے کا صرف یہی طریقہ رہ گیا تھا کہ انہیں انگریزوں کے زیادہ سے زیادہ قریب لایا جائے۔ چنانچہ لائل محمڈنز آف انڈیا سے لے کر تہذیب الاخلاق تک یہی احساس کام کر رہا تھا۔ اکبر الہ آبادی اس بات کو قبول نہیں کرتے تھے کہ انگریز مسلمانوں کے ہمدرد ہو سکتے ہیں۔ وہ انگریزوں کے مسلمانوں کی طرف اس جھکاؤ کو عارضی اور سیاسی حکمت عملی کے تابع سمجھتے تھے اور ان لوگوں کو بے بصر قرار دیتے تھے جو انگریزوں کو اپنا دوست سمجھتے ہیں کیونکہ ان کے خیال میں انگریز مسلمانوں سے دلی نفرت اور کینہ رکھتے ہیں۔(۹۳) بدیں سبب شملہ وفد کے اظہار خیر خواہی کو وہ مسلمانوں کی غلط حکمت عملی سمجھتے تھے:

دو روزہ پالسی نے اس طرف سے تقویت دے دی
ادھر بجنے لگا فتح و ظفر کا پھر تو نقارا
ڈنر، عہدے، تبسم، مشورے، وعدے بنے گیسو
وہ گیسو جس سے پھیلی بوئے مست عنبر سارا
وہ ٹوٹے، یہ گرے، وہ پھیلے، یہ چت، ان کو غش آیا
نہ ایمان میں رہی طاقت، نہ دل میں ضبط کا یارا

ڈیپوٹیشن کی سرسبزی جو دیکھی اس نے شملے میں
برہمن نے کہا یہ شاخ بید اور ایسے گملے میں
کہا مہدی نے بھائی تم کو کیوں اس درجہ حیرت ہے

کہا مہدی نے بھائی تم کو کیوں اس درجہ حیرت ہے
تمہارے واسطے یہ کیا محل رشک و غیرت ہے
تعجب کیا ہے ہم اس بت کے پہلو میں جو لیٹے ہیں
حرم کے محترم کیا دیر کے خادم سے ہیٹے ہیں
برہمن نے کہا بس آپ کی باتیں ہی باتیں ہیں
اجی یہ وصل کی راتیں نہیں ہیں ان کی گھاتیں ہیں
کہا مہدی نے ہم کو تو مزے سے اپنے مطلب ہے
محبت ہو نہ ہو ان کو امید اس کی یہاں کب ہے
برہمن نے کہا ایسا مزا اعضا کا مضعف ہے
کہا مہدی نے ہاں اس بات سے بندہ بھی واقف ہے

انگریز' ہندو اور مسلمان

اکبر ہندوؤں کے بھی مزاج شناس تھے۔ مسلمانوں سے انہیں جو نفرت ہے وہ اسے خوب سمجھتے تھے۔ انگریزوں کے بعد پورے ملک پر حکمرانی کا جو خواب ہندو دیکھ رہے تھے' اکبر اس سے بھی آگاہ تھے۔

اردو ہندی کا تنازعہ ان کی زندگی میں بڑے زور و شور سے اٹھا تھا۔ اس میں ہندوؤں کے تعصب کا مظاہرہ انہوں نے دیکھا تھا:

شیخ صاحب برہمن سے لاکھ برتیں دوستی
بے بھجن گائے تو مندر سے ٹکا ملتا نہیں

پالیسی مسلم کی دیکھی اور ہندو کی ترنگ
اس میں ہے اکثر رکاکت یہ ہے اکثر خوفناک

حکم انگلش کا' ملک ہندو کا
اب خدا ہی ہے بھائی صلو کا

پھر بھی وہ ہندوؤں کے ساتھ اتحاد کو انگریزوں کی خوشامد سے بہتر سمجھتے تھے۔ اس سلسلے میں وہ جمال الدین افغانی کے قریب آ جاتے ہیں جو انگریزوں کے خلاف ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے۔ اکبر کے اس خیال کا اظہار ذیل کے دو اقتباسات میں وضاحت سے ہوا ہے:

امور ملکی کی بحث میں تم جو ہندوؤں کے بنو گے ساتھی
نہ لاٹ صاحب خطاب دیں گے، نہ راجہ جی سے ملے گا ہاتھی
نہ اپنا مکھن وہ تم کو دیں گے، نہ اپنی پوری وہ بانٹ دیں گے
پڑے گا موقع جو کوئی آ کر تو دونوں ہی تم کو چھانٹ دیں گے
مگر وہ رہتے ہیں دور تم سے، یہ لوگ ساتھی ہیں اور پڑوسی
ملے جلے ہیں سوسائٹی میں اہیر ان میں تو ہم میں گھوسی
ہزل کو اپنی جو چھوڑ کر تم انہی کی شرکت کرو زٹل میں
تو یہ تو کوئی نہ کہہ سکے گا تمہارے دشمن کہاں بغل میں
نہ ہو گی حکام کو بھی دقت جو ہو گی اک جا ہر اک کی خواہش
ضرورت ان کو بھی یہ نہ ہو گی کریں ہر اک سے علیحدہ غرفش

زیادہ ان سے رہو محترز کہ ہندو سے
یہ خود ہی سوچ لو دل میں اگر نہ کچھ کدھو
یہ چاہتے ہیں کہ ختنہ میاں کا ہو موقوف
وہ فکر میں ہیں مسلمانی ہی ندارد ہو

اگر دیسی یہی رہے تو بہرحال فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے کہ کسے ترجیح دی جائے۔ اکبر کی ترجیح کسی قدر ہندوؤں کے لیے ہے۔ عبدالماجد دریا بادی کے لفظوں میں اس کا سبب یہ ہے

"اپنی دیسی تہذیب اور دیسی حکومت، خواہ کسی ملت و فرقہ کی ہو، اغیار کی حکومت اور بیرونی تہذیب سے تو بہرحال گوارا تر ہے۔"(۹۴)

سرسید کی رائے اس کے برخلاف تھی۔ انہیں مسلمانوں کے لیے کام کرنے کا جو موقع ملا تھا، اس کی وجہ سے وہ انگریزوں کو بہتر سمجھتے تھے۔ اس حد تک سرسید ٹھیک تھے لیکن اس کے بعد اکبر جو کچھ کہتے تھے، وہ درست ثابت ہوا۔ اکبر کا خیال تھا کہ تعلیم کی تبدیلی ہمہ جہتی تبدیلی کا سبب بن جایا کرتی ہے۔ انگریزی تعلیم لوگوں کو یورپ کے نظریات سے متعارف ہی نہیں کرائے گی، مرعوب کر دے گی، کیونکہ اس کے شارحین مغربی اساتذہ ہوں گے۔ سرسید کی دوسری مصلحانہ کوشش، یعنی مذہبی اصلاح، مذہب بیزاری پیدا کرے گی۔ انگریزوں کی ہر بات کی تعریف احساس کمتری پر منتج ہو گی۔ اس آخری بات کا بہت بڑا نتیجہ یہ

نکلے گا کہ لوگ اپنے سارے تہذیبی ڈھانچے کے مخالف ہو جائیں گے۔ وقت نے بتا دیا کہ اکبر کی رائے ٹھیک تھی۔ ہم نے مغربی علوم پڑھ لیے، فلسفہ سیکھا، سائنس کی تحصیل کی مگر ایک آدمی بھی ایسا پیدا نہ کیا جو اس میں مغربی مشاہیر جتنا ممتاز ہو۔ آج تک یہی حالت چلی جاتی ہے۔ اگر کچھ ہوا ہے تو یہ کہ ہم مل، سپنسر، میکالے، بکلے، لاک، روسو وغیرہ کے اقوال اندھا دھند نقل کرنے لگے اور یہ سمجھنا شروع کر دیا کہ مغرب نے جو نظریات پیش کیے ہیں وہ حرف آخر ہیں۔ یہ خیال ہی فراموش ہو گیا کہ فلسفے میں کوئی چیز حتمی اور آخری نہیں ہوا کرتی اور سائنس کے نظریات بھی بدلتے رہتے ہیں۔ مغربی فلسفیوں کی نقالی میں "نیچر" کا لفظ تکیہ کلام بن گیا اور ڈارون کا نظریہ ارتقا لوگوں کو اس قدر پسند آیا کہ نئی روشنی والوں کا تو ذکر ہی کیا، مولانا شبلی نعمانی تک نے اس کی تائید میں مضمون لکھ مارا۔ اب فلسفہ اس زمانے سے بہت آگے نکل گیا ہے اور اس دور کے نیچرلسٹ فلسفیوں کی خامیاں بیان کی جانے لگی ہیں۔ خود یورپ کے فلسفی اس فلسفے کی درستی کے قائل نہیں رہے۔ مثلاً برٹرینڈرسل نے لکھا ہے کہ نیچر اور لاء آف نیچر کی اصطلاحوں کا کوئی واضح مفہوم ان فلسفیوں کے ہاں موجود نہیں، اور جو کچھ وضاحت انہوں نے کی ہے اس میں تضادات ہیں۔(۹۵) اسی طرح جدید سائنس نے بھی انیسویں صدی کی سائنس کے بہت سے نظریات غلط ثابت کر دیے ہیں۔ ریاضی اور سائنس میں اب اس قدر اضافے ہوئے ہیں کہ انیسویں صدی کی سائنس اس کے مقابلے میں عجائب گھر میں رکھنے کی چیز ہو گئی ہے۔ سائنس نے اتنی ترقی کی ہے مگر اب سائنس دانوں کا لہجہ بدل گیا ہے۔ پہلے سائنس کو حتمی چیز سمجھا جاتا تھا مگر اب سائنسی نظریات کے متعلق خود سائنس دانوں کا یہ خیال ہوتا جاتا ہے کہ کسی چیز کو یقینی اور حتمی نہیں کہا جا سکتا۔ مثلاً دنیا کے آغاز کے متعلق سائنس کے مختلف نظریات کے بارے میں ایک برطانوی سائنس دان لکھتا ہے:

None is better than the other. You the reader, can choose the one you like best or you can reject them all. (96)

اسی طرح دنیا کے ابتدائی ایام کی تاریخ کے بارے میں ایک سائنس دان کہتا ہے:

While knowledge of the earth's size and shape is as ancient as Geometry and as modern as Cape kennedy's rockets, man's understanding of the planet's origin and its exact composition is notoriously imprecise...

How continents came into being... is one of the most difficult questions that one can ask about the earth... There are many more hypotheses than there are continents-nearly as many as there are geologists.(97)

ان آرا کی روشنی میں دنیا کی قدیم ترین تاریخ سے تعلق رکھنے والے معجزات مثلاً طوفان نوح اور لوط کی قوم پر نازل ہونے والے عذاب اور اس قبیل کے دوسرے واقعات سے انکار کرنا نامناسب معلوم ہوتا ہے۔ مگر سرسید احمد خاں اپنے دور کی سائنس اور فلسفے کے بارے میں اس غلط فہمی کا شکار ہو گئے کہ یہ حتمی اور ناقابل تغیر ہیں اس لیے قرآن کو اس کے مطابق ثابت کرنا ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بنیاد ہی غلط ہے۔

اکبر الہ آبادی کو یقین کامل ہے کہ سائنس کے نظریات تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ ہر نیا نظریہ پرانا ہو جاتا ہے اور ہر انقلاب فرسودہ ہو جاتا ہے:

بنائے کار جہاں کو خراب ہی دیکھا
ہمیشہ ہم نے یہاں انقلاب ہی دیکھا
ہم انقلاب کے شائق نہیں زمانے میں
کہ انقلاب کو بھی انقلاب ہی دیکھا

گھر کا چراغ دیکھو یعنی کہ دل سنبھالو
کوئی انار دم بھر گل ریز ہے تو پھر کیا
تعجب انقلابوں کا ہے کیا اس دور گردوں میں
یہاں تو رات دن ہے شب کا دن اور دن کا شب ہونا

اس سے یہ خیال کرنا کہ اکبر سائنس کے مخالف ہیں، صحیح نہ ہو گا۔ اکبر مغربی فلسفے کے تو سخت مخالف ہیں(۹۸) اور اسے گمراہی کا باعث قرار دیتے ہیں درحقیقت نیچریت اور انتفاعیت کے فلسفے ہیں بھی اسی قسم کے، مگر سائنسی ترقیات کے وہ مخالف ہرگز نہیں۔ بعض لوگوں کے یہ اعتراض کہ وہ ٹائپ کے حروف، پائپ کے پانی، انجن، ڈارون کے نظریہ ارتقاء، برقی لیمپ اور بائیسکل وغیرہ کے مخالف ہیں، محض سطحی نظر سے کلام اکبر کے مطالعے کا نتیجہ ہیں۔ اکبر کے ہاں ان میں سے بہت سے الفاظ محض مغربی غلبے یا تہذیب کی علامت

کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں سے بالخصوص ریل اور انجن کا لفظ اسی علامتی مفہوم میں بار بار استعمال ہوا ہے، مثلاً ذیل کے شعروں میں:

مذہب چھڑایا عشوۂ دنیا نے شیخ سے
دیکھی جو ریل اونٹ سے آخر اتر گئے

مشینوں نے کیا نیکوں کو رخصت
کبوتر اڑ گئے انجن کی پیں سے

اس میں کبوتر کا لفظ تہذیب اسلامی کے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ حرم کعبہ پر بہت سے کبوتر بیٹھتے ہیں، اس لیے اس پرندے کو تقدس سا حاصل ہو گیا ہے اور لوگ سمجھتے ہیں کہ کبوتر خدا کی حمد و ثنا کرتا ہے۔ اس کے برخلاف انجن کو شور و شر وغیرہ کی وجہ سے اور بالخصوص اس سبب سے کہ یہ مغرب کا آوردہ ہے، مغربی تہذیب کی علامت بنایا گیا ہے۔ شعر کا مفہوم فقط اس قدر ہے کہ مغربی تہذیب نے مشرقی تہذیب کو فنا کر دیا ہے۔ ڈارون کا نظریہ ارتقا سائنس کا محض ایک نظریہ ہے، قانون نہیں۔ اکبر کے زمانے میں بھی اور آج کل بھی یورپ کے بہت سے ماہرین حیاتیات اس نظریے کو جزوی یا کلی طور پر صحیح نہیں سمجھتے۔ اس لیے اس کے خلاف لکھنا رجعت پسندی کی علامت نہیں بلکہ اس پر شدید اعتراضات کرنا ذہنوں سے مغربی غلبے کو کم کرنے کی ایک سود مند کوشش تھی۔ ٹائپ کے حروف اور پانی کے پائپ کا ذکر صرف ایک شعر میں ہوا ہے:

حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا
پانی پینا پڑا ہے پائپ کا

آج بھی اچھے پڑھے لکھے ٹائپ کے ٹیڑھے میڑھے حروف پر نستعلیق کو ترجیح دیتے ہیں، حالانکہ اس وقت جو ٹائپ ہمارے پریسوں میں استعمال ہوتا ہے، وہ انیسویں صدی کے ٹائپ سے بدرجہا خوبصورت ہے۔ اگر پچھلی صدی کے ٹائپ کی کتابیں آج دیکھی جائیں تو وہ اس درجہ ناگوار معلوم ہوتی ہیں کہ ایک دو صفحے بھی پڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ علاوہ ازیں ٹائپ کے حروف چھپنے میں ٹوٹ جاتے ہیں اور طباعت کے دوران بہت سی اغلاط کتابوں میں راہ پا

جاتی ہیں-(۹۹) پانی کے پائپ اس زمانے میں نئے نئے لگائے گئے تھے- دستی ہمپوں کے سردیوں میں گرم اور گرمیوں میں خنک اور ہمہ وقت ملنے والے پانی کے مقابلے میں اگر پائپ کا پانی ابتدا میں لوگوں کو ناگوار معلوم ہوا تو تعجب کی بات نہیں ہے- آج تک پائپوں کے پانی کے سلسلے میں اخباروں کے مزاحیہ کالم لکھے جاتے ہیں' اس وجہ سے اکبر کو مطعون کرنا کچھ درست معلوم نہیں ہوتا-(۱۰۰) برقی لیمپ میں زیادہ دیر تک پڑھنا بینائی کو خراب کرتا ہے- تیز روشنی کا بینائی پر اثر پڑنا ضروری ہے- یہ ہر طالب علم کا تجربہ ہے کہ برقی لیمپ کی روشنی میں متواتر کئی گھنٹے پڑھنے سے نظر دھندلا جاتی ہے- بائیسکل کی مخالفت کا اور تو کوئی ثبوت نہیں' محض ایک چٹکلہ ہے جو اکبر نے بیٹھے بیٹھے اختراع کر لیا- وہ واقعہ اس طرح ہے کہ قمرالدین بدایونی مصنف "بزم اکبر" سائیکل سے گر گئے تھے- جب اکبر کو یہ بات معلوم ہوئی تو فرمایا:

> "بائیسکل تو دیکھو مجسم روگ ہے- مرض بائی (Buy) سے شروع ہوتا ہے' پھر سک (Sick) ہوتا ہے اور پھر ال (ill) ہوتا ہے- یوں لفظ "بائی سک ال" بنتا ہے-(۱۰۱)"

ظاہر ہے یہاں بائیسکل کی مخالفت نہیں کی گئی' محض تفنن طبع کے طور پر بات سے بات پیدا ہو گئی ہے- آل احمد سرور' علامہ اقبال جیسے انتہائی سنجیدہ شخص کی مدافعت میں اس بات کو دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں کہ "سینکڑوں باتیں تفریح طبع کے طور پر کہی جاتی ہیں-"(۱۰۲) مگر اکبر پر قدامت پسندی کا اعتراض کرتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں کہ ظریف شاعر ہونے کی وجہ سے اکبر کو تفنن طبع کا دوہرا حق حاصل ہے-

نظریاتی افراط و تفریط

اکبر کے ایک اہم موضوع کو نقادوں نے بالکل ہی نظر انداز کر دیا ہے- وہ ہے نظریاتی افراط و تفریط کی مخالفت- اگر اس بارے میں اکبر کے خیالات کو مدنظر رکھئے تو یہ خیال خود بخود باطل ہو جاتا ہے کہ وہ رجعت پسند اور ماضی پرست ہیں بلکہ وہ اپنے کلام میں ہر نئی چیز کی نقالی کی مذمت کرتے ہیں اور ہر پرانی چیز پر جم کر بیٹھ رہنے کو قابل ملامت سمجھتے ہیں- اس سلسلے میں ان کے ہاں واعظ اور مسٹر دونوں قابل مذمت قرار پاتے ہیں- ایک واقعہ

درج کیا جاتا ہے جس سے بالواسطہ طور پر پرانے نظام تعلیم کے متعلق ان کے خیالات معلوم ہوتے ہیں۔ مولانا صبغۃ اللہ فرنگی محل اپنے دادا کے ہاں اکبر سے اپنی ملاقات اور گفتگو کا قصہ یوں بیان کرتے ہیں :

"دیر کے بعد جب مہمان (اکبر) رخصت ہونے لگا تو میزبان کی طرف سے نان و نمک کا اصرار شروع ہوا کہ کل یا پرسوں وہ کھانا یہیں کھائیں۔ مہمان اپنی صحت کی خرابی کا گھڑی گھڑی عذر پیش کرتا اور میزبان تکلف نہ کرنے کا وعدہ کر کے اسے مطمئن کرنا چاہتا۔ آخر میں مہمان نے کہا : "بہتر ہے' میں کھانا کھاؤں گا بشرطیکہ تمہارے یہاں درس نظامی نہ ہو۔" میزبان : درس نظامی کیا؟" مہمان : "یعنی وہی مقررہ غذائیں جو غدر کے پہلے سے چلی آتی ہے— مزعفر' پلاؤ' کباب' قورمہ اور شیر مال وغیرہ— درس نظامی کے پشتینی علم برداروں کے سامنے یہ طنز آمیز تشریح لاکھ تکلیف دہ ہو' لیکن اتنی انوکھی اور اتنی لطیف تھی کہ یہ نوجوان مدرس درس نظامی بھی مسکرانے لگا۔"(۱۰۳)

اکبر کے اشعار میں بھی قدیم اور جدید پر تنقید کا یہی رنگ ہے۔ ملاحظہ ہو :

سچ یہ ہے کہ واعظ مجھے بھاتا ہے نہ اکبر
وہ خبط ہی اچھا نہ یہ شوریدہ سری خوب

پرانی روشنی میں اور نئی میں فرق ہے اتنا
اسے کشتی نہیں ملتی' اسے ساحل نہیں ملتا

نہ نرے اونٹ ہو' نہ ہو بلڈاگ
نہ تو مٹی ہی ہو' نہ تم ہو آگ

واعظ و ناصح کورانہ تقلید اور غرور و کبر کے باعث قابل ملامت ہیں :

ہے نشۂ غرور میں زاہد خراب تر
پھر کیا میں اعتراض کروں مے پرست پر

مولوی بحث میں نہ ہاریں گے
جان ہاریں گے، جی نہ ہاریں گے

واعظ تو بناتے ہیں مسلماں کو کافر
افسوس یہ کافر کو مسلماں نہ کریں گے

اور ایک قطعے میں تو صاف صاف دونوں گروہوں پر تنقید کی ہے اور دونوں کو "مجنون قوم" کے لیے بلائے جان قرار دیا ہے اور اعتدال کی تلقین کی ہے:

قدیم وضع پہ قائم رہوں اگر اکبر
تو صاف کہتے ہیں سید یہ رنگ ہے میلا
جدید طرز اگر اختیار کرتا ہوں
خود اپنی قوم مچاتی ہے شور، واویلا
جو اعتدال کی کہئے تو وہ ادھر نہ ادھر
زیادہ حد سے دیے سب نے پاؤں ہیں پھیلا
ادھر یہ ضد ہے کہ لیمنڈ بھی چھو نہیں سکتا
ادھر یہ دھن ہے کہ ساقی صراحی مے لا
ادھر ہے دفتر تدبیر و مصلحت ناپاک
ادھر ہے وحی ولایت کی ڈاک کا تھیلا
"غرض دو گونہ عذاب است جان مجنون را
بلائے صحبت لیلیٰ و فرقت لیلیٰ" (۱۰۴)

کلام اکبر میں اس موضوع کے تواتر اور تسلسل کے سبب سے اکبر کو قدیم تہذیب کا مقلد بے بصر اور رجعت پسند قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ صحیح ہے کہ ان کے کلام میں قدیم تہذیب کی مذمت کم اور جدید کی زیادہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دور کو خطرہ قدامت پسندی سے نہیں تھا، جدیدیت سے تھا اس لیے لسان العصر کا قلم جدید تہذیب کے خلاف ہی زیادہ تر سرگرم عمل ہونا چاہیے تھا۔

اس طرف اشارہ کیا جا چکا ہے کہ اکبر جدید تعلیم، فلسفے اور حکمت کی مخالفت اس لیے

کرتے تھے کہ یہ تمام اخلاقی اقدار کو ملیامیٹ کر رہی تھیں۔ ہمارا قدیم تہذیبی ڈھانچا، جو بعض دوسرے مذاہب کے مصنفین کی مخالفت بیجا کے باوجود مجموعی طور پر ہمارے اذہان میں رچا بسا ہے، وہ ٹوٹ رہا ہے اور اس کی جگہ لینے والا نظام اس سے بدتر ہے جو نفس پرستی، بے اعتدالی، بددیانتی، نقالی، ظاہرداری اور مادہ پرستی سکھا رہا ہے۔ وہ جدیدیت پر ضربیں لگاتے ہیں مگر جب دیکھتے ہیں کہ لوگوں پر اس کا اثر بھی ہوتا جاتا ہے تو آنے والی نسلوں کا مرثیہ پڑھنے لگتے ہیں۔ جو متعدد اخلاقی خرابیوں کا شکار ہو چکی ہے:

اول یہ کہ شراب عام ہو گئی ہے:

چھوڑ کر مسجدیں جا بیٹھے ہیں میخانوں میں
واہ کیا جوش ترقی ہے مسلمانوں میں

شکر خدا کہ شرم کی تکلیف سے بچے
یاروں کا اب ہجوم ہے مے کی دکان پر

دوم شراب چونکہ بے حیائی اور نفس پرستی لاتی ہے اس لیے یہ چیزیں پھیل رہی ہیں:

نفس کے تابع ہوئے ایمان رخصت ہو گیا
وہ زنانے میں گئے، مہمان رخصت ہو گیا

داغ اب ان کی نظر میں ہیں شرافت کے نشاں
نئی تہذیب کی موجوں سے دھلے جاتے ہیں

ہیں غش میں شیخ دیکھ کے حسن مس فرنگ
بچ بھی گئے تو ہوش انہیں آئے گا دیر میں

کل مست عیش و ناز تھے ہوٹل کے ہال میں
اب ہائے ہائے کر رہے ہیں ہسپتال میں

مسان خود فروش آخر فرستادند ایں بلہا
طلب کردند زر چنداں کہ خوں افتاد در دلہا

رنگ گلزار جہاں کا قدرداں مجھ سا تھا کون
جو گل رنگیں تھا وہ میرے گلے کا ہار تھا

ہر تعلق مرا سرمایہ ہے اک ناول کا
میری ہر رات سے ہے ایک کہانی پیدا

لوگ مادی آسائشوں اور اعلیٰ عہدوں کے لالچ میں پڑے ہوئے ہیں۔ دولت سب سے بڑی قدر بن گئی ہے۔ مادی مفادات کو مقدم ہی نہیں واحد ضرورت سمجھا جانے لگا ہے:

رشتہ در گردنم افگندہ پیٹ
می برد ہر جا کہ کیک است و پلیٹ

نہیں کچھ اس کی پرسش الفت اللہ کتنی ہے
یہی سب پوچھتے ہیں آپ کی تنخواہ کتنی ہے

ہم کو ابرو کی کجی نے مارا
شیخ صاحب کو بجی نے مارا

شوق لیلائے سول سروس نے مجھ مجنوں کو
اتنا دوڑایا لنگوٹی کر دیا پتلون کو

خواہش زر میں نئی تہذیب کے پیرو بنے
وہ نہ ہاتھ آیا مگر گنج معائب ہو گئے

تہ کرو صاحب نسب نامے وہ وقت آیا ہے اب
بے اثر ہو گی شرافت' مال دیکھا جائے گا

دیانت داری ناپید ہو رہی ہے۔ منافقت کا دور دورہ ہے' زبانیں کچھ کہہ رہی ہیں' دلوں میں کچھ ہے:

حیرت سے دیکھتا ہوں ہر صاحب خرد کو
اس کی زباں کدھر ہے اور اس کا دل کدھر ہے

مے بھی ہوٹل میں پیو' چندہ بھی دو مسجد میں
شیخ بھی خوش رہے' شیطان بھی ناراض نہ ہو

عنایت مجھ پہ فرماتے ہیں شیخ و برہمن دونوں
موافق اپنے اپنے پاتے ہیں میرا چلن دونوں

نام خدا کو اکثر زیب زباں تو پایا
عشق بتاں کو لیکن نقش قلوب دیکھا

نہ شریعت' نہ طریقت' نہ محبت' نہ حیا
جس پہ جو چاہے وہ اس عہد میں تہمت رکھے

مری ناکامیابی کی کوئی حد ہو نہیں سکتی
صداقت چل نہیں سکتی' خوشامد ہو نہیں سکتی

شہرت کے شوق میں لوگ دیوانے ہو رہے ہیں:

پبلک میں ذرا ہاتھ ملا لیجئے مجھ سے
صاحب مرے ایمان کی قیمت ہے تو یہ ہے

اپنی گرہ سے کچھ نہ مجھے آپ دیجئے
اخبار میں تو نام مرا چھاپ دیجئے

دوزخ کے داخلے میں نہیں ان کو عذر کچھ
فوٹو کوئی جو ان کا لگا دے بہشت میں

کچھ دیکھتا نہیں میں دل زار کے لیے
جو کچھ یہ ہو رہا ہے سب اخبار کے لیے

گھریلو زندگی مصروفیات کی نذر ہو گئی ہے۔ ہر فرد دوسرے سے بد گمان ہے۔ نسلی بعد پیدا ہو گیا ہے۔ باپ اور بیٹا ایک دوسرے کے حریف بن گئے ہیں۔ بیٹیاں ماؤں سے جھگڑتی ہیں' میاں اور بیوی مغربی سانچے میں ڈھل گئے ہیں:

اس سے بی بی نے فقط اسکول ہی کی بات کی
یہ نہ بتلایا کہاں رکھی ہے روٹی رات کی

خدا کے فضل سے بی بی میاں دونوں مہذب ہیں
حجاب ان کو نہیں آتا' انہیں غصہ نہیں آتا

اب تو رکھ دی گئی تہ کر کے ادب کی چادر
پہلے قبلہ تھے تو اب صرف ڈیر ہیں فادر
امر تعظیم کو اطفال نے سمجھا بادر
ماؤں کو لینے کو ہرگز نہیں جاتیں نا در
"دختراں را ہمہ جنگ است وجدل با مادر
ہیچ الفت نہ پسر را بہ پدر می بینم"

دیدنی ہے یہ تماشائے مشین انقلاب
باپ تو قبلہ تھے، بیٹا اسکوائر ہو گیا

مائی کو پوت کی اب مطلق خبر نہیں ہے
اسٹیمروں سے مل کر انداز گنگ بدلا

رنگ چہرے کا تو کالج نے بھی رکھا قائم
رنگ مذہب میں مگر باپ سے بیٹا نہ ملا

یہ سب چیزیں عارضی طور پر ہر کسی کو خوش کر سکیں تو کر سکیں، تاہم ان کا انجام افسردگی، بے اطمینانی اور نا آسودگی ہے:

حضور قلب اگر حاصل نہیں تجھ کو تعجب کیا
خدا جب دل سے غائب ہو تو دل حاضر نہیں ہوتا

فسردگی ہوئی پیدا اس انتشار کے بعد
ہزار حیف کہ فالج گرا بخار کے بعد

فلک نے مضمحل کر کے ہمیں خس کر دیا آخر
بہے جاتے ہیں بے مقصود بحر زندگانی میں

یہ اخلاق یہ روحانی بنائیں ٹوٹتی کیوں ہیں؟
یہ نفس مطمئنہ پر ہوا کیوں غالب امارہ

دل میں خوشی بہت ہے یا رنج اور تردد
کیا چیز جی رہی ہے، کیا چیز مر رہی ہے؟

ان مناظر کو دیکھ کر اکبر مایوس ہو گئے۔ انہیں مطلق امید نہیں تھی کہ قوم دوبارہ راہ راست پر آئے گی۔ ان کا خیال تھا کہ حالات روز بروز خراب سے خراب تر ہوتے رہیں گے۔ قوم کے ذہن کی تبدیلی کے بعد یہ توقع کرنا فضول ہے کہ یہ دوبارہ ترقی کرے گی:

پستی قوم کے جب آگئے دن اے اکبر
اونچے درجوں میں ہوئے عقل کے دشمن پیدا
آج ہوتا نہیں اس کا ضرر ان کو محسوس
ہو رہے ہیں ابھی کچھ لالہ و سوسن پیدا
بالیقین آئے گا اس باغ پہ ایسا اک وقت
کر چلیں گی روشیں نشتر و سوزن پیدا
صورت برگ خزاں دیدہ پھریں گے اڑتے
نہ بہار آئے گی پھر، ہو گا نہ گلشن پیدا
باپ کے خون سے ہو گی جو حمیت زائل
ہوں گے اطفال بھی بے غیرت و کودن پیدا
کاہ کی طرح سے اڑ جائیں گے دینی اعمال
اختلافات کے ہو جائیں گے خرمن پیدا
سلف ریسپکٹ کا پھر یاد رہے گا نہ سبق
پھر نہیں ہونے کی یہ بحث تو و من پیدا

یہ موجودہ طریقے راہی ملک عدم ہوں گے
نئی تہذیب ہو گی اور نئے ساماں بہم ہوں گے
بدل جائے گا انداز طبائع دور گردوں سے
نئی صورت کی خوشیاں اور نئے اسباب غم ہوں گے
نہ پیدا ہو گی خط نسخ سے شان ادب آگیں
نہ نستعلیق حرف اس طور سے زیب رقم ہوں گے
خبر دیتی ہے تحریک ہوا تبدیل موسم کی
کھلیں گے اور ہی گل زمزمے بلبل کے کم ہوں گے
عقائد پر قیامت آئے گی ترمیم ملت سے
نیا کعبہ بنے گا، مغربی پتلے صنم ہوں گے
بہت ہوں گے مغنی نغمہ تقلید یورپ کے
مگر بے جوڑ ہوں گے اس لیے بے تال و سم ہوں گے

ہماری اصطلاحوں سے زباں ناآشنا ہو گی
لغات مغربی بازار کی بھاکھا سے ضم ہوں گے
بدل جائے گا معیار شرافت چشم دنیا میں
زیادہ تھے جو اپنے زعم میں وہ سب سے کم ہوں گے
گذشتہ عظمتوں کے تذکرے بھی رہ نہ جائیں گے
کتابوں ہی میں دفن افسانہ جاہ و حشم ہوں گے
کسی کو اس تغیر کا نہ حس ہو گا نہ غم ہو گا
ہوئے جس ساز سے پیدا اسی کے زیر و بم ہوں گے
تمہیں اس انقلاب دہر کا کیا غم ہے اے اکبر
بہت نزدیک ہے وہ دن کہ تم ہو گے نہ ہم ہوں گے

افکار کا مثبت پہلو

اکبر کے ہاں اپنے دور کے رجحانات' خیالات اور نظریات کی تردید میں بہت زور صرف کیا گیا ہے۔ ان کے کلام کا ایک بڑا حصہ تردید' تنقید اور تغلیط کے مقاصد کی تکمیل کرتا ہے اس لیے لامحالہ منفی خیالات کا غلبہ ہے اس کی ضرورت بھی شدید تھی۔ مغرب کے ذہنی اور ظاہری غلبے کے خلاف آواز بلند کرنا اور اس پر شدت سے وار کرنا دور اکبر کی بہت بڑی ضرورت تھی۔ مگر اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ان کے ہاں کسی مثبت نظریے کا سرے سے وجود ہی نہیں۔ اکبر کے ہاں نفی کے ساتھ اثباتی لائحہ عمل بھی موجود ہے اور وہ چند لفظوں میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ دین و دنیا میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ دنیا آخرت کی تیاری کے لیے ایک میدان عمل ہے۔ اگرچہ دنیوی ترقیاں بھی ضروری ہیں مگر وہ مذہب اور اخلاق کے زیر سایہ ہونی چاہئیں تاکہ انسانوں کی فطری کمزوریوں مثلاً ہوا و ہوس' لالچ' حسد وغیرہ کا سدباب ہو سکے۔ اکبر کے نزدیک مذہب انسانوں کے لیے مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر مذہب نہ ہو تو انسان جلد ہی ذہنی طور پر منتشر ہو جاتا ہے۔ اجتماعی مفاد کا احساس جاتا رہتا ہے اور انفرادی نفع اندوزی کا جذبہ غالب آ جاتا ہے:

مذہب سے ہی حفاظت قومی ہے اے عزیز
نادان ہے کواڑ ہٹائے جو چول سے

مگر مذہب کی ظاہر داری ہی کافی نہیں۔ ضروری یہ ہے کہ دل اور زبان میں ربط کامل

ہو' مذہب کے جو اصول لبوں پر ہوں' دلوں میں بھی انہی کا اثر ہو۔ انسان نماز پڑھے' روزہ رکھے اور دوسرے دینی احکام بھی بجا لائے مگر اس کے ساتھ انسانوں کے حقوق کو نظرانداز نہ کرے اور یہ حقوق اس صورت میں مدنظر رہ سکتے ہیں کہ اخلاقیات کے عالمگیر اصولوں پر عمل کیا جائے۔

تمام اخلاقیات کی بنیاد یہ ہے کہ "میں کسی کے ساتھ ایسا سلوک نہ کروں کہ وہی سلوک مجھ سے کیا جائے تو مجھے تکلیف پہنچے۔" اس کا طریقہ یہ ہے کہ میں دوسروں کی جان' ملکیت اور رائے وغیرہ کا احترام کروں اور دوسرے میرا خیال رکھیں' اگر اس اصول کو تسلیم کر لیا جائے تو ہم محفوظ رہ سکتے ہیں' اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے اگر ہم حسد' لالچ' کینہ' بددیانتی وغیرہ کو ترک کر دیں اور قناعت کی زندگی بسر کریں۔ زیادہ خواہشات نہ رکھیں تاکہ دوسروں کی اشیاء کا احترام کر سکیں۔ اکبر نے اخلاقیات کے ان اصولوں کا بہت پرچار کیا ہے:

بے غرض ہو کر مزے سے زندگی کٹنے لگی
ترک خواہش نے ہمارا بوجھ ہلکا کر دیا

ہے صبر و قناعت اک بڑی چیز اکبر
لذت ابھی اس کی تو نے چکھی ہے کہاں

قناعت نہیں ہے تو ایمان رخصت
عبادت نہیں تو مسلمان رخصت

گوشہ صبر و قناعت میں میں اب محفوظ ہوں
شہد سے محروم ہوں تو زہر سے محفوظ ہوں

قناعت ہی انسان کو حسد' لالچ' کینہ' ہوس' ذلت' ریا' رنج وغیرہ سے محفوظ رکھ سکتی ہے:

اونچا نیت کا اپنی زینہ رکھنا
احباب سے صاف اپنا سینہ رکھنا

غصہ آنا تو نیچرل ہے اکبر
لیکن ہے شدید عیب کینہ رکھنا

خواہان علم نہ طالب گنج ہیں ہم
بے کینہ و بے ریا و بے رنج ہیں ہم

شہوات کی پیروی کا منصوبہ نہ ہو
دولت تری خادمہ ہو' محبوبہ نہ ہو

شیطان سے دل کو ربط ہو جاتا ہے
دشوار انسان کو ضبط ہو جاتا ہے
حد سے جو سوا ہو حرص یا خود بینی
اکثر ہے یہی کہ خبط ہو جاتا ہے

ہوس یا رشک یا غصے سے جو طاقت ہو اے اکبر
وہ اخلاقی نہیں ہے' کر بہت کم اعتبار اس کا

اخلاقیات کا تعلق معاشرے سے ہے۔ مذہب کا بھی معاشرے ہی سے ربط ہے' اس لیے اکبر کا یہ خیال درست ہے کہ:

مذہب کا معاشرت سے ہے ربط کمال
دونوں جو ہوں مختلف تو آرام محال

اس لیے مذہب انسان کے لیے ضروری ہے۔ اکبر اسلام کو مکمل مذہب اور قرآن کو کامل ضابطہ سمجھتے ہیں۔ اسلام میں جو دلکشی ہے اس کا سب سے بڑا سبب اکبر کے نزدیک توحید ہے۔ ہمارے مفکروں اور شاعروں میں سے توحید کے عقیدے سے جتنا لگاؤ اکبر کو ہے وہ کسی اور کو نہیں ہے۔ اکبر کو تصوف سے جو زبردست لگاؤ ہے اس کی بنیاد اسی عقیدۂ توحید پر ہے۔ تصوف کا درخت پھوٹا ہی توحید کی اصل سے ہے۔ اس لیے اکبر بھی خدائے واحد کی توصیف کرتے ہیں۔ اس بلند و برتر اور بالاتر از وہم و قیاس ہستی کی ثنا میں اپنے کلام کا بہت سا حصہ صرف کرتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہو:

کہتے ہیں فطرت جسے یہ ہے نقاب روئے دوست
ہے اسی پردے میں پنہاں آفتاب روئے دوست

اک عکس نا تمام پہ عالم کو وجد ہے
کیا پوچھنا ہے آپ کے حسن و جمال کا

سب سے کر قطع نظر بہر خیال روئے دوست
یا ہر اک شے کو سمجھ عکس جمال روئے دوست

صوفی کا مذہب مختصر سب سے کھرا سب سے جدا
ہم تم کے جھگڑے لغو ہیں یا کچھ نہیں یا سب خدا

دعویٰ تو مرا ہے صرف توحید
کیونکر کوئی اس کو رد کرے گا

توحید کا مسئلہ ہے اصلی
باقی ہیں شگوفے ہسٹری کے

اکبر اہل طریقت صوفی نہیں۔ وہ شریعت کے بھی پوری شدت سے قائل ہیں۔ اس لیے قرآن مجید کے مطالعے اور شریعت کی طرف لوگوں کو اکثر مائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں:

قرآن رہے پیش نظر یہ ہے شریعت
اللہ رہے پیش نظر یہ ہے تصوف

مغوی تو ملیں گے تمہیں شیطان سے بہتر
ہادی نہ ملے گا کوئی قرآن سے بہتر

شکر ہے راہ ترقی میں اگر بڑھتے ہو
یہ تو بتلاؤ کہ قرآن بھی کبھی پڑھتے ہو

قرآن کے اثر کو روک دینے کے لیے
ہم لوگوں پہ راویوں کا لشکر ٹوٹا

نہ نماز ہے، نہ روزہ، نہ زکوٰۃ ہے، نہ حج ہے
تو پھر اس میں کیا خوشی جو کوئی جنٹ کوئی جج ہے

اکبر مذہب میں عبادات کی اہمیت کے بہت قائل ہیں لیکن اسے محض عبادات کا مجموعہ ہی تصور نہیں کرتے بلکہ اس کی ہمہ گیر افادیت کے قائل ہیں۔ انسان کی روحانی ترقی، معاشرتی انصاف، حقوق العباد وغیرہ کی مذہب میں از حد اہمیت ہے، اس لیے معاشرہ قرآنی تعلیمات پر عمل کرنے ہی سے وجود میں آ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکبر عمل کی تعلیم دینا نہیں بھولتے۔ ان کے خیال میں انگریزوں نے مسلمانوں کو ختم کرنے کے لیے ان کی قوت عمل ختم کرنے کا منصوبہ بنا رکھا ہے:

عمل جاتا رہے بالکل فقط الفاظ رہ جائیں
انہیں بھی پست کر دے مغربی حکمت کا نقارہ

اسی لیے وہ مسلمانوں کو عمل کی طرف راغب کرتے ہیں:

کاہلی اور توکل میں بڑا فرق ہے یار
اٹھو کوشش کرو بیٹھے ہوئے کس دھیان میں ہو

مجلس میں خیال بادہ نوشی پایا
مکتب میں سر سخن فروشی پایا
مسجد میں اگرچہ امن تھا اے اکبر
لیکن اک عالم خموشی پایا

خدا حافظ مسلمانوں کا اکبر
مجھے تو ان کی خوش حالی سے ہے یاس

یہ عاشق شاہد مقصود کے ہیں
نہ جائیں گے ولیکن سعی کے پاس

نہ جوتی ہے زمیں تم نے، نہ تم نے بیج بوئے ہیں
یہ کیا معنی کہ ہو لے بارش ابر کرم پہلے

شیخ تثلیث کی تردید تو کرتے نہیں کچھ
گھر میں بیٹھے ہوئے والتین پڑھا کرتے ہیں

انوکھے مشغلے ہیں حضرت اکبر کے ان روزوں
الم ترکیف بیٹھے پڑھ رہے ہیں فیل خانے میں

قرآن کو زبان سے دل میں اتاریے
علمی نمود چھوڑ، عمل کو سنواریے

اکبر یہ بھی سمجھتے ہیں کہ اسلام جیسے سیدھے سادے اور قابل عمل مذہب میں لوگوں نے بہت سی غیر اسلامی باتیں داخل کر دی ہیں- ان غیر اسلامی باتوں کو وہ "عجم" کی اصطلاح سے ظاہر کرتے ہیں اور اس کے مقابلے میں خالص اسلامی تعلیمات کو "عرب" کی اصطلاح سے بیان کرتے ہیں- اقبال سے کئی برس پہلے اکبر کے کلام میں عرب و عجم کا جو تقابل ملتا ہے وہ ان کی بصیرت اور تدبر کا ثبوت ہے- وہ مسلمانوں کو تعلیمات عرب کی طرف بلاتے ہیں اور عجمی خیالات کو اسلام سے نکال باہر کرنا چاہتے ہیں:

گزرا ہے مری نظر سے سب کا جلوہ
سب سے بہتر ہے روز و شب کا جلوہ
کہتا ہے عجم، عجم میں جم، ہے موجود
کہہ دو کہ عرب میں دیکھ رب، کا جلوہ

معاملہ تھا عرب کا خدائے واحد سے
عجم نے واسطہ رکھا شراب و شاہد سے

ادھر تھی حمد خدا ہی سے آشتی دل کو
ادھر تھی بحث نزاع حمید و حامد سے

بہت ہی کم پائے اپنے عارف' کمال باری نے ہم میں اکبر
سرے سے بگڑا ہے سچ جو پوچھو عرب کا مذہب عجم میں آکر

اے ذہن عرب گوش مکن صلح عجم را
این نغمہ نشید است دگر صوت و نعم را

اکبر جہاد کو اسلامی تعلیمات میں بہت ہی اہم حیثیت دیتے ہیں- ان کی سوچی سمجھی رائے یہ ہے کہ دنیا میں صلح پسندی سے رہنے والوں کو کوئی بھی زندہ رہنے کا حق نہیں دیتا- طاقت اور اس کے اظہار کے بغیر نہ آزادی مل سکتی ہے اور نہ ہی عزت- انگریز ہو یا کوئی دوسری ظالم قوم' ان کے ظلم کو مٹانے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے آپ میں طاقت پیدا کی جائے اور اس طاقت کے بل بوتے پر ظالموں کو نکال باہر پھینکا جائے-(۱۰۵) ان کے نزدیک مذہب اور فلسفے میں یہ فرق ہے کہ مذہب نظریہ بھی ہے اور نظریے کی عملی تعمیر بھی جبکہ فلسفہ محض ایک نظریہ ہوتا ہے-

نہ ہو مذہب میں گر زور حکومت
تو وہ کیا ہے فقط اک فلسفہ ہے

ح حکومت کی جب نہ ان میں رہی
حنفی نفی ہیں معطل ہیں

اکبر طاقت کے پرستار ہیں- وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان طاقت ور ہوں اور حصول طاقت کے بعد انگریزی حکومت کا تختہ الٹ دیں- اس کے بر عکس تعلیم جدید چونکہ سرکار انگریزی سے وفاداری سکھاتی ہے اس لیے حریت کی روح کو کچل دیتی ہے:

تعلیم جدید سے ہوا کیا حاصل
ہاں کفر کے ساتھ جنگ جوئی نہ رہی

اس نے میدان میں سر دے کے کیا قوم کا نام
آپ بنگلے میں منایا ہی کیے جان کی خیر

آخری عمر کے کلام میں بالخصوص انہوں نے زور اور قوت کی بڑی مدح کی ہے:

مخالفت سے نہ باز آئے گی دنی دنیا
فقط یہ زور سے دبتی ہے یاد رکھ یہ گر
انہی کی بھینس ہے بھائی کہ جن کی لاٹھی ہے
انہی کا گاؤں ہے اکبر جو بن سکیں ٹھاکر

اس کا گھوڑا جس کی کاٹھی
بھینس اسی کی جس کی لاٹھی

زور سے دبتی ہے دنیا یہ نہیں تو کچھ نہیں
حکم سے چلتا ہے کہنا' یہ نہیں تو کچھ نہیں

زبانیں خوب کھلتی ہیں مگر قسمت نہیں کھلتی
سبب یہ ہے کہ اٹھتا ہے قلم ہاتھ اٹھ نہیں سکتا

جب قوت تھی سب دعوے تھے قوت ہوئی گم اب کچھ بھی نہیں
طاقت ہی کے سارے غمزے تھے کمزور کا مذہب کچھ بھی نہیں

جو پوچھا میں نے حضرت میری عزت کیوں نہیں کرتے
تو وہ بولے کہ تم اظہار قوت کیوں نہیں کرتے

اپنی تہ میں اے زمیں اب مجھ کو جائے گور دے
وہ رہے زیرِ فلک اللہ جس کو زور دے

خلاصہ کلام یہ کہ اکبر الہ آبادی نے بے شمار مسائل پر اظہار رائے کیا ہے۔ اگرچہ ان کے نظریات کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں—— انہیں رجعت پسند'

جدید نظریات اور جدید علوم کا دشمن، ایک مبہم سی مشرقیت کا دلدادا اور خدا معلوم کیا کیا کچھ قرار دیا جاتا ہے ـــــ لیکن اگر ان کے افکار کو صحیح تناظر میں رکھ کر دیکھا جائے تو بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ اکبر برطانیہ اور مغرب کے شدید مخالف تھے مگر یہ مخالفت محض جذباتی یا مشرقیت سے مبہم لگاؤ کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ اس کی ایسی وجوہ تھیں جو آسانی سے رد نہیں کی جا سکتیں وہ مغرب کے اس وجہ سے مخالف تھے کہ ہندوستان میں جو اقدامات کیے جا رہے تھے وہ مقامی باشندوں کی بھلائی کے نام پر ہو رہے تھے مگر ان کی تہہ میں برطانوی حکومت کے استحکام کا مقصد پنہاں تھا۔ تعلیم جدید ہو یا رسل و رسائل کے ذرائع کی توسیع، انتظامیہ ہو مقننہ ہو یا عدلیہ، سبھی باتیں سلطنت کے استحکام اور دوام کے مقاصد انجام دینے کے لیے وجود میں آئی تھیں، مگر تاثر یہ دیا جاتا تھا کہ یہ سب مقامی باشندوں کو ترقی یافتہ اقوام کے دوش بدوش چلانے کے لیے ہیں۔ بعض مصلحین جن میں سرسید احمد خاں پیش پیش تھے، اگرچہ برطانوی حکمت عملی کو سمجھتے تھے تاہم یہ امر مجبوری مسلمانوں کو انگریزوں سے تعاون کرنے کا مشورہ دیتے تھے۔ کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ انگریزی حکومت ہندوستان میں ہمیشہ رہے گی۔ اس صورت میں انگریزوں سے تصادم کی پالیسی اختیار کرنا خطرناک ہو گا۔ اکبر الہ آبادی سرسید کی اس حکمت عملی کے سو فیصد خلاف نہ تھے۔ قوم کو جدید تعلیم وہ بھی دینا چاہتے تھے مگر ان کا خیال تھا کہ تعلیم ویسی نہیں ہونی چاہیے جیسی علی گڑھ کالج میں دی جا رہی ہے۔ یہ تعلیم مسلمانوں کو عارضی فائدہ پہنچائے گی مگر آخرکار سخت مضر ثابت ہو گی۔ تعلیم جدید مفید ثابت ہو گی تو سائنس اور ٹکنالوجی کی، نہ کہ ادبیات اور فلسفے کی۔ ایک تو اکبر اور سرسید میں یہی بنیادی اختلاف تھا جو جدید یا قدیم تعلیم کے بارے میں نہیں تھا بلکہ جدید تعلیم کی نوعیت پر تھا۔ دوسرا اختلاف یہ تھا کہ سرسید یورپ کے جدید افکار بالخصوص مادی فلسفوں سے خائف تھے۔ انہیں خطرہ تھا کہ یہ مذہب کو بالکل مٹا کر رکھ دیں گے اس لیے انہوں نے مذہب کے ورائے عقل پہلوؤں کی عقلی توجیہہ کرنے کی کوشش کی اور بالخصوص بہت سی ایسی رسومات، جو مذہب کے نام پر اسلام میں شامل کر لی گئی تھیں، کے خلاف پرزور آواز بلند کی۔ یہاں بھی اکبر الہ آبادی اس حد تک سرسید کے ہم خیال تھے کہ غیر مذاہب کی رسومات کو اسلام سے خارج کرنا چاہیے لیکن وہ سمجھتے تھے کہ مذہب کو جدید علوم سے کوئی خطرہ نہیں۔

مذہب کبھی سائنس کو سجدہ نہ کرے گا
انسان اڑیں بھی تو خدا ہو نہیں سکتے

اس کے علاوہ وہ جانتے تھے کہ نظریات کبھی حرف آخر نہیں ہوتے خواہ سائنسی ہوں یا فلسفیانہ، کیوں کہ ہر نظریہ بدل جاتا ہے:

ہم انقلاب کے شائق نہیں زمانے میں
کہ انقلاب کو بھی انقلاب ہی دیکھا

اکبر سمجھتے تھے کہ انگریزی حکمت عملی کی بدولت ہم لوگوں نے اپنی بہت سی اچھی چیزوں کو بھی ترک کر دیا ہے۔ ہمارا اخلاقی نظام جو بنی نوع انسان کے ہزاروں سال کے تجربے کا نچوڑ ہے، ختم ہوتا جا رہا ہے۔ زر پرستی، نفع اندوزی، رشوت ستانی، بددیانتی، کنبہ پروری اور غرض مندی وغیرہ نے معاشرے کو علیل کر دیا ہے اور یہ امراض پھیلتے چلے جا رہے ہیں۔ ان کا علاج انھوں نے بھی بہت حد تک وہی تجویز کیا جو بعد میں اقبال نے پیش کیا۔ ذاتی مفادات کو چھوڑ کر ملت کے لیے کام کرنا ان کے نظریات کا بنیادی پتھر ہے۔ معاشرے کی بہت سی خرابیوں کا آغاز ذاتی اغراض کے مدنظر رکھنے سے ہوتا ہے۔ حسد، لالچ، کینہ وغیرہ اجتماعیت کے احساس سے دم توڑ دیتے ہیں اور ایک ایسا معاشرہ وجود میں آتا ہے جس کے افراد اطمینان قلب سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ اکبر ایسے ہی معاشرے کو وجود میں لانے کے متمنی تھے اور یہی وہ مثالی معاشرہ ہے جس کے لیے پیغمبر، اولیا، مصلحین اور خدا کے نیک بندے ہمیشہ کوشاں رہے اور شعرا کی اسی خصوصیت کو "شاعری جزویست از پیغمبری" قرار دیا گیا ہے۔

حواشی

۱۔ تاریخ ادب اردو، مترجمہ مرزا محمد عسکری، صفحہ ۸-۷-۴۴۔
۲۔ نئے اور پرانے چراغ، صفحہ ۲۴۲۔ ۲۴۳۔
۳۔ تنقید کیا ہے، صفحہ ۲۱۔
۴۔ علی گڑھ میگزین، اکبر نمبر، صفحہ ۱۳۱۔
۵۔ علی گڑھ میگزین، صفحہ ۱۳۸۔
۶۔ موج کوثر، فیروز سنز لاہور، چھٹا ایڈیشن ۱۹۲۵ء، صفحہ ۲۱۸۔
۷۔ یعنی جب آدمی محاورے کے مطابق سٹھیا جاتا ہے۔
۸۔ علی گڑھ میگزین، صفحہ ۲۲۵۔

9- A History of Urdu Literature, Oxford University press London, 1960, p. 309.

10- The Mysteries of Selflessness, A J. Arberry, p.x.

۱۱- موسم کی سردی اکبر کے ہاں علامت کا درجہ رکھتی ہے۔ "جلوۂ دربار دہلی" میں بھی یہ علامت استعمال ہوتی ہے:

کچھ چہروں پہ مردی دیکھی
کچھ چہروں پہ زردی دیکھی
اچھی خاصی سردی دیکھی
دل نے جو حالت کر دی دیکھی

۱۲- اقبال نے بھی "شمع و شاعر" میں اسی مسلک کو قبول کیا ہے۔ وہ مولانا روم کے اس شعر کو ادنیٰ تغیر کے ساتھ یوں لکھ گئے ہیں:

گفت رومی ہر بنائے کہنہ کا بادان کنند
می ندانی اول آن بنیاد را ویران کنند

۱۳- موقع بحث نہیں صاحب اقبال ہیں آپ
میری ہر بات بری آپ کی ہر بات اچھی (اکبر)

۱۴- اس کا مطلب نہیں کہ عبدالماجد ان سب چیزوں کے دشمن ہیں۔ مقصد صرف مرعوبیت کی حدود دکھانا ہے۔

۱۵- یہی معیار آج تک چلا جاتا ہے۔

۱۶- اکبر نامہ، صفحات، ۹۳ تا ۹۷۔

۱۷- اس سلسلے میں ایک مصنف لکھتا ہے:

The Information Department of the then government of India helped and encourged writings Vindicating British rule and Advocating that it had done tremendous good to India (British Rule in India: Ram Gopal; Asia publishing House, Dehli 1963, p: v.

میری طالب علمی کے زمانے کی نصابی کتابوں میں "برطانوی حکومت کی برکات" وغیرہ جیسے عنوانات پر مضامین ہوتے تھے اور اس قسم کی نظمیں شامل نصاب تھیں:

ہوئی جب سے انگلش حکومت یہاں ہے
بہت امن اور سکھ میں ہندوستاں ہے
شہنشاہ ہمارا جو اب حکمراں ہے
رعیت پہ اپنی بڑا مہرباں ہے
شہنشاہ سلامت رہیں یا الٰہی

18- Ideas about India, p xv

19- My Diaries, part II (1900- 1914), p. 287

۲۰- اس سے مراد انگریزوں سے پہلے کی حکومتوں کے ادوار ہیں۔

21- Letters on India. p. 2-3

۲۲- معاشی تاریخ ہند، مترجمہ محمد نصیرالدین خان، جلد دوم، صفحہ ۱۷۔

۲۳- چاولوں کی کاشت بہت زیادہ ہونے لگی تھی۔

24- The Economic History of India. Radhakamal Mukerjee, p. 45 46

25- An Indian Commentary. Quoted by G.T. Garret, p. 46

۲۶- کمپنی کی حکومت، صفحہ ۱۳۔

27- Consideration on Indian Affairs (1772) p. VIII

28- Ibid p. 176

29- Ibid p. 176

30- Ibid. p. 194

31- Considation on Indian Affairs p. 194

32- The Law of Civilization and Decay : p. 260

33- Poverty and Unbritish rule in India, Dadabhai Naoroji, p. VIII

34- Cash Crops

35- British Rule in India p. 20

36- L. H. Janks: The Migration of British Capital p. 233-224.

37- Mughal Administration : Jadunath Sarkar. p. 197-198.

38- Legal Aspects of Social Reform ; by paul Appasamy p. 226-7.

39- Pear's soap.

۴۰- یعنی ڈارون کے نظریہ ارتقا پر بحث بے سود ہے کیونکہ اگر یہ ثابت بھی ہو جائے کہ یہ نظریہ درست ہے تو اس سے ہماری موجودہ حالت پر کوئی اثر نہیں ہو گا البتہ مفید بحث یہ ہے کہ انگریز کن کن طریقوں سے ہندوستان کی دولت سمیٹ سمیٹ کر لے جا رہے ہیں (م - ز)

۴۱- منشی سجاد حسین انجم کسمنڈوی کا ناول "نشتر" ملاحظہ ہو۔

42- British Rule in India p. 235

43- Ibid p. 238

44- Ibid p. 238

45- Ibid p. 244

46- British rule in India p. 249

47- An India Commentary: G.T. Garret, p. 41, 42

48- British Rule in India, Ram Gopal; p. 184

49- Speech of Hen. Artur Kinnaird, (second Edition) p. 27.N.D.

۵۰- بزم اکبر، صفحہ ۷۰۔

51- Educational Controversies in India, B.K. Boman Behram p. 219

52- Minute, 2nd February 1835.

53- On the Education of people of India, Trevelyan, p. 189.

54- On the Education of people of India p. 191-192

55- Indication of English education act of Lord W. Bentinc,

Rev. Dr. Duff : part III

56- The History and prospects of British Education in India.

F.W. Thomas, p.l.

۵۷- النمل آیت ۳۴

۵۸- جب حکمران کسی ملک میں داخل ہوتے ہیں تو اسے خراب کر دیتے ہیں اور وہاں کے اعلیٰ ترین افراد کو ادنیٰ ترین افراد میں بدل دیتے ہیں۔ (ترجمہ)۔

59- A History of Education in India : Sayed Nurullah & J.P.Naik : p. 563

60- Ibid. p. 566

6i- Ibid. p. 568

62- Ibid p. 572

63- Ibid p. 573

64- Ibid. p. 576

۶۵- حیات جاوید، صفحہ ۵۵۹۔

66- Religious thoughts of Sayyad Ahmad Khan, B.A.Dar p. 144

67- Ibid . p. 145

۶۸- مقالات سرسید، جلد چہار دہم، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۵ء صفحہ ۱۸

۶۹- ایضاً، صفحہ ۲۵

۷۰- ایضاً، صفحہ ۱۵۷

۷۱- ایضاً، صفحہ ۱۷۲

۷۲- ایضاً، صفحہ ۱۷۷

۷۳- ایضاً، صفحہ ۱۹۷

۷۴- ایضاً، صفحہ ۲۰۴

۷۵- ایضاً، صفحہ ۱۲۷

۷۶- اگر یتیموں کے مال کے متعلق لوگوں کو علم ہوتا تو وہ محفوظ ہی کیسے رہ سکتا تھا، اور عقلی طور پر اس کی کیا توجیہ ہے کہ خاص اسی شخص کو اس مال کے متعلق علم تھا۔

۷۷- اگر یہ اس قدر آسان عقلی توجیہیں تھیں تو حضرت موسیٰ کو استفسارات سے منع کیوں کیا گیا؟

۷۸- مقالات، ج چہارم، صفحہ ۱۴۱۔

۷۹- ایضاً، صفحہ ۲۱۰ تا ۳۴۷

۸۰- ایضاً، صفحہ ۱۷۸۔

۸۱- اودھ پنچ، جلد بستم، نمبر ۱۴، اپریل ۱۸۹۶ء۔

82- History of M. A. O. College, Aligarh : Bhatnagar p. 29

83- Ibid : p. 85

84- Ibid : p. 133

۸۵- یہ وہی مار-سن ہیں جن کا ذکر اکبر نے اپنی ایک نظم میں یوں کیا ہے:

کر چکا کالج میں جب تکمیل فن
تب لگے کہنے یہ مجھ سے مار-سن
گو کہ شہرت ہے تمہاری دور دور
مجھ سا تم رکھتے نہیں فہم و شعور
عرض کی میں نے کہ اے روشن ضمیر
ہے یہی تو جس کو روتا ہے بشیر
آپ نے سیکھا ہے اپنے باپ سے
اور میں نے جو پڑھا وہ آپ سے

86- History of the M. A. O. College p. 148

۸۷- کرکٹ کے مشہور کھلاڑی رنجیت سنگھ جی معروف بہ رانجی جن کے نام پر رانجی ٹرافی منعقد ہوتی تھی۔

۸۸- اعمال نامہ، سر سید رضا علی، ہندوستانی پبلشرز، دہلی (۱۹۴۳ء) صفحہ ۷۵، ۷۶۔

89- History of M. A. O., College p. 204.

90- Ibid p. 204.

91- Ibid p. 256.

92- Ibid p. 360.

۹۳- کلیسا کے مقابل آج مشکل میرے جینا ہے
کہ غیروں پر تو غصہ ہے اسے مجھ سے تو کینا ہے

۹۴- اکبر نامہ، صفحہ ۲۰۔ اس کے ساتھ ایک حاشیہ بھی دیا ہے جو اکبر کے خیالات کی بالواسطہ تنقید بھی ہے: "خوش خیالیوں سے بھرے ہوئے یہ فقرے خوب خیال میں رہے کہ ۱۹۴۷ء کے انقلاب خونیں سے سالہا سال قبل کے لکھے ہوئے ہیں۔"

95- See "A History of Western Philosophy- p. 623 to 629

96- Earth and Space : R. M. Harbeca L. K. Johnson 1965 p. 224.

97- The Earth : Arthur Bieser: (1963) p. 35, 38

۹۸- ہم فلسفے کو کہتے ہیں گمراہی کا باعث
وہ پیٹ دکھاتے ہیں کہ شیطان یہی ہے

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

بحثیں فضول تھیں یہ کھلا حال دیر میں
افسوس عمر کٹ گئی لفظوں کے پھیر میں

۹۹- ٹیکسٹ بک بورڈ پنجاب نے کئی برس تک ٹائپ استعمال کرنے کے بعد اسے ترک کرنے کا فیصلہ کیا ہے- اب ان کی جو کتابیں چھپ رہی ہیں وہ فوٹو پرنٹنگ کے طریقے سے طبع کی جاتی ہیں- اور اب تو کمپیوٹر کی طباعت کا زمانہ ہے-

۱۰۰- اس شعر کی ایک شان نزول اور بھی ہے- اکبر کے زمانے میں ایک دفعہ پائپ لائن میں خرابی کے سبب پانی کئی روز تک بند رہا تھا- ملاحظہ ہو بزم اکبر (قمرالدین بدایونی، صفحہ ۱۲۱) اور یہ واقعہ بھی "تھوڑا عرصہ ہوا کہ چوک کی دکانوں میں آگ لگی- اس وقت پائپ بند ہونے سے رعایا کا سخت نقصان ہوا-" (ایضاً، صفحہ ۱۲۲)

۱۰۱- بزم اکبر، صفحہ ۵۳-

۱۰۲- نئے اور پرانے چراغ، صفحہ ۸۲-

۱۰۳- علی گڑھ میگزین، اکبر نمبر، ۱۹۵۰ع، صفحہ ۴۶، ۴۷-

۱۰۴- اس طرح ایک اور قطعے میں نئی اور پرانی تہذیب کے دو افراد کے درمیان مکالمے کے بعد بقول شہید یہ نتیجہ نکالا ہے:

اے صبا مایہ سودا نہ تو داری و نہ من
بوئے آن زلف چلیپا نہ تو داری و نہ من

۱۰۵- یہی وجہ ہے کہ وہ گاندھی کے فلسفہ عدم تشدد کے قائل نہیں:

نے کی بھی صدا آئے گی چرخے بھی چلیں گے
لیکن یہ سمجھ لیجئے صاحب نہ ٹلیں گے

باب چہارم

شاعری کے اسالیب

ادب کا مطالعہ بنیادی طور پر مطالعہ فن ہے۔ اگرچہ فن کار کے خیالات خصوصی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں لیکن خیالات کی پیشکش کسی طرح بھی کم تر اہمیت نہیں رکھتی۔ پیشکش کا انداز ہی ہے جو کبھی ادیب کو صحافی یا خطیب کی صف میں شامل کر دیتا ہے اور کبھی اسے صاحب فن کا مرتبہ بخشتا ہے۔ خیالات کی گہرائی میں شاعر سے زیادہ اہم فلسفی ہوتا ہے لیکن جہاں فلسفی اپنے خیالات کا اظہار منطق کی خشک زبان میں کرتا ہے، وہیں شاعر اپنے مخصوص وسائل اظہار سے ذہن کو تسخیر کرلیتا ہے۔ اس لیے ادب کے میدان میں اظہار کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔

اکبر الہ آبادی فن کار ہیں، محض مصلح قوم نہیں۔ انہوں نے اگرچہ نثر بھی لکھی ہے لیکن ان کا اصل میدان تگ و تاز شاعری ہے جس کی بدولت ان کی نثر بھی آج زندہ ہے۔ گذشتہ باب میں ان کے افکار و نظریات سے تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔ اس باب میں بتایا جائے گا کہ ان کی شعری انفرادیت کن عناصر میں پنہاں ہے، وہ شعر کو مؤثر بنانے کے لیے کون کون سے اسالیب استعمال کرتے ہیں اور یہ اسالیب ان کے موضوع سے کہاں تک مطابقت رکھتے ہیں؟

طنز و مزاح کی روایت

اکبر کی شہرت کا زیادہ تر دارومدار ان کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری پر ہے اگرچہ ان کا سنجیدہ کلام مقدار میں مزاحیہ کلام سے کسی طرح کم نہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کی مقبولیت کا بڑا سبب ان کا طنزیہ و مزاحیہ کلام ہی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ ان کی انفرادیت بھی پوری طرح طنز و مزاح ہی کے میدان میں ظاہر ہوئی ہے۔ تاریخ ادب میں وہی فن کار اہم ہوتا ہے جس میں انفرادیت ہو ورنہ مقلد تو ہر دور میں بے شمار ہوتے ہیں جو برسات کے سبزے

کی طرح ظاہر ہوتے اور فنا ہو جاتے ہیں مگر انفرادیت رکھنے والے فنکار لافانی ہوتے ہیں۔ اردو ادب میں میر، سودا، نظیر، انیس، غالب اور اقبال کو جو نمایاں اہمیت حاصل ہے، اس کی وجہ ان کی انفرادیت ہے۔ ان میں سے ہر شخص کے کلام میں اس کی منفرد شخصیت کا اظہار اس بھرپور طریقے سے ہوا ہے کہ کسی ایک کے کلام پر دوسرے کا دھوکا نہیں ہو سکتا۔ اکبر الہ آبادی اپنی انفرادیت کی بنا پر ہر طرح سے اس بات کے مستحق ہیں کہ غیرفانی ناموں کی اس فہرست میں ان کے نام کا اضافہ کیا جائے۔

اردو شاعری میں طنز و مزاح کی روایت کا آغاز دکن ہی سے ہو جاتا ہے۔ دکنی شاعروں کے کلام میں واعظ اور ناصح سے چھیڑ چھاڑ کے اشعار فارسی شعراء کے تتبع میں موجود ہیں۔ یہ رو ولی، میر، مصحفی، آتش، غالب، حالی وغیرہ سے ہوتی ہوئی جدید شعرا یعنی فیض وغیرہ تک پہنچتی ہے۔ ایک اور رو ہے جس میں ظرافت نے ہزل کا روپ اختیار کر لیا ہے۔ اس کے نمائندے جعفر زٹلی، عطا، اٹل، زانی، افسق وغیرہ ہیں۔ تیسری رو ہجویات کی ہے۔ قدیم شاعری میں طنزیہ اور مزاحیہ شاعری کے قابل ذکر نمونے ہجویات میں نظر آتے ہیں۔سودا، نظیر، انشا وغیرہ کے ہاں کہیں تو ہجو معاشرے کی آلودگیوں کی پردہ دری کر کے بلند منصب پر فائز ہو گئی ہے اور کہیں ذاتیات میں الجھ کر اپنے مقام سے گر گئی ہے۔ غرض اکبر سے قبل کی اردو شاعری میں طنز و مزاح کے وجود سے یکسر انکار تو نہیں کیا جا سکتا البتہ اس میں شبہ نہیں کہ قابل ذکر سرمایہ کم ہے۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں اردو صحافت کے ذریعے طنز و مزاح کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول ہوئی۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید لکھتے ہیں :

> "انیسویں صدی کے ربع آخر میں پنچ اخبارات کا وہ غلغلہ ہوا کہ ہر طرف انہیں کا طوطی بولنے لگا۔ سنجیدہ صحافت نے ان اخبارات کو جعفر زٹلی قرار دیا اور ان کے خلاف بہت لے دے کی لیکن نقارخانے میں طوطی کی آواز کون سنتا تھا۔ اس لیے تیس پینتیس سال تک میدان مزاحیہ صحافت کے ہاتھ رہا۔ پنچ اخباروں کا سرپنچ اودھ پنچ تھا... لیکن اس سے یہ مطلب لینا غیر صحیح ہو گا کہ مزاحیہ اور پنچ صحافت کا آغاز "اودھ پنچ" سے ہوا۔ اودھ پنچ سے پہلے بھی کئی اخبار نکلے۔ مثلاً ۷ جنوری ۱۸۵۵ء کو رامپور سے "مذاق" نکلا... اختر شہنشاہی سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو کا دوسرا مزاحیہ اور پہلا پنچ اخبار "مدراس پنچ" تھا جو ۱۸۵۹ء میں جاری ہوا....جنوری ۱۸۷۶ء میں بمبئی سے "فرحت الاحباب" جاری ہوا۔ اسی

سال مراد آباد سے "روہیل کھنڈ پنچ" نکلا اور پٹنہ سے "بہار پنچ" اور ان کے بعد
جنوری ۱۸۷۷ء میں "اودھ پنچ" منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا۔ گویا یہ اردو کا چھٹا
مزاحیہ اخبار تھا۔"(۱)

اکبر الہ آبادی کے بارے میں یہ تو معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ "اودھ پنچ" سے قبل کے مزاحیہ پرچوں سے واقفیت رکھتے تھے یا نہیں تاہم یہ بالکل واضح ہے کہ "اودھ پنچ" کے اجرا کے ساتھ ہی وہ اس میں لکھنے لگے تھے۔ انہوں نے اسی سال کے آغاز میں جو نظم "نامہ بنام اودھ پنچ" کے عنوان سے لکھی ہے وہ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس میں مزاح نگاری کے محرکات کا سراغ ملتا ہے۔ اکبر نے اودھ پنچ کے اجرا کے دو بڑے سبب بیان کیے ہیں:

۱۔ یہ لندن کے اخبار "پنچ" کی تقلید میں جاری ہوا ہے۔
۲۔ ہندوستان کا ماحول اس بات کا متقاضی ہے کہ انگریزوں پر براہ راست تنقید کرنے کی بجائے مزاحیہ انداز میں ان کا خاکہ اڑایا جائے۔

ان دونوں محرکات کی تائید میں "نامہ بنام اودھ پنچ" سے دو اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں:

ہر چند کے طرز پنچ لندن
بے شبہ ہے دل پسند و پر فن
لیکن وہ نقش اولیں نہ ہے
نسبت اس سے اسے نہیں ہے
ماشاء اللہ یہ نقش ثانی
بہتر ہے بصورت معانی
وہ پیر معمر و کہن سال
یہ خیر سے نونہال اقبال
بحث مضموں میں وہ اگر پنچ
یہ حل نکات میں ہے سرپنچ

اس سے صاف ظاہر ہے کہ "اودھ پنچ" لندن کے "پنچ" کے انداز میں جاری کیا گیا ہے۔ دوسرے محرک کی طرف ذیل کے اشعار میں اشارہ کیا گیا ہے:

آزادی کا فخر اسے اگر ہے
یاں فخر اس سے زیادہ تر ہے
واں طبع کو زور لا تخف ہے
وقت تو جو ہے وہ اس طرف ہے
زنجیر خرد کی پائے بندی
باقاعدہ شرح دردمندی
کیوں کر نہ ہو ادعائے اعجاز
کھولے ہیں قفس میں بال پرواز
ہے نوک سناں پہ نقش پرداز
رقصاں دم تیغ پر بصد ناز
پابندی کا یاں ہے کب تاسف
یوسف زنداں میں بھی ہے یوسف

یہ اشعار برطانوی عہد کی تعزیروں اور صحافتی پابندیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

محرک اول "اودھ پنچ" کے مفصل مطالعے کے لیے یقیناً بہت مفید ثابت ہو سکتا ہے مگر اکبر کے مطالعے کے لیے محرک دوم ہی اہمیت کا حامل ہے۔ اکبر نے بہت چھوٹی عمر ہی سے سرکاری ملازمتیں شروع کر دی تھیں۔ "اودھ پنچ" کے اجرا کے تین برس بعد یعنی ۱۸۸۰ء میں ان کی جوڈیشل سروس کا آغاز ہو چکا تھا' اس لیے وہ انگریزوں کے خلاف براہ راست کچھ کہنے کے قابل نہ تھے۔ ویسے بھی ۱۸۷۷ء تو بہت دور کی بات ہے' بیسویں صدی کے آغاز کے لگ بھگ بھی انگریزوں کی مخالفت نہیں کی جاتی تھی' ان سے محض مراعات مانگی جاتی تھیں۔ اکبر دل سے انگریزوں کے خلاف تھے اور ان کی حاکمیت کے دشمن تھے مگر ایک تو انگریز کی دہشت ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد ہر دل پر بیٹھ گئی تھی' اس پر طرہ اکبر کی سرکاری ملازمت۔ چنانچہ "اودھ پنچ" کے اجراء سے اکبر کو خیال ہوا کہ "سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے" کے انداز میں لوگوں تک مخالفانہ خیالات بھی پہنچائے جا سکتے ہیں اور گرفت سے بھی بچا جا سکتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ اس زمانے میں مزاحیہ شاعری کی طرف مائل ہوئے ورنہ ۱۸۷۷ء سے قبل ان کی شاعری طنز و مزاح سے دور تھی۔

اکبر نے طنزیہ اسلوب کو اختیار کرنے کا سبب صرف "نامہ بنام اودھ پنچ" ہی میں نہیں

بتایا، اور بھی کئی شعروں میں اس کی طرف اشارے کیے ہیں:

لغزشیں مد ظرافت میں جو کچھ آئیں نظر
دوستوں سے التجا یہ ہے کریں اس کو معاف
سرد تھا موسم ہوائیں چل رہی تھیں بر فبار
شاہد معنی نے اوڑھا ہے ظرافت کا لحاف

اس اعتبار سے اکبر الہ آبادی اردو کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے طنز و مزاح کو شعوری طور پر کسی مقصد کے لیے استعمال کیا۔ سودا، جعفر زٹلی اور سید انشاء کے ہاں اگر ہمیں معاشرے کی خرابیاں دکھائی دیتی ہیں تو یہ اتفاقیہ ہیں۔ ان لوگوں کی ہجویات کے تیر زیادہ تر افراد کو چھلنی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ سودا کی ہجویات سے اس کے دور کی معاشی اور معاشرتی ابتری بہت کچھ معلوم ہو جاتی ہے مگر عموماً وہ افراد کی ہجویات لکھتے ہیں۔ افراد چونکہ معاشرے ہی کے پرزے ہوتے ہیں اس لیے معاشرہ بھی ان میں آموجود ہوتا ہے۔ صرف شہر آشوب کی صنف میں سودا معاشرے کا صحیح ترجمان نظر آتا ہے ورنہ ہجو اسپ اور ہجو پیل جیسی معرکہ آرا نظمیں بھی درحقیقت شخصی ہجویں ہیں(۲)، مگر اس دور کے اہم افراد کی ہجویں ہونے کی وجہ سے معاشرتی ہجو کی حیثیت اختیار کر گئی ہیں۔ اس کے برخلاف اکبر الہ آبادی معاشرے کا نقاد ہے، اور اس کے سامنے اصلاح معاشرہ کا نکتہ شعوری طور پر موجود ہے۔ وہ جب کہتا ہے:

نہ حالی کی مناجاتوں کی پروا کی زمانے نے
نہ اکبر کی ظرافت سے رکے یاران خود آرا

تو صاف طور پر اعتراف کر لیتا ہے کہ درحقیقت اس کی ظرافت لوگوں کی بھیڑ کو تباہی کے راستے پر جانے سے روکنے کے لیے ہے۔ یہ الگ بات کہ اپنی ناکامی کا اعتراف بھی کرتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب سب لوگوں نے تباہی کا راستہ اختیار کر رکھا ہو اور مستزاد یہ کہ اسے نجات کا راستہ تصور کرتے ہوں تو اکیلا اکبر کیا کر سکتا ہے۔

ہم اکبر کے مقاصد کی وضاحت تیسرے باب میں کر چکے ہیں۔ مگر مقصد کتنا ہی بلند پایہ کیوں نہ ہو، کہنے والا کتنے خلوص سے اظہار خیال کیوں نہ کرتا ہو، محض خیالات کی وسعت، بلندی، گہرائی اور زور استدلال میں شعراء فلسفیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ خواہ کتنے ہی عمیق خیالات رکھنے والا شاعر ہو وہ افلاطون، سپنوزا، کانٹ، ہیگل، نطشے یا برگساں نہیں بن سکتا۔ شاعری بہرحال ایک الگ فن ہے جو فنون لطیفہ کی شاخ ہے اور اکبر بہرصورت بنیادی

طور پر شاعر ہیں۔ اس لیے اکبر کے مرتبے کے تعین کے لیے محض ان کے خیالات ہی کو جاننا کافی نہیں، یہ معلوم کرنا بھی اشد ضروری ہے کہ وہ پیشکش کے اعتبار سے کس پائے کے شاعر ہیں؟

اسالیب

اکبر کے اسالیب اظہار متعدد اور متنوع ہیں جن میں کچھ سانچے روایتی ہیں اور کچھ جدت و اجتہاد کے مظہر۔ روایتی سانچوں میں غزلیات، مثنویات، قطعات، رباعیات اور مسمط وغیرہ کی چند شکلیں شامل ہیں۔ دوسری قسم میں ان کے طنز و ظرافت کے جملہ اسالیب اور ان کی ذیل میں بعض نئے صنفی تجربے آتے ہیں۔ اگرچہ اکبر کے ہاں بعض روایتی سانچے بھی روایتی حدیں توڑ کر آگے نکل گئے ہیں۔ اور ان کی حدود میں اس قدر تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ کہ بسا اوقات ان کی شکل بمشکل پہچانی جاتی ہے، مگر دوسری قسم کے اسالیب کی وجہ سے انہیں زیادہ شہرت حاصل ہے، اس باب میں ان کی طنز و ظرافت کے اسالیب سے بحث ہو گی۔ اصناف شعری اور ہیتوں کی بحثیں ہم اگلے باب کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔

اکبر کی انفرادیت کا باعث زیادہ تر ان کی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری سمجھی جاتی ہے اور عام طور پر یہ خیال رائج ہو گیا ہے کہ وہ صرف طنز و مزاح کے شاعر ہیں(۳)۔ مگر عبد الماجد دریابادی نے بالکل صحیح لکھا ہے:

> "کلیات سوم میں خالص ظریفانہ اشعار شاید دس فی صدی بھی نہ نکلیں، حالانکہ کلیات اول و دوم میں ظریفانہ اشعار کا تناسب تیس فی صدی سے کسی حال میں بھی کم نہ تھا۔"(۴)

اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے کلام کا بہت بڑا حصہ عملاً نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ ماقبل اوراق میں ان کے سنجیدہ اور حکیمانہ کلام کا ذکر ہو چکا ہے یہاں ان کے اسی مشہور عالم رجحان، یعنی طنزیہ و مزاحیہ شاعری، کا ذکر کیا جائے گا۔

طنز و مزاح کو توام اصطلاحیں تصور کیا جاتا ہے مگر دراصل یہ ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ مزاح یا ظرافت خوش کرنے یا ہنسانے کا ایک دلچسپ مشغلہ ہے جس سے وقت بخوبی کٹ جاتا ہے یہ ایک قسم کی ادبی پھلجڑی ہے جسے دیکھ کر سب خوش ہوتے ہیں، مسکراتے ہیں اور قہقہے لگاتے ہیں مگر اس میں نفرت یا حقارت شامل نہیں ہوتی۔ یہ محض حیات و کائنات کی ناہمواریوں کو دکھانے کا ایک انداز ہے کیونکہ ناہمواریوں کا شعور حاصل ہونے پر سب بے اختیار ہنس دیتے ہیں۔

ظرافت کے مقابلے میں طنز سنجیدہ چیز ہے۔ یہ عموماً نفرت یا حقارت کی پیداوار ہوتی ہے۔ اس کا ایک خاص مقصد ہوتا ہے اور وہ ہے معاشرے کی لکیر سے ہٹ جانے والے پر ضربیں لگانا اور اسے اس لکیر پر واپس لانے کی کوشش کرنا۔ طنز نگار حماقتوں' برائیوں' گناہوں' بددیانتیوں اور منافقتوں کو نفرت اور حقارت کے تیروں سے چھلنی کر دینا چاہتا ہے اس لیے طنز نگار وہی ہو سکتا ہے جس کا ایک طے شدہ نقطۂ نظر ہو اور وہ اس نقطۂ نظر کے ساتھ وفاداری بشرط استواری کا رشتہ رکھتا ہو۔

طنز بنیادی طور پر تخریب ہے۔ یہ ایک منفی عمل ہے لیکن زندگی میں بعض اوقات تخریب اور نفی کی ضرورت بھی پڑتی ہے۔ بعض غلط باتوں کو لوگ اس حد تک قبول کر لیتے ہیں کہ دلائل و براہین کے ساتھ ان کی مخالفت کی جائے تو کوئی نہیں سنتا۔ ایسی حالت میں طنز نگار مضحکہ اڑا کر توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس لیے طنز ایسی تخریب ہے جو ضروری ہے۔ یہ اسی قسم کا تخریبی عمل ہے جس طرح عمل جراحی یا لرزتی ہوئی دیوار کا انہدام۔ ظاہر ہے کہ یہ تخریبی عمل نہ کیے جائیں تو مواد فاسد مریض کو ہلاک کر دے اور لرزتی ہوئی دیوار خطرۂ جان بن جائے۔ اگر طنز کرتے وقت انداز بیان سنجیدہ رکھا جائے تو یہ ناقابل برداشت چیز بن جائے گی۔ اس لیے طنز نگار ایسے حربے استعمال کرتے ہیں جو طنز کی تلخی کو گوارا بنا دیتے ہیں اور جس پر طنز کی جائے وہ بھی اسے برداشت کر لیتا ہے۔

Matthew Hodgart نے لکھا ہے:

> All good satire contains an element of aggressive attack and a fantastic vision of the world transformed: it is written for entertainment, but contains sharp and telling comments on the problems of the world in which we live, offering imaginery gardens with real toads in them. (5)

گویا طنز نگار تضحیک کا نشانہ تو انہی خرابیوں کو بناتا ہے جو حقیقت میں موجود ہوتی ہیں مگر ناگواری کو کم کرنے کے لیے بات کا پیرایہ ایسا اختیار کرتا ہے کہ وہ خندہ آور بن جاتی ہے۔ طنز کو شکر میں لپٹی ہوئی تلخ گولی قرار دینا بالکل بجا ہے۔ اکبر الہ آبادی ایک مخصوص نقطۂ نظر رکھنے والا شاعر ہے۔ وہ تمام واقعات کو ایک خاص زاویہ نظر سے دیکھتا ہے۔ تاریخ' سیاسیات' مذہب اور معاشرت کے بارے میں اس کے واضح نظریات ہیں۔ جب وہ ان نظریات کو برباد ہوتے دیکھتا ہے تو برداشت نہیں کر سکتا۔ چنانچہ ان تمام قوتوں کے

خلاف سینہ سپر ہو جاتا ہے جو انہیں مٹانے کے درپے ہیں۔ خواہ وہ انگریز ہوں، ہندو ہوں یا نئی روشنی کے دل دادہ مسلمان۔ اس مقاومت سے اکبر کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ لوگ مذہب اور اخلاق کی روح کو فراموش نہ کریں۔ گویا اکبر ایک مقصدی فن کار ہے۔ مقصدی فن کار جب شگفتہ ادب کو ذریعہ اظہار بناتا ہے تو وہ خالص مزاح نگار بننے کی بجائے ہمیشہ طنز نگار بن جاتا ہے۔ خالص مزاح نگار وہ ہے جو دیکھنے اور دکھانے پر اکتفا کرے اور خود کسی رائے کا اظہار نہ کرے۔ یہی وجہ ہے کہ خالص مزاح کی عمدہ مثالیں اردو میں نظیر اکبر آبادی کے کلام میں موجود ہیں اور طنزیہ ظرافت کی مثالیں اکبر الہ آبادی کے ہاں۔

اکبر کی شاعری میں طنز و مزاح کے استعمال پر تفصیل سے روشنی ڈالنے سے قبل اس صنف کی بعض اصطلاحوں کے بارے میں اظہار خیال ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اردو میں طنز و مزاح کی مختلف صورتوں کے اظہار کے لیے متعدد اصطلاحیں موجود ہیں۔ لطیفہ، چٹکلہ، ظرافت، تمسخر، بذلہ، ذکاوت، تعریض، طنز، طعن، ہجو، ہزل، ٹھٹول اور ہجو ملیح وغیرہ وغیرہ ان میں سے بعض اصطلاحیں مترادفات کے طور پر استعمال کی جاتی ہیں۔ مثلاً مزاح اور ظرافت، بذلہ اور ذکاوت، تعریض اور ہجو ملیح وغیرہ وغیرہ۔ بعض اصطلاحوں کو مختلف نقاد مختلف مفاہیم میں استعمال کرتے ہیں اس لیے ہم الجھنوں سے بچنے کے لیے ان اصطلاحوں کا وہ مفہوم واضح کیے دیتے ہیں جو اس مقالے میں پیش کیا گیا ہے۔ ہمارے نزدیک مزاح کی وہ صورت، جس میں کوئی سنجیدہ مقصد کار فرما نہیں ہوتا بلکہ ہنسنے ہنسانے کے لیے ہوتی ہے، ظرافت ہے۔ کاٹ دار بات کا وار براہ راست ہو تو وہ ہجو ہے۔ اگر اسے اشارے کنائے سے کہا جائے تو وہ تعریض ہے۔ اگر طنز میں ذاتی عنصر بدگوئی کے انداز میں ابھر آئے تو وہ ہزل ہے۔

اکبر الہ آبادی کے کلام میں طنز و مزاح کی ان جملہ صورتوں کا استعمال موجود ہے۔ ان کے ہاں خال خال وہ ظرافت بھی ہے جو طنز سے بے نیاز ہے مثلاً ذیل کے اشعار کا مقصد محض ہنسنا ہنسانا معلوم ہوتا ہے، ان میں کسی پر چوٹ نظر نہیں آتی:

باہم شب وصال غلط فہمیاں ہوئیں
مجھ کو پری کا شبہہ ہوا ان کو بھوت کا

اس قدر تھا کھٹملوں کا چارپائی میں ہجوم
وصل کا دل سے مرے ارمان رخصت ہو گیا

دعویٰ بہت بڑا ہے ریاضی میں آپ کو
طول شب فراق کو تو ناپ دیجیے

اس کی بیٹی نے اٹھا رکھی ہے دنیا سر پر
خیریت گذری کہ انگور کے بیٹا نہ ہوا

مکے تک ریل کا سامان ہوا چاہتا ہے
اب تو انجن بھی مسلمان ہوا چاہتا ہے

محاورات کو بدلیں براہ ریل جناب
ٹکٹ بدست کہیں اب بجائے پا بہ رکاب

"کلیات اکبر" جلد سوم کی وہ نظم جس کا مطلع مندرجہ ذیل ہے' شگفتگی کی اچھی مثال ہے:

فضل ہو اللہ کا' ہوں جمع سالے سالیاں
وہ اچھالیں بال یہ چمکائیں اپنی بالیاں

کلیات اکبر کے چاروں حصوں میں تلاش کے بعد یہی چند اشعار مل سکے ہیں جنہیں ظرافت کی مد میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ تلاش بسیار کے بعد ممکن ہے چند اور اشعار بھی دستیاب ہو جائیں مگر اتنے زیادہ اشعار میں سے معدودے چند اشعار کو بہ مشکل ڈھونڈھ نکالنا ہی اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ اکبر ظریف نہیں طناز ہیں۔

اکبر کے ہاں زیادہ تر ہجویہ اور طنزیہ اشعار ہی ملتے ہیں جن کے محرکات کی طرف اشارے کیے جا چکے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے وہ اشعار شامل ہیں جو مذمت' نکتہ چینی' ہجو اور تنقیص وغیرہ کی ذیل میں آتے ہیں۔ ان اشعار کے ذریعے انہوں نے مخاصین کے خوب لتے لے ڈالے ہیں۔ طعن' کی اصطلاح ایسے اشعار کے لیے بہت مناسب ہے۔ ان کا رنگ کچھ اس طرح کا ہے:

واہ کیا راہ دکھائی ہے ہمیں مرشد نے
کر دیا کعبے کو گم اور کلیسا نہ ملا

رنگ اڑانا اہل یورپ کا تو ہے اکبر محال
مفت اپنے آپ کو تم نے تماشا کر دیا

تہ کرو صاحب نسب نامے وہ وقت آیا ہے اب
بے اثر ہو گی شرافت' مال دیکھا جائے گا

کس قدر حار تھے سید کے وہ اجزائے رفارم
علما دے رہے قوم کو تبرید ہنوز

کیا جانئے سید تھے حق آگاہ کہاں تک
سمجھے نہ کہ سیدھی ہے مری راہ کہاں تک

آبرو چاہو اگر' انگریز سے ڈرتے رہو
ناک رکھتے ہو تو تیغ تیز سے ڈرتے رہو

مری ناکامیابی کی کوئی حد ہو نہیں سکتی
صداقت چل نہیں سکتی' خوشامد ہو نہیں سکتی

نہ شریعت' نہ طریقت' نہ محبت' نہ حیا
جس پہ جو چاہے وہ اس عہد میں تہمت رکھے

ملک میں مجھ کو ذلیل و خوار رہنے دیجئے
آپ اپنی عزت دربار رہنے دیجئے

قرآن چھوڑ بھاگے شیطان کے مقابل
اس معرکے میں اکثر احباب ہیز نکلے

اتحاد باہمی اس ملک میں آساں نہیں
کوئی سرسید ہے، کوئی بابو آشوتوش ہے

کیا پا گئے جو حرص کے کوچے میں سگ رہے
وہ کیا برے رہے کہ جو ان سے الگ رہے

ان اشعار میں خوش طبعی کی بجائے شدید تلخی ہے۔ حالانکہ ان کے موضوعات ایک دوسرے سے بے حد مختلف ہیں لیکن ان میں ایک بات مشترک ہے، اور وہ ہے اپنے ہدف پر سیدھا نشانہ لگانا۔ یہ اشعار شاہکار نہ ہوں گے تاہم ان میں اکبر کی اندرونی تلخی اور حرارت اس حد تک بھری ہوئی ہے ہے کہ لفظ پگھلے پڑتے ہیں اور ان کی آنچ ہم آج بھی محسوس کر سکتے ہیں۔ ان میں لفظی رعاتیں مفقود ہیں یا اس قدر دبی ہوئی ہیں کہ ان کی طرف توجہ نہیں جاتی۔ جذبے میں اتنی شدت ہے کہ بس ساری توجہ اسی طرف کھنچ جاتی ہے۔

انہی اشعار کا ایک دوسرا رخ بھی کلام اکبر میں بکثرت موجود ہے۔ تلخی، غیظ و غضب، برہمی وغیرہ کا نتیجہ جب حسب منشا نہیں نکلتا تو شدید مایوسی ہوتی ہے۔ چنانچہ اکبر بالکل مایوس ہو جاتے ہیں۔ انہیں ہر طرف تباہی و بربادی دکھائی دیتی ہے۔ دنیا ان کی نظر میں ملبے کے ایک ڈھیر کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ وہ خزاں زدہ چمن کے کسی کنج ویراں میں بیٹھ کر برہنہ شاخوں کے غم میں ماتم کرنے لگتے ہیں۔ اکثر ویرانی کی یہ کیفیت شہر آشوب کے انداز میں ان کے ہاں ظاہر ہوتی ہے، کیونکہ شہر آشوب بھی شہر کی ویرانی کا ماتم ہے۔ (۶)

اکبر کے ہاں اس آشوب کی چند جھلکیاں ملاحظہ کیجئے:

انقلاب دہر دیکھو بن گیا آقا غلام
قصر کا مالک جو تھا اب اس کا درباں ہو گیا

فلک کے دور میں ہارے ہیں بازی اقبال
اگرچہ شاہ تھے، بدتر ہیں اب غلام سے ہم

ہوا ہوں اس قدر افسردہ رنگ باغ ہستی سے
ہوائیں فصل گل کی بھی نشاط افزا نہیں ہوتیں

اکبر ہمارے عہد کا اللہ رے انقلاب
گویا وہ آسمان نہیں، وہ زمیں نہیں

افسوس کہ گلشن کو خزاں لوٹ رہی ہے
شاخ گل تر سوکھ کے اب ٹوٹ رہی ہے

وہ ہوا نہ رہی، وہ چمن نہ رہا، وہ گلی نہ رہی، وہ حسیں نہ رہے
وہ فلک نہ رہا، وہ سماں نہ رہا، وہ مکاں نہ رہے، وہ مکیں نہ رہے
وہ گلوں میں گلوں کی سی بو نہ رہی، وہ عزیزوں میں لطف کی خو نہ رہی
وہ حسینوں میں رنگ وفا نہ رہا، کہیں اور کی کیا وہ ہمیں نہ رہے
جو تھیں چشم فلک کی بھی نور نظر، وہی جن پہ نثار تھے شمس و قمر
سو اب ایسی مٹی ہیں وہ انجمنیں کہ نشان بھی ان کے کہیں نہ رہے

شاہ و سلطاں سے رعایا کی مروت نہ رہی
پاس ملت نہ رہا، دین کی غیرت نہ رہی
وہ عقیدے نہ رہے اور وہ حکومت نہ رہی
دل کا مرکز نہ رہا، ہاتھ کی طاقت نہ رہی
این چہ شوریست کہ در دور قمر می بینم
ہمہ آفاق پر از فتنہ و شر می بینم

اگر ان اشعار کا مقابلہ شاہ حاتم، سودا، میر اور نظیر وغیرہ کے شہر آشوبوں سے کیا جائے تو حیرت انگیز مماثلتیں ملیں گی۔ شہر آشوبوں کے سلسلے میں ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے جو کچھ لکھا ہے، اس میں سے چند جملے تحریر کیے جاتے ہیں تاکہ اندازہ ہو سکے کہ اکبر کا مندرجہ بالا انداز حقیقتاً شہر آشوب ہی کا انداز ہے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں :

"شاہ حاتم نے بارہویں صدی ہجری کے دور کج رفتار کا ذکر کرتے ہوئے ملک کی

سیاسی' معاشی اور معاشرتی حالت پر تنقید کی ہے... وہ کہتے ہیں کہ... لوگوں سے مہر و محبت اور سخاوت و پیار کے جذبات مفقود ہوتے جا رہے ہیں... زمانے کے ہاتھوں شرفا کے ذلیل و خوار ہونے اور کمینے' رذیل اور ادنیٰ قسم کے لوگوں کے صاحب مال و متاع بن جانے پر حاتم نے بڑے رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔"

"سودا نے دلی کی بربادی کا نوحہ کیا ہے... اسے گردش دہر نے ایسا ویران کر دیا ہے کہ اب وہاں ہزار گھر میں سے ایک گھر میں مٹی کا ایک ٹوٹا ہوا چراغ ٹمٹما کر اس بربادی پر نوحہ کناں نظر آتا ہے... جن گلستانوں میں رنگا رنگ' نوبہ نو اور تر و تازہ پھولوں کی بہار آنکھوں میں تازگی' دلوں میں شگفتگی اور روحوں میں سرور و کیف پیدا کر دیتی تھی' ان کی روشوں میں اب کمر کمر تک گھاس اگی ہوئی ہے۔"(۷)

ان جملوں سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اکبر الہ آبادی مندرجہ بالا اشعار میں شہر آشوب کی صنف سے کتنے قریب آگئے ہیں۔ شہر آشوب بھی ہجویہ شاعری ہی کی ایک قسم ہے بقول ڈاکٹر سید عبد اللہ:

"شہر آشوب اصطلاحاً" اس نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی شہر یا ملک کی اقتصادی یا سیاسی بے چینی کا تذکرہ ہو یا شہر کے مختلف طبقوں کی مجلسی زندگی کے کسی پہلو کا نقشہ ہزلیہ' طنزیہ یا ہجویہ انداز میں کھینچا گیا ہو۔(۸)"

گویا ان اشعار میں بھی اکبر طنز نگاری کے میدان سے انحراف نہیں کرتے۔

طنز کا ایک مہذب انداز تعریض ہے۔ ہجو ملیح کی اصطلاح بھی تقریباً اسی مفہوم میں استعمال کی جاتی ہے۔ اس صنف میں شاعر براہ راست وار نہیں کرتا بلکہ کسی قرینے سے دشمن کو نشانہ بناتا ہے۔ مخاطب بظاہر کسی اور کو کرتا ہے مگر اس میں ایسا قرینہ رکھتا ہے کہ قارئین اصلی ہدف تک پہنچنے میں دقت محسوس نہیں کرتے۔ یہ مانی ہوئی حقیقت ہے کہ اگر کھلے لفظوں میں کسی کی مذمت کی جائے تو وہ مشتعل ہو جاتا ہے لیکن جب یہی مذمت دلکش انداز بیان اختیار کر لیتی ہے تو گوارا ہو جاتی ہے۔ طنز نگار کا مقصد اگر اصلاح ہے تو ظاہر ہے کہ وہ تعریض کے حربے سے زیادہ کامیابی حاصل کر سکتا ہے' جبکہ مذمت کے ذریعے وہ شدید رد عمل کو دعوت دے کر اصلاح کا دروازہ بند کر دیتا ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے لکھا ہے:

تعریض طنز کی اچھی' مہذب اور کامیاب قسم ہے۔ میریڈتھ کا قول ہے: کامیاب

ظرافت وہ ہے جو ہنسائے لیکن ساتھ ہی فکر کو بیدار بھی کرے۔ تعریض میں یہ صفت موجود ہے۔ اس میں طنز براہ راست نہیں ہوتا اس لیے یہ قاری کے دل کی گہرائی تک اتر جاتا ہے۔ دوسروں پر وار کرنا آسان ہے لیکن اپنی ذات کو طنز کا نشانہ بنانا مشکل ہے۔ تعریض میں طنز کا رخ طنز نگار کی طرف ہوتا ہے لیکن اس کی چبھن مخاطب اپنے پہلو میں محسوس کرتا ہے۔ یہ طنز مہذب اور شائستہ تو ہے ہی، موثر اور بھرپور بھی ہے۔ اس کا وار کبھی خالی نہیں جاتا۔"(۹)

تعریض کے لیے اکبر نے زیادہ تر انگریزوں کو منتخب کیا ہے۔ اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ مغربی سامراج کے جبر و تشدد کے باعث ان پر کھلی کھلی چوٹیں کر نہیں سکتے تھے۔ تعریض کا دوسرا شکار وہ دیسی افراد بنتے ہیں جو تبدیل وضع کر کے اپنے ہی ملک میں اجنبی بن چکے ہیں۔ ان پر اکبر نے پھبتیاں زیادہ کسی ہیں مگر انہیں تعریض کا نشانہ بھی بنایا ہے۔ اکبر کی تعریضوں کی مثالیں کسی قدر وضاحت کے ساتھ پیش کی جاتی ہیں۔

انگریز ہندوستان میں اکثر یہ پروپیگنڈا کیا کرتے تھے کہ یہاں کے لوگ ہماری بے جا مخالفت کرتے ہیں۔ لوگوں کو یہ بھی باور کرایا جاتا تھا کہ جاپانی، جرمن اور روسی وغیرہ بہت ظالم لوگ ہیں اور اگر وہ ہندوستان پر غالب آگئے تو یہاں کے لوگوں کو انگریزی راج کی قدر معلوم ہو جائے گی۔ پھر یہ بات بھی ذہنوں میں ڈالی جاتی تھی کہ تمام لوگ تو کسی حکومت سے بھی خوش نہیں رہتے، اس لیے انگریزوں کے خلاف جو ہلچل ہوتی ہے اس کی کوئی معقول وجہ نہیں۔ یہ محض لوگوں کی متلون مزاجی کا اظہار ہے۔ انگریزی حکومت جب کسی شورش کو دبانے کے لیے جبر و تشدد کی راہ اختیار کرتی تو اس کے لیے جواز یہ پیش کیا جاتا تھا کہ لوگ جمہوریت یا آزادی رائے کے قابل ہی نہیں ہیں۔ انگریز سختی کرتے ہیں تو محض امن عامہ کی خاطر اور اپنی ہیبت بٹھاتے ہیں تو محض قانون اور انصاف کی حکمرانی کے لیے۔ اکبر اس دلیل کو نہیں مانتے۔ ان کا خیال ہے کہ کوئی قوم کسی دوسری قوم پر حکومت کرتی ہے تو صرف اپنے سامراجی مقاصد کی تکمیل کے لیے۔ اکبر ان ساری باتوں کو بطور تعریض ذیل کے اشعار میں پیش کرتے ہیں:

رہنا کسی سے دب کر ہے امن کو ضروری
پھر کوئی فرقہ ہیبت انگیز ہے تو پھر کیا
کیسی ہی سلطنت ہو سب خوش نہ رہ سکیں گے
گر ترک ہے تو پھر کیا، انگریز ہے تو پھر کیا

اس بات کو کہ حاکموں کا اصل اصول ہمیشہ طاقت ہوتا ہے' وہ ذیل کے شعر میں بیان کرتے ہیں :

فرق جب سے ہو گیا ظاہر قلم اور تیغ کا
دل سے انشا کا جو تھا ارمان رخصت ہو گیا

انگریزوں نے رنگ و نسل کے جو امتیازات قائم کیے تھے ان پر یوں چوٹ کرتے ہیں :

یہ سچ ہے انہوں نے ملک لے رکھا ہے
ہم لوگوں سے کیمپ کو پرے رکھا ہے
لیکن ہے ادائے شکر لازم ہم پر
کھانے بھر کو ہمیں بھی دے رکھا ہے

اسی طرح انگریزوں کی لوٹ مار اور ظلم و تشدد کی پالیسی پر یوں طنز کرتے ہیں :

قدم انگریز کلکتے سے دلی میں جو دھرتے ہیں
حکومت خوب کی' اب دیکھیں شاہی کیسے کرتے ہیں

انگریزوں کے دور میں افراط زر کے باعث منگائی ہو جانے اور سونے کے محفوظ ذخیروں سے کئی گنا زیادہ کاغذی کرنسی جاری کرنے کو اس طرح نشانہ طنز بناتے ہیں :

حرج کیا روپیہ جو کاغذ کا چلا
شکر کر روٹی تو گندم کی رہی

اب تعریض کی کچھ اور مثالیں ملاحظہ فرمائیے :

مسلمانوں کو لطف و عیش سے جینے نہیں دیتے
خدا دیتا ہے کھانا شیخ جی پینے نہیں دیتے

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں' مرے ہسپتال جا کر

چار دن کی زندگی ہے' کوفت سے کیا فائدہ
کھا ڈبل روٹی' کلرکی کر' خوشی سے پھول جا

یہ کیا تم نے کہا اب کوئی ملجا ہے نہ ماویٰ ہے
خدا کے فضل سے بھائی علی گڑھ ہے' اٹاوا ہے

مری قرآن خوانی سے نہ ہوں یوں بدگماں حضرت
مجھے تفسیر بھی آتی ہے' اپنا مدعا کہئے
یہ ان کا کورس کیا کم ہے کہ میں بھی کچھ کہوں ان سے
مری جانب سے بس کالج کے لڑکوں کو دعا کہئے

ان اشعار میں مضمون جو کچھ بیان ہوا ہے اس سے زیادہ قاری کے تصور پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ بات ہر جگہ ہمدرد بن کر کہی گئی ہے اور لفظ بھی نہایت مہذب استعمال کیے گئے ہیں۔ کہیں تلخی یا گالی نہیں۔ مہذب' بفضل خدا' حضرت' دعا کہئے وغیرہ جیسے الفاظ پیرایہ بیان کی ملامت کو ظاہر کرتے ہیں۔ مگر اس نرمی کی تہہ میں ایسی مخالفت چھپی ہوئی ہے جو دشمن کے نقطۂ نظر کو اندر سے سبوتاژ کر دیتی ہے۔

کہیں کہیں اکبر طنز و تعریض کی حدوں کو پھلانگ جاتے ہیں اور وہ پھبتی گو کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس وقت وہ مخالفوں کی پگڑیاں اچھالتے نظر آتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ پھبتی برے ردعمل کو پیدا کرتی ہے اس لیے طنز نگار کی اصلاحی کوشش کو نقصان پہنچاتی ہے۔ پھبتی کہنے والا اخلاقیات کی حدود اکثر پھلانگ جاتا ہے اور بعض اوقات فحش کلامی پر اتر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پھبتی طنز کی پست شکل ہے۔ خوش قسمتی سے اکبر کے ہاں پھبتی گوئی بہت کم ہے۔ تاہم موجود ضرور ہے۔ اس کی چند مثالیں بھی پیش کرنی ضروری ہیں:

کیمپ میں پاتا ہوں یاروں کو جو کودن بیشتر
یہ اثر ہے اصطبل کا ورنہ خر کوئی نہیں

تہذیب مغربی کی بھی ہے وارنش غضب
ہم کیا جناب شیخ بھی چکنے گھڑے ہوئے

ابھرے ہیں عیب ان کے اور خوبیاں دبی ہیں
بے دین اگر نہیں ہیں تو شیخ جی غبی ہیں

ہرگز سمجھ نہ مستقل اس انقلاب کو
رکھ راہ راست' بھونکنے دے ان کلاب کو

طنز' ظرافت' ہجو' پھبتی اور تمسخر وغیرہ کے لیے مزاح نگار ہمیشہ اسلوب کے مختلف حربوں سے کام لیتے ہیں۔ اکبر نے بھی یہ حربے نہایت کامیابی سے استعمال کیے ہیں۔ کثیرالاستعمال حربے: لفظی بازی گری (وٹ)' موازنہ و مقابلہ' واقعاتی مزاح' مکالمہ' کردار' علامتیں اور تحریف (پیروڈی) ہیں۔ اکبر کے ہاں طنز ومزاح کے یہ تمام اسالیب بکثرت استعمال ہوئے ہیں۔ بعض نقادوں کا خیال ہے کہ اکبر تمام تر لفظی بازی گری سے کام لیتے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

"اکبر کی شاعری کو عام طور پر بذلہ سنجی یا وٹ کی شاعری کہا گیا ہے اور وہ اس لیے کہ بیشتر موقعوں پر انہوں نے تخیل اور معنی آفرینی کی بجائے صرف لفظی شعبدہ بازیوں سے مزاح پیدا کرنے کی سعی کی ہے.... اکبر کی شاعری میں خالص بذلہ سنجی کے ایسے اشعار بہت زیادہ ہیں اسی لیے بعض حلقوں نے اکبر کی شاعری کو محض بذلہ سنجی قرار دے کر اسے طنزیہ و مزاحیہ ادب میں ایک پست مقام دلانے کی سعی ہے' لیکن ہم ان کے کلام کے اس بہت بڑے حصے کو کیسے نظرانداز کریں جس میں اسلوب بہ نسبت خیال اور مواد پر زیادہ توجہ صرف ہوئی ہے۔"(۱۰)

وزیر آغا نے درست لکھا ہے کہ اکبر کی شاعری میں زیادہ اشعار وٹ کے ہیں اور یہ بھی صحیح کہا ہے کہ کلام کا ایک حصہ اس حربے سے بے نیاز بھی ہے۔ ہم اس میں اتنا اضافہ کریں گے کہ لفظی اور واقعاتی مزاح کے علاوہ مزاح کے کئی دیگر اسالیب بڑی تعداد میں اکبر کے ہاں موجود ہیں۔ البتہ کلیات کے کسی حصے میں وٹ زیادہ ہے کسی میں واقعاتی مزاح۔ اگر تحریف شروع ہوتی ہے تو یکے بعد دیگرے اسی قسم کے اشعار آنے لگتے ہیں۔ ہجویہ انداز آتا ہے تو اسی کی کثرت نظر آنے لگتی ہے۔ اس کے یہ اسباب ہو سکتے ہیں۔

بعض اصناف ایسی ہیں جو کسی ایک حربے کے لیے زیادہ موزوں اور دوسرے حربے کے لیے کم موزوں ہیں۔ مثلاً غزل وٹ یا لفظی مزاح کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ رباعی موازنے اور مقابلے کے لیے زیادہ مناسب ہے کہ اس کے دو اشعار میں باسانی باہمی تقابل ہو سکتا ہے۔

قطعہ اور مثنوی کی اصناف میں چونکہ تسلسل پایا جاتا ہے اس لیے وہ واقعاتی مزاح کے

لیے نہایت مناسب ہیں۔ اس اصول کی روشنی میں دیکھیے تو غزلیات و فردیات میں لفظی مزاح' رباعیات میں موازنہ و مقابلہ اور قطعات و مثنویات میں واقعاتی مزاح کے نمونے زیادہ ملتے ہیں۔ مگر اس اصول کو کلیہ نہیں سمجھنا چاہیے۔ عموماً ایسا ہی ہوا ہے مگر مستثنیات بھی موجود ہیں۔

بہرحال لفظی مزاح یا وٹ کا حربہ اکبر کے ہاں بہت استعمال ہوا ہے۔ بعض نقادوں نے اکبر کی شاعری کو محض بذلہ سنجی قرار دے کر اسے طنزیہ و مزاحیہ ادب میں پست مقام دلانے کی کوشش کی ہے' مگر مزاح کی کسی ایک قسم یا حربے کو دوسرے کے مقابلے میں کم تر قرار دینا مناسب نہیں۔ لفظی بازی گری نہایت کامیاب تاثر پیدا کر سکتی ہے اور واقعاتی مزاح نہایت ناکام بھی ہو سکتا ہے۔ در حقیقت یہ مسئلہ مزاح و طنز کی اقسام کے زیادہ یا کم قیمت ہونے کی صورت میں نہیں دیکھا جانا چاہیے' بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ مزاح لفظی ہو یا واقعاتی یا کچھ اور' اس کا اظہار فنکارانہ ہے یا نہیں۔ اکبر کے ہاں لفظی الٹ پھیر بیشتر جگہ فن کے اعتبار سے نہایت کامیاب ہے۔ انہوں نے لفظوں کے تلازمات یا ان کے اُلٹ پھیر سے جادو کا سا اثر پیدا کر دیا ہے۔

اکبر کے ہاں لفظی مزاح بہت سی شکلوں میں ظاہر ہوا ہے۔ کہیں محاورے اور ضرب الامثال کی مدد سے' کہیں لفظوں اور ٹکڑوں کی تکرار کے ذریعے' کہیں لفظوں کو مقلوب کر کے اور کہیں صنعت گری کے وسیلے سے وغیرہ وغیرہ۔ محاورات کا استعمال اکبر کے ہاں سلیقے سے ہوا ہے۔ وہ عام' عامیانہ اور خاص ہر قسم کے محاوارت پر عبور رکھتے ہیں اور ان کے محل استعمال سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ محاورہ چونکہ کسی علاقے کی تہذیبی زندگی کا عکاس ہوتا ہے اس لیے اکبر کی محاورہ بندی ان کے تہذیبی مزاج کو سمجھنے میں بہت مدد دیتی ہے تہذیب کی ایک خاص سطح پر پہنچا ہوا آدمی کھل کھلا کر نہیں ہنستا بلکہ محض زیر لب مسکرا دیتا ہے۔ اکبر کے ہاں محاورے اور ضرب الامثال زیر لب تبسم اور کہیں قہقہے کو تحریک دیتے ہیں:

آپ کے ہو نہیں سکتے ہیں یہ غربی ریزے
دل نہ ٹھہرے تو نگل جائیے ہیرے کی کنی

سیاہ کرنا دلوں کا اسے ہے کیا مشکل
تمہارا علم لگاتا ہے آفتاب میں داغ

مصارف مئے لندن نہ ہو سکے برداشت
غرض کہ یاروں میں افیون ہی گھلی آخر

حسرت بہت ترقی دختر کی تھی انہیں
پردہ جو اٹھ گیا تو وہ آخر نکل گئی

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بی بیاں
اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

میرے منصوبے ترقی کے ہوئے سب پامال
بیج مغرب نے جو بویا وہ اگا اور پھل گیا
بوٹ ڈاسن نے بنایا میں نے اک مضموں لکھا
ملک میں مضمون نہ پھیلا اور جوتا چل گیا

ممکن نہیں ان کے حکم سے سر پھیروں
دل میں مرے ان کا اب تو ڈر بیٹھ گیا
ان کو یہ خوشی کہ اب رہے گا یہ غلام
مجھ کو یہ خوشی کہ قافیہ بیٹھ گیا

اکبر مختلف ٹکڑوں کی تکرار اور لفظوں کے الٹ پھیر کے ذریعے مزاح پیدا کرنے کے بہت شائق ہیں:

ہم انقلاب کے شائق نہیں زمانے میں
کہ انقلاب کو بھی انقلاب ہی دیکھا

یہ پاس اور وہ پاس، نہ موجد نہ اہل زر
اخبار میں جو چھپ گئے ارماں نکل گیا

کمر باندھی بھی یاروں نے جو راہ حب قومی میں
وہ بولے تو نہیں چلتا وہ بولے تو نہیں چلتا

دعا ہے کہ مر کر بھی رہ جاؤں کچھ
وگرنہ یونہی مر کے رہ جاؤں گا

نہیں ہے تمہیں کچھ بھی سید سے نسبت
تم انگریزی داں ہو، وہ انگریز داں ہے

ان اشعار میں الفاظ کی تکرار ہے مگر ذیل کے شعروں میں لفظی الٹ پھیر ہے:

کرزن و کچنر کی حالت پر جو کل
وہ صنم تشریح کا طالب ہوا
کہہ دیا میں نے کہ ہے یہ صاف بات
دیکھ لو تم زن پہ نر غالب ہوا

عاشقی کا ہو برا اس نے بگاڑے سارے کام
ہم تو اے بی میں رہے اغیار بی اے ہو گئے

ح حکومت کی جب نہ ان میں رہی
حنفی نفی ہیں، معطل ہیں

بوزنے کو ارتقا نے کر دیا انساں تو کیا
انقلاب حرف نے مولی کو ولیم کر دیا

کہاں کا حرام اور کہاں کا حلال
مٹے ہائے حتیٰ' رہے رام لال

اکبر صرف لفظی مزاح یا وٹ ہی کے ماہر نہیں۔ واقعاتی مزاح میں بھی انہیں مہارت حاصل ہے۔ جن لوگوں نے انہیں صرف لفظی مزاح کا ماہر تسلیم کیا ہے' ان کی نظر محض ان کی غزلیات پر ہے۔ دوسری اصناف کو انہوں نے نظر انداز کر دیا ہے۔ غزل ایسی صنف ہے جو مضامین کے اختصار کے سبب واقعاتی مزاح کی بہت کم متحمل ہو سکتی ہے۔ جب کہ غزل کے دو مصرعوں میں لفظی مزاح پیدا کرنا زیادہ سہل ہے۔ اکبر جب نظمیہ اصناف میں شعر کہتے ہیں تو ان کے ہاں واقعاتی مزاح ابھر آتا ہے۔ خصوصاً مثنوی اور قطعے کی اصناف میں انہوں نے جو نظمیں لکھی ہیں' ان میں واقعاتی مزاح کے بے شمار نمونے موجود ہیں۔ واقعاتی مزاح اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کوئی واقعہ بجائے خود مضحکہ خیز ہو اور اس کو مضحک بنانے کے لیے لفظی الٹ پھیر سے مدد لینے کی ضرورت نہ ہو۔ اکبر کے طویل قطعات واقعاتی مزاح کے کامیاب نمونے ہیں۔ ان میں بالخصوص وہ قطعات جن کے "شعر اول" درج ذیل ہیں' خاصے کی چیز ہیں:

اک لعبت چیں کو لندن سے جو بیاہ کے لائے مفاعلین
احباب نے تیر مطاعن سے ان کے دل کو مجروح کیا

سید سے آج حضرت واعظ نے یہ کہا
چرچا ہے جابجا ترے حال تباہ کا

خدا حافظ مسلمانوں کا اکبر
مجھے تو ان کی خوشحالی سے ہے یاس

اک مس سیمیں بدن سے کر لیا لندن میں عقد
اس خطا پر سن رہا ہوں طعنہ ہائے دلخراش

اس سے یہ خیال کرنا صحیح نہ ہو گا کہ ان کے مختصر قطعات' رباعیات یا غزلیات کے متفرق اشعار مزاح سے یکسر خالی ہیں۔ ان میں بھی واقعاتی طنز و مزاح کے بعض نہایت لطیف نمونے ملتے ہیں' یہ الگ بات کہ ان کی تعداد کم ہے۔ ان کی بعض دلچسپ مثالیں یہ ہیں:

محلے میں نہ کی جب شیخ کی وقعت عزیزوں نے
تو بیچارہ کمیٹی ہی میں جا کر کود اچھل آیا

اسلام کی رونق کا کیا حال کہیں تم سے
کونسل میں بہت سید، مسجد میں فقط جمن

حریفوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

تھی شب تاریک، چور آئے، جو کچھ تھا لے گئے
کر ہی کیا سکتا تھا بندہ کھانس لینے کے سوا

مغربی ذوق ہے اور وضع کی پابندی بھی
اونٹ پر چڑھ کے تھیٹر کو چلے ہیں حضرت

مصیبت میں بھی اب یاد خدا آتی نہیں ان کو
دعا منہ سے نہ نکلی، پاکٹوں سے عرضیاں نکلیں

وہ فقط وضع کے کشتے ہیں، نہیں قید کچھ اور
بھینس کو گون پنھا دیجئے، عاشق ہو جائیں

ادھر سرخی مے گلگوں کی تھی، انڈوں کی زردی تھی
ادھر ریش سفید اپنی تھی اور شدت سے سردی تھی

اکبر کے ہاں طنز و مزاح پیدا کرنے کا ایک اور اہم حربہ تحریف (پیروڈی) ہے۔ پیروڈی یا تحریف کسی مشہور فن پارے میں جزوی تبدیلی کر کے اسے نیا مفہوم عطا کرنے کا نام ہے۔ اس کے کئی مقاصد ہو سکتے ہیں۔ مثلاً اس مشہور فن پارے کا مذاق اڑانا یا اس کے وسیلے سے ایک الگ طنزیہ مفہوم پیدا کرنا یا محض ہنسنے ہنسانے کے مقصد سے ترمیم کرنا۔ اکبر

نے تحریف کو زیادہ تر دوسرے مقصد کے لیے استعمال کیا ہے یعنی کسی مشہور ادب پارے میں جزوی تبدیلی کر کے اس کے وسیلے سے ایک الگ طنزیہ مفہوم پیدا کیا ہے۔ اس کے لیے انہوں نے اکثر سعدی' حافظ' جلال الدین رومی وغیرہ کے اشعار سے کام چلایا ہے۔ اس کے علاوہ فارسی اور اردو شاعروں کے بعض نہایت مشہور اشعار بھی اس مقصد کے لیے تحریف کا نشانہ بنے ہیں۔ ذیل میں چند اشعار اپنی اصل صورت میں اور ہر شعر کے نیچے تحریف شدہ اشعار درج کیے جاتے ہیں تاکہ تحریف کی نوعیت کا اندازہ ہو سکے:

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل مارا
بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را
اگر آں شاہد مغرب بدست آرد دل مارا
بچشم مست او بخشیم تسبیح و مصلےٰ را

الا یا ایھا الساقی ادر کاسا" و ناولھا
کہ عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکلھا
الا یا ایہا الطفلک بجو راحت بناولھا
کہ قرآں سہل بود اول ولے افتاد مشکلھا

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں
بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد
اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز پانیر
کرزن چہ گفت و مل چہ شنید و ملر چہ کرد

پسر نوح با بداں بہ نشست
خاندان نبوتش گم شد
رفت دنبال ڈارون آں شوخ
بوزنہ ماند و آدمی گم شد

تاک را سرسبز کن اے ابر نیساں در بہار
قطرہ تا مے تواند شد چرا گوہر شود
ہیٹ را نہ بر سر من جائے دستار اے عزیز
مرد تا مسٹر تواند شد چرا قبلہ شود

کریما بہ بخشائے بر حال ما
کہ ہستم اسیر کمند ہوا
کریما بہ بخشائے بر حال قوم
صلواۃ است رائج در ایشاں نہ صوم

رشتہ در گردنم افگندہ دوست
میبرد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست
رشتہ در گردنم افگندہ پیٹ
میبرد ہر جا کہ کیک است و پلیٹ

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن
آخری عمر میں کیا خاک مسلماں ہوں گے
عمر تو مجلس درگاہ میں کاٹی ساری
آخری وقت میں کیا خاک وہابی ہوں گے

میر کے دین و مذہب کو کیا پوچھو ہو اب ان نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا قول یہ تھا جس کا اک دن
جاکٹ پہنی، ہیٹ لگائی میر تھا اب وہ مسٹر ہے

بالکل واضح ہے کہ ان تحریفوں کا مقصد اصل اشعار کا مضحکہ اڑانا نہیں بلکہ ان کے ذریعے سے اس عہد کے بعض رجحانات پر طنز کرنا مقصود ہے۔ ان تحریفوں میں مجھے صرف ایک تحریف ایسی نظر آئی ہے جس کا مقصد اصل اشعار کا مذاق اڑانا معلوم ہوتا ہے۔ وہ

تحریف اشعار اقبال کی ہے۔ اقبال نے پہلے "ترانہ ہندی" کے نام سے ایک نظم لکھی جس کا ایک مصرع ہے: "ہندی ہیں ہم' وطن ہے ہندوستان ہمارا" اس کے بعد انہوں نے ایک نیا نظریہ وطنیت پیش کیا اور نظم بعنوان "ترانہ ملی" میں اس مصرعے کو یوں بدل دیا: "مسلم ہیں ہم' وطن ہے سارا جہاں ہمارا"۔ اکبر نے ان مصرعوں کی اور اس کے ساتھ ساتھ اقبال کے دونوں نظریات کی تنقید تحریف کے انداز میں یوں کی ہے:

کالج میں ہو چکا جب یہ امتحاں ہمارا
سیکھا زباں سے کہنا ہندوستاں ہمارا
رقبے کو کم سمجھ کر اکبر یہ بول اٹھے
ہندوستان کیسا' سارا جہاں ہمارا
لیکن یہ سب غلط ہے' کہنا یہی ہے لازم
جو کچھ ہے وہ خدا کا' وہم و گماں ہمارا

مزاح نگار اکثر اوقات تضاد و تقابل کے ذریعے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ چونکہ دو متضاد چیزوں کو دیکھ کر ہنسی خود بخود پھوٹ نکلتی ہے۔ تضاد کو ہنسی کا محرک تسلیم کرنے ہی کا سبب ہے کہ سرکس میں کرتب دکھانے والا اپنا کمال دکھا کر چلا جاتا ہے تو جوکر اس کی نقل کر کے لوگوں کو ہنساتا ہے۔ یا اگر ایک دروازے سے دو افراد داخل ہوں جن میں متضاد جسمانی خصوصیات ہوں—— مثلاً ایک بہت موٹا اور دوسرا بالکل دبلا ہو یا ایک بہت بلند قامت اور دوسرا نہایت پستہ قامت ہو--- تو دیکھنے والے ہنسی روک نہیں سکتے۔ جب تضاد اور تقابل سے ہنسی کا پیدا ہونا لازم ہے تو مزاح و طنز لکھنے والوں کا اس حربے سے استفادہ کرنا بھی ضرور ہے۔ اکبر بھی اس سلسلے میں استثنائی حیثیت نہیں رکھتے۔ انہوں نے بھی اکثر متضاد کیفیات کو پہلو بہ پہلو رکھ کر اس سے مزاح پیدا کیا ہے اور طنز کو موثر بنانے میں بڑا کام کیا ہے:

کیسی نماز' بال میں ناچو جناب شیخ
تم کو خبر نہیں کہ زمانہ بدل گیا

عوض قرآن کے اب ہے ڈارون کا ذکر یاروں میں
جہاں تھے حضرت انساں' وہاں بندر اچھلتے ہیں

شوق لیلائے سول سروس نے مجھ مجنوں کو
اتنا دوڑایا، لنگوٹی کر دیا پتلون کو

ان کے گلشن میں دیا کرتا ہے اسپیچ وفا
زاغ ہو جائے گا اک دن آنزیری عندلیب

آج وہ ہنستے ہیں میرے جبہ و دستار پر
کل فلک ان کو اگر بندھوائے دھوتی تو سہی

ہماری محفلیں اب بھی لطیف اجزا سے مملو ہیں
بز اخفش تھے پہلے اور اب اسپنسر کے ٹٹو ہیں

دید کے قابل اب اس الو کا فخر و ناز ہے
جس سے مغرب نے کہا تو آنزیری باز ہے

ان اشعار میں متضاد کیفیات اور مخالف خیالات سے طنز و مزاح پیدا کیا گیا ہے۔ نماز اور ناچ ــــ انسان اور بندر ــــ لنگوٹی اور پتلون ــــ زاغ اور عندلیب ــــ دستار اور دھوتی ــــ بزاخفش اور اسپنسر کا ٹٹو ــــ الو اور باز ــــ یہ تمام اسی تقابل کی مثالیں ہیں جو خندہ آور ہیں۔ اگرچہ یہ کہنا درست نہ ہو گا کہ ان اشعار کا تاثر تمام تر محض مندرجہ بالا متضاد الفاظ تک محدود ہے۔ ان میں اور بھی کئی نکات ہیں مگر تضاد اور تقابل نے بھی ہر شعر میں بھرپور کام کیا ہے۔

اکبر نے بہت کم، تاہم کہیں کہیں مکالمے اور افراد کے لہجے سے بھی مزاح پیدا کیا ہے۔ خصوصاً جہاں یورپی افراد کی اردو بول چال کا خاکہ اڑایا ہے وہاں وہ مزاح پیدا کرنے میں پوری طرح کامیاب ہوئے ہیں۔ چند مثالیں یہ ہیں:

رکیے اگر تو ہنس کے کہے اک بت حسین
ول مولوی یہ بات نہیں ہے گناہ کا

وہ مس بولی میں کرتی آپ کا ذکر اپنے فادر سے
مگر آپ اللہ اللہ کرتا ہے، پاگل کا مافک ہے

ہوئی کس درجہ کلفت کیمپ میں ایسے سوالوں سے
یہ تم کس واسطے لکھا، یہ تم کس واسطے بولا

قاصد ملا جب ان سے وہ کھیلتے تھے پولو
خط رکھ لیا یہ کہہ کر اچھا سلام بولو

ایک مختلف مثال بھی درج ذیل جس میں شیخ کا مکالمہ ہے:

شیخ جی پر یہ قول صادق ہے
چاہ زم زم کے آپ مینڈک ہیں
شیخ جی کو جو آ گیا غصہ
لگے کہنے یہ پھینک کر دھسہ
تم ہو شیطان کے مطیع و مرید
تم کو ہر ایک جانتا ہے پلید

اسی طرح کے مکالماتی انداز کی چند اور مثالیں بھی اکبر کے ہاں موجود ہیں۔

طنز و مزاح کے مندرجہ بالا حربے استعمال کرنے کے علاوہ اکبر کے ہاں بعض سنجیدہ اسالیب شعری بھی خصوصیت سے لائق توجہ ہیں۔ اسلوب کی ان خصوصیات کے مطالعے کے بغیر مطالعہ اکبر تشنہ رہے گا۔ Hodgart طنز کے متعلق لکھتا ہے:

> "Like poetry it rests on the ability to discover and reveral the power hidden in language e.g., similarities in sound (pun or rhyme) or unexpected parrallels in grammar and syntax."(11)

دوسرے لفظوں میں یہ کہ طنز نگار کو زبان پر عبور ہونا چاہیے۔ اسے لفظوں کے مفاہیم اور ان کے معانی کے باریک اختلافات سے بھی آگاہ ہونا چاہیے۔ اس کے لیے لفظ سے لفظ کا رشتہ ملانا بھی ضروری ہے اور پھر معاملہ محض الفاظ پر آ کر نہیں رک جاتا۔ اظہار کے تمام وسائل: محاورہ و روزمرہ، تشبیہ و استعارہ، کنایہ و علامت اور مجازی پیرایہ ہائے بیان

وغیرہ سے اسے بخوبی واقف ہونا چاہیے۔ اکبر الہ آبادی کے کلام کو اس نظر سے بھی دیکھیے تو وہ زبان کے ماہر نظر آتے ہیں۔ انہوں نے جو اسالیب بیان مختلف جگہوں پر مختلف مضامین کے لئے اپنائے ہیں وہ بہت موزوں معلوم ہوتے ہیں۔ ان سے خیال کا تاثر پوری طرح پڑھنے والے تک منتقل ہو جاتا ہے۔ ان کی امیجری نہایت دلچسپ اور بے حد منفرد ہوتی ہے۔ وہ اوزان سے اچھی طرح واقف ہیں اور عموماً خیال کے لیے صحیح وزن منتخب کرتے ہیں۔ اگرچہ اس معاملے میں ان سے بعض کوتاہیاں بھی ہوئی ہیں۔ مثلاً بعض اوقات وہ المیہ مضامین کے لیے رواں دواں سالم بحریں استعمال کرتے ہیں۔ ان کی بندشیں عموماً چست اور الفاظ نپے تلے ہوتے ہیں۔ وہ قافیوں کے بڑے ماہر ہیں۔ انہوں نے بہت سے پیرایہ ہائے اظہار کا اردو ادب میں اضافہ کیا ہے۔ ذیل میں ان کے اسالیب بیان کی بعض اہم خصوصیات پیش کی جاتی ہیں۔

لفظی رعایتیں

لفظوں کے باہمی تعلق سے واقف ہونا شاعر کے لیے بہت ضروری ہے۔ شاعری تلازمات کے بغیر دو قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ آج تک ایسی شاعری وجود میں نہیں آئی جو تلازمات سے "کلیتاً" بری ہو۔ تلازمات کی اپنی منطق ہوتی ہے جسے شعری منطق کہنا چاہیے۔ اس شعری منطق کے بغیر شعر میں نہ تو ربط پیدا کیا جا سکتا ہے، نہ معنی۔ یہی وجہ ہے کہ لفظی رعایتیں ہمیشہ شاعری کا لازمی حصہ رہی ہیں اور رہیں گی۔ اس وقت لفظی رعایتوں سے جو بیزاری پائی جاتی ہے، وہ دراصل ردعمل ہے ہماری اس شاعری کا جس نے مفہوم کی طرف توجہ نہ کی اور لفظ سے لفظ کو ترکیب دینا ہی کمال فن سمجھا۔ حالانکہ لفظی رعایتوں کی اہمیت ہے تو فقط اس صورت میں جب وہ مفہوم کو چمکائے، اس کے تاثر کو بڑھائے۔ لیکن اگر لفظی رعایتیں اپنے اس مقصد میں ناکام رہتی ہیں تو وہ محض تصنع اور بناوٹ ہیں جو قاری کو کبھی صداقت اور خلوص کا یقین نہیں دلا سکتیں۔ اردو میں صنائع کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے: (الف) صنائع لفظی (ب) صنائع معنوی۔ صنائع لفظی کا تعلق تو رسم الخط سے ہوتا ہے مگر صنائع معنوی کی حیثیت زیادہ اہم اور مستقل ہوتی ہے۔ بالخصوص صنعت مراعاۃ النظیر، تضاد، تجنیس، ایہام اور تعلیل بہت اہم اور زیادہ تر مستعمل ہیں۔ صنعت مراعاۃ النظیر کو تو کلام میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہے۔ تجنیس، تضاد اور تعلیل بھی کسی نہ کسی شکل میں آ موجود ہوتی ہیں۔ ایہام کے بغیر شعر کہے جا سکتے ہیں مگر زبان پر عبور رکھنے والے شاعر اس سے بھرپور کام لیتے ہیں۔ اکبر کے ضمن میں مراعاۃ

النظیر، تضاد، تجنیس اور تعلیل کا خصوصی ذکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ ان سے کسی شاعر کا کلام مبرا نہیں ہے۔ البتہ ایہام کا خصوصی ذکر ضروری ہے کیونکہ انہوں نے ایہام سے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔

یہ بات بجائے خود دلچسپ ہے کہ شمالی ہندوستان میں سب سے پہلے جب اردو شاعری برگ و بار لائی تو وہ ایہام ہی کی صورت میں تھی۔ محمد شاہ کی سلطنت کے بیس پچیس سال تک یہ رنگ خوب چمکا مگر نادری حملہ اس کے لیے موت کا پیغام ثابت ہوا۔ میر و سودا اور ان کے معاصرین جب تک ایہام گوئی سے اپنی بریت کا اعلان نہیں کرتے تھے انہیں چین نہ آتا تھا۔ اس وقت سے لے کر اکبر الہ آبادی تک شاعری کے کتنے ہی ادوار گزر چکے ہیں ڈھونڈے سے ایہام کے اکا دکا اشعار شعرا کے کلام سے نکل آتے ہیں۔ مگر خصوصی طور سے اس طرف کوئی مائل نہیں ہوا۔ تاہم اکبر الہ آبادی کو ایہام سے خصوصی دلچسپی معلوم ہوتی ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ محمد شاہی دور کے شعرا کے لیے ایہام ایک دلچسپی کی چیز تھی اور مجلس آرائیوں کے لیے ایک دلکش مشغلہ۔ بزم میں کسی نے کوئی جملہ کہا۔ اس میں دو مطالب کا التزام کیا۔ حاضرین مجلس ہنس دیے، داد مل گئی۔ نشانہ بننے والا فرد ایہام کی وجہ سے گرفت نہ کر سکا۔ مقصد اکبر کا بھی یہی تھا مگر اسے یہ کام بدلے ہوئے اور خطرناک حالات میں کرنا پڑا۔ ان کا یہ ہتھیار غیر ملکی حکومت اور اس کے متاثرین کے خلاف استعمال ہوا۔ سبب اس کا بھی یہی تھا کہ دل کی بات بھی کہہ لیں اور گرفت بھی نہ کی جا سکے۔ عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں :

> "ستمبر ۱۹۱۴ء میں جب یورپ کی پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تھی تو بالکل ابتدا میں اعلان جنگ آسٹریا اور سرویا کے درمیان ہوا تھا۔ برطانیہ اس وقت تک الگ تھا۔ اکبر نے فی الفور ایک نظم کہی۔ ایک مصرع تھا :
>
> بحمد اللہ اب خون شہیداں رنگ لایا ہے
>
> مسجد کانپور کے سلسلے میں گولی چلنے اور مسلمانوں کے شہید ہونے کا واقعہ تازہ تھا۔ خون شہیداں کی تلمیح اسی جانب سمجھی گئی اور شاعر صاحب دھر لئے گئے.... کچھ دن ظاہر کی احتیاط رہی بھی لیکن تخلیے کی مجلسوں میں قاضی و محتسب کی دسترس سے دور شغل اس وقت بھی جاری ہی رہا.... جنگ یورپ کی تلمیحوں سے اس دور کی غزلیں خالی نہیں۔" (۱۳)

عبدالماجد نے تلمیح کا لفظ علامت کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ علامت کے ساتھ

ساتھ ایہام کی غرض و غایت بھی یہی ہے۔ ایہام اکبر نے بے شک اسی مقصد کے لیے اختیار کیا تھا مگر جب اس سے دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے تو پھر یہ دوسری اقسام کے مضامین میں بھی ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ ذیل میں دونوں طرح کی ایہام گوئی کی کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ پہلے چند ایسے اشعار تحریر کیے جاتے ہیں جو سیاسی یا معاشرتی مضامین پر مشتمل ہیں اور جن میں ایہام سے فائدہ اٹھایا گیا ہے:

ان کی خواہش مری نسبت ہو جو کچھ وہ جانیں
میں تو کرتا ہوں دعا لائیں نصاریٰ اسلام

اس میں لفظ 'اسلام' سے ایہام پیدا کیا گیا ہے۔ اس کا ایک مفہوم ہے اطاعت اور دوسرا امن و امان۔ ظاہر ہے کہ اکبر کی مراد یہ ہے کہ انگریز مطیع ہو جائیں۔ مگر یہ باغیانہ خیال ہوتا اس لیے سلامتی کا مفہوم بھی اس میں رکھا گیا۔

ہر طرح عاجزی ہماری ہے
اب ہمارے امام حنبل ہیں

یہاں ایہام 'حنبل' کے لفظ میں ہے۔ قریب کا مفہوم ذہن میں امام حنبل آتا ہے مگر دراصل یہاں انگریزی لفظ Humble مراد لیا گیا ہے۔ کہنا یہ چاہا ہے کہ حکمرانوں کے مقابلے میں ہم بالکل عاجز ہو چکے ہیں۔

کونسلوں میں سوال کرنے لگے
قومی طاقت نے جب جواب دیا

'جواب دیا' کا ایک مطلب سوال کرنا سے وابستہ ہے۔ دوسرا اور اصل مطلب محاورے کی رو سے یہ ہے کہ ہمت باقی نہ رہنا۔ اور یہاں یہی مفہوم مراد ہے۔

مجھ کو تو اکبر کا یہ مصرع رہا کرتا ہے ورد
جمع ہیں اولاد آدم ہند کے گیہوں کے گرد

'اولاد آدم' میں ایہام ہے۔ ایک مطلب بالکل سیدھا یہ ہے کہ "انسان"۔ دوسرا اور حقیقی مطلب یہ ہے کہ ڈارون کے نظریے کے مطابق بندر انسان کا جد امجد یعنی آدم ہے۔ گویا اولاد آدم سے مراد بندر ہے اور بندر انگریزوں کو کہا جاتا تھا۔

حسرت بہت ترقی دختر کی تھی انہیں
پردہ جو اٹھ گیا تو وہ آخر نکل گئی

یہاں 'نکل گئی' کا ایک مطلب ہے حسرت نکل گئی اور دوسرا مفہوم ہے دختر نکل گئی۔

ابتدا کی جناب سید نے
جن کے کالج کا اتنا نام ہوا
انتہا یونیورسٹی پہ ہوئی
قوم کا کام اب تمام ہوا

'کام تمام ہوا' کا ظاہری مطلب ہے کام مکمل ہوا لیکن محاورے کے مطابق خاتمہ ہوا۔

ذرا تو پختہ شریفوں کو باغ دہر میں دیکھ
انہی کا حال ہر اک سے زیادہ خستہ رہا

'شریفہ' ایک پھل ہے اور شریف کی جمع بھی ہے۔

پا کر خطاب ناچ کا بھی ذوق ہو گیا
سر ہو گئے تو بال کا بھی شوق ہو گیا

یہاں 'بال' کے لفظ کے ذریعے ایہام پیدا کیا گیا ہے۔ یعنی سر کے بال اور رقص۔
دوسری قسم ایہام کے ان اشعار کی ہے جن میں کوئی سنجیدہ مقصد پنہاں نہیں بلکہ صرف ہنسی مذاق مقصود ہے۔ مثلاً:

مجنوں کی پیاس کو بجھاتی
لیلیٰ کچھ باؤلی نہیں تھی

یہاں 'باؤلی' کے دو مفہوم ہیں۔

پیٹ چلتا ہے' آنکھ آئی ہے
شاہ ایڈورڈ کی دہائی ہے

'آئی' انگریزی میں آنکھ کو کہتے ہیں۔ اردو محاور میں 'آنکھ آئی ہے' سے مراد ہے آنکھ دکھتی ہے۔

مصارف مئے لندن نہ ہو سکے برداشت
غرض کہ یاروں میں افیون ہی گھلی آخر

'افیون ہی گھلی' محاورہ بھی ہے اور شراب کے مصارف کے مقابلے میں افیون گھولنا حقیقی معنوں میں بھی ہے۔

اپنی جبیں سے چین کے مالک اگر ہو تم
میں بھی ہوں زار روس کہ دل میرا زار ہے

یہاں 'چین' کا ایک مطلب پیشانی کی شکن اور دوسرا مطلب ملک چین ہے۔

یہ محض ایہام کی چند مثالیں ہیں ورنہ حضرت اکبر کے ہاں بلامبالغہ بیسیوں اشعار ایسے موجود ہیں جن میں صنعت ایہام سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ ہماری نظر سے اردو کا کوئی اور شاعر ایسا نہیں گزرا جس نے صنعت ایہام کو کسی سنجیدہ مقصد کے لیے استعمال کیا ہو۔

علامتیں

یہ بات مسلم ہے کہ ادب میں صراحت سے زیادہ اہمیت کنائے کی ہے۔ جو بات کھل کر کہی جائے اس میں وہ لطف پیدا نہیں ہوتا جو صرف ایک اشارے سے ہو جاتا ہے۔ ادب میں کھلے لفظوں میں مفہوم کی ادائیگی ادب کو بے لطف کر دیتی ہے، خصوصاً اگر اس کا موضوع عشق و عاشقی ہو، لیکن اگر موضوع کوئی انسانی مسئلہ ہو تو پروپیگنڈا اسے صحافت یا اعلیٰ سطح پر خطابت بنا دیتا ہے اور یہ سب صورتیں ادبی سطح سے نیچے واقع ہوئی ہیں۔ اردو شاعری میں کچھ شعرا لفظوں کے مفاہیم کو لغوی معنوں تک محدود رکھتے ہیں۔ خصوصاً ناسخ اور ان کے اکثر شاگردوں کے ہاں الفاظ کا مفہوم سیدھا سادہ لغوی ہوتا ہے۔ کچھ شعرا کے ہاں اشاریت موجود ہے مگر علامتیں بہت کم ہیں اور کثرت استعمال سے ان کے مفاہیم لغوی مطالب کی طرح متعین ہو چکے ہیں اس لیے یہ علامتیں بھی غیر موثر ہو گئی ہیں۔ اردو کے کلاسیکی شعرا کے ہاں علامتوں کے چند مخصوص سلسلے ہیں، مثلاً بہار اور اس کے متعلقات، مے کدہ اور اس کے متعلقات، دریا اور اس کے متعلقات اور صحرا اور اس کے متعلقات۔ دوسرے درجے کے تقریباً سبھی شعراء انہی علامتوں کے گرد گھومتے رہے ہیں۔ اول درجے کے کلاسیکی شعرا مثلاً میر تقی میر اور مرزا غالب وغیرہ ان سے ابھرے ضرور ہیں مگر ان کے ہاں بھی کثرت انہی علامتوں کی ہے۔ البتہ نظیر اکبر آبادی کے ہاں علامتوں اور تصویروں کے کئی نئے سلسلے ملتے ہیں اور یہی اس کی انفرادیت ہے۔ دور جدید میں حالی کے ہاں بھی کئی نئی علامتیں اور تصویریں ملتی ہیں مگر جب ہم حالی سے چل کر اکبر تک پہنچتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ شاعری کی کسی نئی دنیا میں پہنچ گئے ہیں۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اکبر کے ہاں پرانی علامتیں سرے سے موجود ہی نہیں۔ وہ یقیناً موجود ہیں۔ خصوصاً بہار و خزاں اور جام و بادہ کی علامتیں ان کے ہاں عام ہیں۔ میکدے کی علامت کو انہوں نے قدیم شعراء کے انداز میں صوفیانہ مضامین کے اظہار کے لیے برتا ہے مگر ان میں کوئی انفرادیت نظر نہیں آتی۔ بہار و خزاں کی علامتیں ان کے ہاں زیادہ کثرت سے استعمال ہوئی ہیں بلکہ سب سے زیادہ یہی علامتیں ان کے ہاں دکھائی دیتی ہیں جو اول سے آخر تک ان کے کلام کے تمام ادوار میں کسی نہ کسی مفہوم میں دکھائی دیتی ہیں۔ زیادہ تر وہ بہار کے خاتمے اور خزاں کی

ابتری کے مضامین بیان کرتے ہیں۔ ویران باغات، ٹوٹے ہوئے پیڑ، جھڑے ہوئے پتے، سوکھی ہوئی شاخیں وغیرہ ان کے ہاں بہار و خزاں کی علامتوں کے طور پر ابھرتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ ان مضامین کے ذریعے ہندوستان کی سرزمین کی مفلوک الحالی، انتشار، زوال اور افتراق کے نقشے کھینچتے ہیں۔ علاوہ ازیں انگریزوں کی آمد، ان کی لگائی ہوئی پابندیاں اور استحصال وغیرہ کے مضامین بھی اس پردے میں بیان کیے جاتے ہیں مثلاً:

رنگ رخ بہار کی زینت ہوئی نئی
گلشن میں بلبلوں کا ترانہ بدل گیا

کس قدر بے فیض ان روزوں ہوائے دہر ہے
بوئے گل کو دامن باد صبا ملتا نہیں

کچھ نہ پوچھ اے ہم نشیں میرا نشیمن تھا کہاں
اب تو یہ کہنا بھی مشکل ہے وہ گلشن تھا کہاں

چھا گئی زردی چمن پر، جلوۂ گل ہو چکا
جور صر صر کے دن آئے، دور بلبل ہو چکا

افسوس کہ گلشن کو خزاں لوٹ رہی ہے
شاخ گل تر سوکھ کے اب ٹوٹ رہی ہے

پرانی علامتوں کے علاوہ اکبر نے بعض نئی علامتیں بھی پیدا کی ہیں اور ان کے ذریعے ملک کے سیاسی، اقتصادی، مذہبی اور اخلاقی زوال کو بڑی کامیابی سے بیان کیا ہے۔ انگریزوں کی بددیانتی اور حرص و ہوس ظاہر کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنے ہم وطنوں کی نا اتفاقی، بے سمجھی، اور نقالی پر بھی تنقید کی ہے۔ ان علامتوں میں بت، پیر، مرشد، مس، صیاد، بدھو شیخ، برہمن، ناؤ، جہاز، گائے، اونٹ، بلڈاگ، مینا، کاکاتوا، زاغ، الو، پپیہا، پروانہ، شمع، کلیسا مسجد اور دیر وغیرہ زیادہ نمایاں ہیں۔ ان میں سے ہر علامت کا اکبر کے ہاں ایک متعین مفہوم ہے: مثلاً بت انگریزوں کی علامت ہے، پیر اور مرشد سید احمد خاں کی، اونٹ مسلمانوں کی، گائے ہندوؤں کی، برہمن ہندوؤں کی مذہبی جماعت کا نمائندہ، شیخ مسلمانوں کی

مذہبی جماعت کا نمائندہ، جہاز اور کشتی وغیرہ ملک کی، زاغ اور الو انگریزوں کے نقالوں کی، بدھو عام مسلمانوں کی وغیرہ وغیرہ۔ بعض جگہ اکبر نے ان علامتوں کو واضح کیا ہے۔ مثلاً:

بدھو سے صرف ہند کا مسلم مراد ہے
مقصود عاجزی ہے غرور اک فساد ہے

مگر جہاں واضح نہیں کیا وہاں بھی ایسے اشارے شعر کے الفاظ میں پنہاں کر دیے ہیں جو ذرا سا غور کرنے پر سمجھ میں آ جاتے ہیں۔ چند شعر درج ذیل ہیں جن سے بعض علامتوں کا مفہوم واضح ہو سکے گا:

دل مرا جس سے بہلتا، کوئی ایسا نہ ملا
بت کے بندے ملے، اللہ کا بندا نہ ملا
واہ کیا راہ دکھائی ہے ہمیں مرشد نے
کر دیا کعبے کو گم اور کلیسا نہ ملا

کہا پیر طریقت نے اکڑ کر اپنی ٹم ٹم پر
یہی منزل ہے جس میں شیخ کا ٹٹو نہیں چلتا

پتوار شکستہ ہے، نہیں طاقت ترمیم
ہے ناؤ میں سوراخ مگر کہہ نہیں سکتے

نہ نرے اونٹ ہو، نہ ہو بلڈاگ
نہ نرے خاک ہو، نہ ہو تم آگ

سرافرازی ہو اونٹوں کی تو گردن ماریے ان کی
اگر بندر کی بن آئے تو فیض ارتقا کہیے

تان اس بت نے اڑائی ہمیں بلملا بھولے
ہم تو ہم شیخ بھی توحید کا کلما بھولے

کیا ہوا شمع حرم تو نے بجھا دی اے دوست
دیر کے شعلہ زبانوں نے تجھے داد تو دی

بعض خاص الفاظ کو کسی وسیع مفہوم میں استعمال کیا جائے تو انہیں علامت کا نام دیا جاتا ہے۔ علامت لفظ کے لغوی مفہوم سے وسیع تر مطلب ادا کرتی ہے۔ مگر علامت کے علاوہ بھی ایک طریقہ وسیع مفہوم بیان کرنے کا ایمائیت یا رمزیت ہے جس میں مفہوم کی طرف اشارہ کر دیا جاتا ہے مگر اس میں کوئی خاص لفظ ایسا نہیں ہوتا جو مطلب کی تہیں کھولنے میں ہماری مدد کرے بلکہ مکمل شعر یا اس کے بعض ٹکڑے رہنمائی کرتے ہیں اور قاری بسا اوقات شاعر کے پس منظر سے واقف ہونے کی وجہ سے شعر باسانی سمجھ جاتا ہے۔
یہ رمزیت بھی اکبر کے کلام میں اکثر ملتی ہے:

ہم مصلحت وقت کے منکر نہیں اکبر
لیکن یہ سمجھ لو کہ وفا بھی ہے کوئی چیز

سانس لیتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں
یہ نہ سمجھیں کہ آہ کرتا ہوں

ادائے شکر کر کے احتراز اولیٰ ہے اے اکبر
ہزاروں آفتیں شامل ہیں ان کی مہربانی میں

موقع بحث نہیں، صاحب اقبال ہیں آپ
میری ہر بات بری، آپ کی ہر بات اچھی

جان ہی لینے کی حکمت میں ترقی دیکھی
موت کا روکنے والا کوئی پیدا نہ ہوا

مراد بھی ملی، ہمدرد بھی ہوئے مشہور
شریک ماتم اکبر ہوئے یہ خوب کیا

ان تمام اشعار میں وسیع مفاہیم کی طرف محض اشارے کر دیے گئے ہیں اور پوری

بات پس منظر سے واقف قاری کے ذہن پر چھوڑ دی گئی ہے۔ اور یہ ایمائی انداز اس وجہ سے اختیار کیا گیا ہے کہ یہ تمام اشعار (سوائے آخری شعر کے) انگریزوں کے متعلق ہیں۔ آخری شعر البتہ مفہوم کے اعتبار سے مختلف ہے۔ اس میں ہندو رہنماؤں بالخصوص گاندھی کے مسلمانوں سے اتحاد کی قلعی کھولی گئی ہے۔ تحریک خلافت وغیرہ میں گاندھی نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ ہندو تحریک خلافت میں مسلمانوں کا بھرپور ساتھ دیں گے۔ سادہ لوح مسلمان اس سے ہندوؤں کو اپنا ہمدرد سمجھنے لگے اور گاندھی کی چال کا شکار ہو گئے۔ یہ شعر کلیات جلد چہارم کا ہے جب خلافت تحریک بڑے زوروں پر تھی' اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہندوؤں نے خلافت کی تحریک میں مسلمانوں کا ساتھ دے کر ان کے دل جیت لیے۔ اس سے انہیں دو فائدے ہوئے کہ ان کا مقصد بھی حاصل ہو گیا اور مسلمان انہیں اپنا ہمدرد بھی سمجھنے لگے۔ اسی طرح کے وسیع مطالب دوسرے اشعار میں بھی پنہاں ہیں جن کی طرف اشعار اچٹتے ہوئے اشارے کر رہے ہیں۔

امیجری:

اکبر کی امیجری کا مطالعہ بڑا دلچسپ ہے۔ ان کے اشعار میں تصویریں' تشبیہیں' استعارے اور تمثیلیں بڑی کثرت سے موجود ہیں۔ اگرچہ ان کی امیجری کا ایک حصہ روایتی ہے مثلاً باغ' میخانہ' شمع' پروانہ وغیرہ کی امیجری مگر ایک بڑا حصہ حد درجہ منفرد' دلچسپ اور غیر روایتی ہے۔ اس میں جدت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اس معاملے میں وہ کسی طرح نظیر سے کم نہیں بلکہ بعض خصوصیات میں اس سے آگے ہیں۔ اردو شاعری عموماً امیجری کے اعتبار سے پس ماندہ واقع ہوئی ہے۔ دنیا بھر کی شاعری وقت کی تیز رفتاری کا ساتھ نہیں دے سکتی اور ہمیشہ قدامت پسند ہوتی ہے۔ ہمارے ملک میں انیسویں صدی کے آغاز سے ایک ہمہ جہتی تبدیلی آنی شروع ہوئی تھی۔ انگریزوں نے دلی پر قبضہ کرتے ہی اپنے تعلیمی ادارے کھول دیے۔ یورپ کا نیا علم فلسفے اور سائنس کی صورت میں یہاں آنا شروع ہوا۔ ہمارے طلبا کو عیسائی مذہب اور انگریزی ادب پڑھایا جانے لگا۔ یورپ کی نئی ایجادات کا چرچا ہوا اور ان میں بہت سی چیزیں روزمرہ استعمال میں آنے لگیں۔ گھڑی' برقی لیمپ' ریل گاڑی' موٹر' بیٹری' فونوگراف' تار برقی' سائیکل' ٹائپ مشین' ٹیلی فون' کیمرہ وغیرہ اجنبی نہ رہے۔ یورپی طرز کا فرنیچر اور لباس عام استعمال ہونے لگا۔ وہاں کے خوشبو دار صابن اور تیل مقبول ہوئے عمارتوں کی ساخت میں تبدیلیاں آنے لگیں اور یورپی طرز تعمیر کے نمونے ابھرنے لگے۔ یورپ کے آلات موسیقی صدائیں بکھیرنے لگے۔ نمائش' تھیٹر' بال کا شوق

پیدا ہوا۔ خوراک کے ذوق میں وسعت آنے لگی۔ سڑکیں بننے لگیں اور لوگوں کے مکانات کھلی سڑکوں کی زد میں آنے لگے۔ غرض جو معاشرتی، سیاسی، اقتصادی، معاشی اور ذہنی تبدیلی انیسویں صدی سے شروع ہوئی تھی، ایک سو سال میں عروج تک پہنچ گئی۔ مگر ہماری شاعری نے ان تبدیلیوں کو اپنی ایمجری سے بالکل باہر رکھا۔ اگر اردو شاعری کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے کیا جائے تو یہ معلوم ہو گا گویا سرے سے ملک میں کوئی تبدیلی ہی نہیں آئی۔ سوائے نئے زمانے کے چند الفاظ کے استعمال کے (اور وہ بھی پورے دیوان میں ایک دو جگہ) اور کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ غالب و ذوق کو تو چھوڑیے کہ ان کے ذہن ان تبدیلیوں کو قبول ہی نہ کر سکے اور کچھ یہ کہ اتنی ہمہ گیر تبدیلیاں ابھی آئی بھی نہ تھیں مگر حالی، آزاد، اسمٰعیل میرٹھی، شبلی اور اقبال کو کیا کہا جائے جو ان تبدیلیوں کو اپنی ایمجری میں ظاہر کرنا نامناسب سمجھتے ہیں۔ اقبال اسلوب کے اعتبار سے کلاسیکی نمونوں سے ہرگز نہیں ہٹے حالانکہ وہ اکبر سے تقریباً تیس سال چھوٹے تھے۔ اس سے ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ہماری پوری شاعری پر غزل کے اسلوب کی مہر ثبت ہو چکی تھی جو ایمجری کی کسی تبدیلی کو بہت کم گوارا کرتی ہے۔ مگر اکبر الہ آبادی واحد شاعر ہیں کہ جن کی ایمجری کا مطالعہ ان تمام تبدیلیوں کا مکمل شعور بخش دیتا ہے۔

اکبر کے کلیات کا ایک سرسری مطالعہ ہمارے ذہن میں یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ ہم جس دنیا میں سانس لے رہے ہیں وہ جدید دنیا ہے۔ اس دنیا میں میز، کرسی، برقی لیمپ، واچ، بجلی، بھاپ، فونوگراف، ٹائپ مشین، ریل گاڑی، موٹر، ٹمٹم، ٹیلی گراف، ٹیلی فون، دوربین اور اس طرح کی دیگر ایجادات موجود ہیں۔ تعلیم کے لیے سکول اور کالج قائم ہیں جن میں اساتذہ شیکسپئر، ملٹن، پوپ، ساوَدے وغیرہ کی نظمیں پڑھا رہے ہیں۔ بائبل کا مطالعہ ہو رہا ہے۔ ہکسلے، مل، سپنسر اور ڈارون کے نظریات پر بحثیں جاری ہیں۔ لوگ بی۔ اے اور ایم۔ اے کی ڈگریاں حاصل کر کے نوکریاں ڈھونڈھ رہے ہیں۔ پتلون اور کوٹ پہن کر لوگ جگمگاتے ہوٹلوں میں جاتے ہیں جہاں شراب کے جام لنڈھائے جا رہے ہیں۔ ناچ ہو رہا ہے۔ پیانو اور دیگر مغربی ساز دھنیں بکھیر رہے ہیں۔ مِسیں ناچ رہی ہیں۔ ہسپتال بن رہے ہیں۔ ڈاک خانوں سے ڈاک کے تھیلے آ جا رہے ہیں۔ نمائشیں لگ رہی ہیں۔ پارک بنے ہیں جن میں گملے قرینے سے رکھے ہوئے ہیں۔ فوج کے چاق و چوبند جوان بندوقیں، سنگینیں اور بھالے لیے ہوئے قواعد کر رہے ہیں۔ پولیس کے سپاہی کچھ تھانوں میں ڈیوٹی دے رہے ہیں، کچھ لوگوں سے نذرانے وصول کر رہے ہیں۔ سیلف گورنمنٹ کا شور و غوغا

ہے۔ انتخابات ہیں، ووٹر ہیں، کونسل میں بحثیں ہو رہی ہیں۔ دربار لگ رہا ہے، وفد سرکار کے پاس جا رہے ہیں، لیڈر بیانات دے رہے ہیں، عدالتیں لگ رہی ہیں۔ جج مقدمات سن رہے ہیں، ناظر رشوت وصول کر رہے ہیں، ٹیکسوں کے کاغذات مکمل ہو رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ معاشرے کی یہ تصویر بڑی حقیقت پسندانہ ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اکبر اس تصویر کو پسند نہیں کرتے مگر انہوں نے اسے جو آب و رنگ دیا ہے، اس کے حقیقی ہونے میں کوئی شبہہ نہیں۔

ان کی امیجری کا ایک اور روپ تشبیہ، استعارہ اور تمثیل کے ذریعے واضح ہوتا ہے۔ یہ چیزیں کسی ادیب یا شاعر کے مزاج کو پہچاننے کا نہایت اہم ذریعہ ہوتی ہیں۔ رومانی مزاج کا لکھنے والا، حقیقت نگار یا کلاسیکی مصنف ایک دوسرے سے مختلف انداز کی تشبیہیں وغیرہ استعمال کرتے ہیں۔ اکبر الہ آبادی کو بیشتر لکھنے والوں نے رومانی یا غیر حقیقت پسندانہ شاعر ظاہر کیا ہے۔ انہیں کسی نے ماضی مرحوم کا پرستار بتایا ہے جو کبھی واپس نہیں آئے گا۔ تصوف سے ان کے لگاؤ کو محض رنگین جوانی کا ایک ردعمل قرار دیا گیا ہے۔ لیکن اکبر کی امیجری بالخصوص ان کی تشبیہیں، استعارے اور تمثیلیں اس اعتراض کو باآسانی رد کر دیتی ہیں۔ چند مثالیں دیکھیے:

بے عشق کے جوانی کٹنی نہیں مناسب
کیونکر کہوں کہ اچھا ہے جیٹھ کا نہ تپنا

نفس کے تابع ہوئے، ایمان رخصت ہو گیا
وہ زنانے میں گھسے، مہمان رخصت ہو گیا

پختہ طبعوں پر حوادث کا اثر ہوتا نہیں
کوہساروں میں نشان نقش پا ملتا نہیں

یوں بابوان ہند پہ ہے اب نماز بوجھ
ٹٹو پہ جس طرح سے ہو تازی کا بار بوجھ

مذہب ہی سے حفاظت قومی ہے اے عزیز
نادان ہے کواڑ ہٹائے جو چول سے

کھلی جو آنکھ جوانی میں عشق آ پہنچا
جو گرمیوں میں کھلے در تو کیوں نہ لو آئے

وہ فروغ آتش رخ جس کے آگے آفتاب
اس طرح جیسے کہ پیش شمع پروانے کی لاش

ہے تگاپو اس قدر مرکز مگر کوئی نہیں
فرنیچر ہم لے رہے ہیں اور گھر کوئی نہیں

بنیاد دیں ہوائے دنیا نے منہدم کی
طوفان نے شجر کو جڑ سے اکھاڑ ڈالا

ہنگامہ طرب نہیں یہ شورش رفارم
رنج و محن کا ساز ہے چکی کا گیت ہے

ریزولیشن کی شورش ہے مگر اس کا اثر غائب
پلیٹوں کی صدا سنتا ہوں اور کھانا نہیں آتا

مولوی ہرگز نہ چھوڑیں گے خدا گو بخش دے
گھیر ہی لیں گے پولیس والے سزا ہو یا نہ ہو

توپ کھسکی پروفیسر پہنچے
جب بسولا ہٹا تو رندہ ہے

لیڈر کو دیکھتا ہوں تصوف پہ معترض
کالج کے کیڑے پڑ گئے دلق فقیر میں

مغربی تعلیم ہو اور ہوم رولی بات ہو
لطف موسم ہے یہی مینڈک ہو اور برسات ہو

یہ تمام مثالیں اس بات کو ظاہر کرتی ہیں بلکہ حتمی طور پر ثابت کر دیتی ہیں کہ اکبر مزاجا" حقیقت نگار ہیں۔ جیٹھ کا تپنا' ٹٹو پہ بوجھ' کواڑ چول سے ہٹانا' در کھلے تو' لو کا آنا' طوفان سے اشجار کا جڑ سے اکھڑ جانا' بڑھئی کے ہاں بسولے اور رندے کا استعمال' چکی کا گیت گا کر رنج و محن ہلکا کرنا۔ یہ ساری تشبیہیں روزمرہ زندگی سے لی گئیں ہیں' ٹھوس اور واقعی زندگی سے' اور حقیقت نگاری کی یہی تعریف ہے۔ ان تمام اشعار میں امیجری کا سفر تجرید سے تجز کی طرف ہے۔ شاعر پہلے ایک کلیہ بیان کرتا ہے اور پھر اسے ثابت کرنے کے لیے روزمرہ زندگی کے مشاہدے سے کوئی ٹھوس مثال پیش کر دیتا ہے۔ رومانی شاعر کی امیجری کا سفر اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ اگر ان تمثیلوں کا مقابلہ لکھنوی شعرا مثلاً انشا' آتش' ناسخ اور ان کے شاگردوں کی تمثیلوں سے کیا جائے تو ایک واضح فرق سامنے آئے گا۔ ان لکھنوی شعرا کے ہاں تمثیلی مصرعے بجائے خود غیر حقیقی اور رومانی ہوتے ہیں۔ ممکن ہے اکبر نے تمثیل نگاری لکھنوی دبستان سے متاثر ہو کر شروع کی ہو لیکن ان کا حقیقت پسندانہ مزاج انہیں کیفیت کے اعتبار سے لکھنوی دبستان سے جدا کر دیتا ہے۔ اس ساری امیجری میں کوئی جذباتی ابال نہیں' کوئی مبہم بیانات نہیں' بلکہ دو ٹوک انداز اور پروقار ٹھہراؤ ہے۔ حالانکہ اکبر طنز نگار ہیں اور طنز نگار مزاج کو لازماً اختیار کرتا ہے جو بعض اوقات غیر محتاط اسلوب پر منتج ہوتا ہے مگر اکبر تمثیل و تشبیہ کے میدان میں کلاسیکی ضبط کا ثبوت دیتے ہیں۔

ذخیرۂ الفاظ :

اکبر کے ذخیرۂ الفاظ کا مطالعہ بھی ان کے ذہن کی تفہیم کے لیے بے حد مفید ہے۔ زبان کے بارے میں اکبر انقلابی نظریات رکھتے تھے۔ وہ کسی لفظ کو بھی مستقلاً" مبتذل نہیں سمجھتے۔ پوچ اور بازاری قسم کے الفاظ ان کے کلام میں آ کر ایسے سج جاتے ہیں کہ ان کا ابتذال دور ہو جاتا ہے۔ وہ شاعری میں کسی بندھی ٹکی زبان کے قائل نہیں خیال کے لیے جس لفظ کو استعمال کرنا مناسب سمجھتے ہیں' بے دریغ استعمال کر جاتے ہیں اور اہل زبان

حضرات کے مراکز، یعنی دہلی اور لکھنؤ، کی سند کی پروا نہیں کرتے۔ "من گفتم و محاورہ شد" کے شدت سے قائل ہیں۔ ان کو ایک وسیع ذخیرۂ الفاظ پر تصرف حاصل ہے جس میں قرآن کی آیات، عربی زبان کے مقولے، فارسی شعرا کی ترکیبیں، آتش و ناسخ کا روزمرہ، داغ و امیر کا محاورہ اور ہندی اور برج کے ٹھیٹھ الفاظ سبھی کچھ شامل ہے۔ ان میں مزید اضافہ انگریزی الفاظ کا کر لیجئے تو ان کے تمام ذخیرۂ الفاظ کا اندازہ ہو جائے گا۔ ان کے ہاں انگریزی الفاظ کی ضرورت اس لیے محسوس ہوتی ہے کہ جس طبقے کا خاکہ اڑاتے ہیں، یہ الفاظ ان کے روزمرے میں شامل ہو چکے ہیں۔ اردگرد کی ٹھوس زندگی کا بطور حقیقت نگار انہوں نے مشاہدہ کیا ہے۔ اس زندگی کی موثر پیش کش مقامی الفاظ ہی کے ذریعے سے بہتر طور پر ہو سکتی ہے۔ اسلامی مضامین اور اخلاقیات انہیں عربی کے ذخیرۂ الفاظ کی طرف لے جاتی ہیں اور شاعری کی مروجہ علامتیں فارسی ادب کی طرف راغب کرتی ہیں۔ گویا ان کے ہاں اسالیب کی جو رنگا رنگی ہے، وہ محض تنوع کے لیے نہیں بلکہ موضوع سے براہ راست متعلق ہے۔ مختلف قسم کے ذخیرۂ لفظی کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

عربی:

مجھ سے بے دل کو دے ایسا کون ہے
یاد مجھ کو "انتم الاعلون" ہے

ہوالاول ہوالاخر یہ شہد روح پرور ہے
پھرو آزاد ہو کر یہ ہے بالو کا شکر پارہ

مٹ گیا نقش احمد و محمود
رہ گیا "لا الہ الا اللہ"

صبح و شام صدق سے کر دعا کہ "ربنا
لا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا"

آرزو دنیا میں کب نکلی اولوالابصار کی
چشم موسیٰ کو بھی حسرت رہ گئی دیدار کی

اس تغیر پر بھی ہے ذہنوں میں قائم کوئی چیز
اور وہ کیا ہے؟ فقط ''یا حی یا قیوم'' ہے

فارسی:

اسی کے سائے میں ہوتی ہے میرے دل کی بسر
خدا دراز کرے عمر زلف پیچاں کی

پھر آئی فصل گل، پھر جوش سودا ہو گیا مجھ کو
اڑائیں دھجیاں دست جنوں نے پھر گریباں کی

ہمیشہ آپ کے آگے میں دست بستہ رہا
مگر دل آپ کے قابو میں تھا شکستہ رہا

سچ یہ ہے کہ واعظ مجھے بھاتا ہے، نہ اکبر
وہ خبط ہی اچھا، نہ یہ شوریدہ سری خوب

پردۂ فطرت خرد افروز، حکمت خیز ہے
ہے جنون انگیز لیکن آب و تاب روئے دوست

ہے نشہ غرور میں زاہد خراب تر
پھر کیا میں اعتراض کروں مے پرست پر

جس نے ابھارا خلق کو طاعت کردگار پر
نام اسی کا رہ گیا صفحہ روزگار پر

ہندی بھاشا:

اے برہمن ہمارا تیرا ہے ایک عالم
ہم خواب دیکھتے ہیں، تو دیکھتا ہے سپنا

ہند سے آپ کو ہجرت ہو مبارک اکبر
ہم تو گنگا ہی پہ اب مار کے آسن بیٹھے

قومی ترقی کی رادھا پیاری
پہنے ہے بیٹھی جوڑا بھاری

پوچھا کہ شغل کیا ہے، کہنے لگے گرو جی
بس رام رام جپنا، چیلوں کا مال اپنا

بڑے درشن تمہارے ہو گئے راجا کی سیوا سے
مگر من کا پنپنا چاہتے ہو تو کرو پن بھی

لڑیں کیوں ہندوؤں سے ہم یہیں کے ان سے پنپے ہیں
ہماری بھی دعا یہ ہے کہ گنگا جی کی بڑھتی ہو

اکبر نے شاعری میں انگریزی الفاظ بھی بے دریغ استعمال کئے ہیں۔ وہ اگرچہ انگریزی الفاظ استعمال کرنے والے پہلے اردو شاعر نہیں ہیں اور ان سے قبل اکا دکا الفاظ سید انشا وغیرہ نے بھی استعمال کیے ہیں، علاوہ ازیں ان کے معاصرین میں حالی کے ہاں بھی اس کی مثالیں مل جاتی ہیں، مگر اکبر اس لحاظ سے مختلف ہیں کہ انہوں نے بہت بڑی تعداد میں یہ الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ان کے ہاں انگریزی الفاظ کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے۔ جس طرح سرسید، نذیر احمد اور حالی وغیرہ اپنی نثر میں انگریزی کے بہت سے لفظ لکھ جاتے ہیں، وہی کیفیت نظم میں اکبر کی ہے۔ لیکن اکبر کی نظم میں انگریزی کا ذخیرۂ الفاظ ان بزرگوں کی نثر سے کہیں زیادہ ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اکبر ان تینوں حضرات سے زیادہ انگریزی جانتے تھے۔ سرسید اور حالی تو محض شد بد رکھتے تھے، البتہ نذیر احمد انگریزی سے

واقف تھے اور انھوں نے انگریزی کی قانونی کتابوں کے تراجم بھی کیے ہیں۔ مگر اکبر الہ آبادی کی قابلیت مترجم ہونے سے کہیں زیادہ تھی۔ وہ انگریزی کی مشکل کتابیں پڑھتے تھے۔ خصوصاً فلسفہ جیسے دقیق مضمون کا خاصا مطالعہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ انگریزی میں مکاتیب بھی لکھتے تھے۔(۱۴) اس لیے اکبر کے ہاں اگر انگریزی الفاظ کا استعمال زیادہ ہے تو محض زمانے کے فیشن کے مطابق نہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان الفاظ کے مفہوم سے آگاہ تھے۔ اکبر چونکہ طنز و مزاح کے شاعر ہیں۔ اس لیے بھی وہ انگریزی الفاظ زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ کیونکہ مزاح پیدا کرنے کا ایک ذریعہ ناہمواری اور دوسرا تعجب خیزی ہے۔ اور یہ دونوں حربے لفظ کے نئے پن سے حاصل کیے جا سکتے ہیں چونکہ اس وقت ہماری شاعری انگریزی الفاظ کی عادی نہیں تھی اس لیے اس میں کسی انگریزی لفظ کا استعمال باعث تعجب ہو جاتا تھا۔ بعض اوقات اوزان کی مجبوریاں اور کبھی مترادف اردو الفاظ کا نہ ہونا بھی انگریزی الفاظ کے استعمال کا سبب بن جاتا ہے۔ کبھی کبھی انگریزی معاشرت اور نقالی مغرب کی فضا پیدا کرنے کے لیے بھی ایسے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں:

دیدنی ہے یہ تماشائے مشین انقلاب
باپ تو قبلہ تھے، بیٹا اسکوائر ہو گیا

اسمال نہیں، گریٹ ہونا اچھا
دل ہونا برا ہے، پیٹ ہونا اچھا
پنڈت ہو کہ مولوی ہو، دونوں بیکار
انسان کو گریجوائٹ ہونا اچھا

باغوں میں تو بہار درختوں کی دیکھ لی
کالج میں آ کے کانووکیشن کو دیکھیے
لیموئے کاغذی تو بہت دیکھے آپ نے
اب کاغذی ترقی نیشن کو دیکھیے

اسیر دام زلف پالسی مدت سے بندہ ہے
فصاحت نذر لکچر ہے، ریاست نذر چندہ ہے

یہ سچ ہے انھوں نے ملک لے رکھا ہے
ہم لوگوں سے کیمپ کو پرے رکھا ہے

آہ و فریاد سے قابو میں نہ آئے گا وہ یار
تپش قلب کو بنگال ایجی ٹیشن سمجھو

کونسل میں شریک ہوگا کل ملک
اب تھینکس کا باندھ دے گا پل ملک
اونچا سنتی ہے کیا گورنمنٹ
کیوں کرتا ہے اتنا شور و غل ملک

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں، مرے ہسپتال جا کر

توپ کھسکی پروفیسر پہنچے
جب بسولا ہٹا تو رندہ ہے

اٹھانا پڑتا تھا دن رات بار الفت خوباں
جوانی کیا تھی نیچر نے مجھے بیگار پکڑا تھا

یا امیٹیشن کے بدلے چائے دودھ اور کھانڈ لے
یا ایجی ٹیشن کے بدلے تو چلا جا مانڈلے

نہ نماز ہے نہ روزہ، نہ زکوٰۃ ہے نہ حج ہے
تو خوشی پھر اس کی کیا ہے کوئی جنٹ کوئی جج ہے

یہ اور اس طرح کے دوسرے بیسیوں اشعار میں انگریزی کے جو الفاظ استعمال کیے گئے

ہیں ان کا استعمال ناگزیر سا ہے۔ لیکچر' پالسی' کیمپ' پروفیسر' کونسل' نیچر' گورنمنٹ' ہوٹل' ہسپتال اور جج وغیرہ ایسے الفاظ ہیں جو مروج اور ہر کسی کی زبان پر جاری ہیں۔ ان کے مترادفات کم معروف اور زیادہ دقیق ہیں اس لیے ان لفظوں کے استعمال پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ علاوہ ازیں ان الفاظ سے جو مغربی فضا پیدا ہوتی ہے' اور جسے پیش کرنا اکبر کا مقصد ہے' اردو مترادفات سے ممکن نہیں تھی۔ البتہ یہ بات بھی غلط نہیں ہے کہ اکبر کے بعض اشعار میں انگریزی کے الفاظ بلا ضرورت آئے ہیں اور بوجھل سے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن شاعری میں انگریزی لفظوں کے وسیع پیمانے پر استعمال کا پہلا کامیاب تجربہ ہونے کی وجہ سے بعض خامیوں کا رہ جانا ضروری سا ہے۔

مہارت قوافی :

اکبر کی مہارت قوافی بھی ان کے اسلوب شعری کا ایک اہم حصہ ہے اور انہیں خود بھی اس کا احساس ہے۔ "خیراب دیکھو لطف قوافی" اور اس قبیل کے دوسرے مصرعے اس کی غمازی کرتے ہیں۔ ان کی مہارت قوافی کے تمام نقاد بھی معترف معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً اعجاز حسین لکھتے ہیں :

> "جب کبھی ان کے یہاں آورد کے بجائے آمد ہوتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قافیہ اور ردیف اتنا اچھا اور برمحل شاید ہی کبھی کسی اردو شاعر نے اس فنکاری کے ساتھ نظم کیا ہو۔"(۱۵)

مگر نقادوں نے اس طرف توجہ نہیں دی کہ قافیہ اور ردیف ان کے شعری اسلوب ہی کا ایک حصہ ہے' ماورائے اسلوب نہیں۔ عموماً اردو میں پٹے پٹائے اور گھسے گھسائے قافیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ اگر کوئی نیا قافیہ استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اسے غریب یا اجنبی کہہ کر حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔(۱۶) مگر ہر لفظ میں استعمال کی صلاحیت ایک خاص حد تک ہوتی ہے۔ بہار' نگار' قرار یا خزاں' جہاں' نہاں جیسے قافیوں کو کسی نئے پہلو سے باندھنے کی گنجائش کہاں تک باقی رہ گئی ہے! اس لیے جس شخص کے ہاں خیالات نئے اور غیر مروج ہوں اسے نئے قافیوں کے سلسلے لازماً استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ دوم نیا قافیہ اکبر کے ہاں اجنبی لفظ کا کام دیتا ہے اور طنزیہ و مزاحیہ شاعری میں اجنبی یا نامانوس لفظ ظرافت کا محرک بن جاتا ہے۔ اکبر کے ہاں بعض اوقات قافیے کے طور پر کوئی ایسا لفظ باندھ دیا جاتا ہے جس کی توقع نہیں ہوتی یا جو شاعری میں ہمارے لیے نامانوس ہوتا ہے' اس لیے وہ ہمارے لیے ہنسی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ قافیوں کی ان مختلف قسموں کی چند مثالیں

ملاحظہ کیجئے:

"من العلم قلیلا" کو بھی دیکھو بعد "او تیتم"
نہ سمجھو گے تو اک دن بھائیو کھاؤ گے جوتی تم

اس میں جوتی کا قافیہ قاری کی توقع کے یکسر خلاف ہے۔

بحر عرفاں کے لیے ہے کشتی دل لازمی
سودمند اس راہ میں الفاظ کا پل ہو چکا

اس غزل کے قافیے گل' بلبل' کاکل وغیرہ ہیں۔ ان میں پل' کا قافیہ خلاف توقع ہے۔ اردو کے غزل گو شعرا اسے مبتذل سمجھ کر چھوڑ دیں گے۔ اب کچھ مثالیں بلا تنقید:

ہماری محفلیں اب بھی لطیف اجزا سے مملو ہیں
بز انخفش تھے قبل اس کے اب اسپنسر کے ٹٹو ہیں

بحر آزادی میں یہ کیسا تموج ہو گیا
قاصرات الطرف کو شوق تبرج ہو گیا

رشتہ در گردنم افگندہ پیٹ
می برد ہر جا کہ کیک است و پلیٹ

غرض اکبر الہ آبادی سنجیدہ بات کہتے ہیں مگر ان کا اسلوب مزاحیہ ہے اور مزاحیہ اسلوب کے جملہ خصائص ان کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ ان کا ذخیرۂ الفاظ وسیع اور کئی زبانوں تک پھیلا ہوا ہے۔ ضرورت کے مطابق وہ عربی' فارسی' ہندی یا انگریزی الفاظ استعمال کر سکتے ہیں اور اس معاملے میں وہ اجتہاد سے کام لیتے ہیں۔ کسی لفظ کو غریب یا مبتذل نہیں سمجھتے۔ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ شعر کی مخصوص فضا ہر لفظ کے استعمال کا جواز مہیا کر سکتی ہے۔ ایک وسیع اور ہمہ گیر ذخیرۂ الفاظ پر تصرف نظیر کے بعد اکبر الہ آبادی کے ہاں دکھائی دیتا ہے۔

حواشی

۱۔ صحافت پاکستان و ہند میں' عبدالسلام خورشید' صفحات ۲۳۴ تا ۲۳۵
۲۔ 'ہجو پیل' زینت سنگھ نامی ایک شخص کے ہاتھی کی ہجو ہے اور ہجو اسپ بھی کسی ایسے

ہی اہم شخص کی ہجو ہے جس کا سودا نے احتراماً نام نہیں لیا مگر یہ کہہ دیا ہے :

ہیں گے چنانچہ ایک ہمارے بھی مہرباں
پاوے سزا جو ان کا کوئی نام لے نہار

وہ اس شخص کی دنائت دکھانے چلے تھے مگر طنز معاشرے پر ہو گئی (م- ز)-

۳- مثلاً "نگار" کا اکبر نمبر' "علی گڑھ میگزین" کا اکبر نمبر یا اختر انصاری اکبر آبادی کا مرتبہ مجموعہ "اکبر اس دور میں" ملاحظہ فرمایئے- ان میں لکھنے والے بیشتر نقادوں نے ان کے کلام کا یوں جائزہ لیا ہے گویا سوائے ظرافت و طنز کے ان کے ہاں اور کچھ سرے سے موجود ہی نہیں-

۴- اکبر نامہ' صفحہ ۱۳-

5- Satire : Matthew Hodgart. p. 12

۶- سودا کے مخمس شہر آشوب کا یہ بند اس صنف کا نمائندہ بند ہے :

سخن جو شہر کی ویرانی کا کروں آغاز
تو سن کے ہوش کریں چغد کے وہیں پرواز
نہیں وہ گھر نہ ہو جس میں شغال کی آواز
کوئی جو شام کو مسجد میں جائے بہر نماز
تو واں چراغ نہیں ہے بجز چراغ غول

۷- اردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر' از ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار' صفحہ ۲۰۹- ۲۱۰-

۸- بحث و نظر' ڈاکٹر سید عبداللہ' صفحہ ۲۷-

۹- نئی پرانی قدریں' از شوکت سبزواری' صفحہ ۹۶-

۱۰- اردو ادب میں طنز و مزاح' از ڈاکٹر وزیر آغا' صفحہ ۱۲۳- ۱۲۴-

11- Satire, by Hodgartt, p. III.

۱۲- اکبر نامہ' از عبدالماجد دریابادی' صفحہ ۶۴- ۶۵-

۱۳-

اشعار غیر سے تو مجھے کم سند ملی
من گفتم و محاورہ شد سے مدد ملی

(اکبر الہ آبادی' کلیات دوم و سوم' صفحہ ۱۴۶)

۱۴- ملاحظہ ہو ضمیمہ ۳ (انگریزی خطوط)-

۱۵- علی گڑھ میگزین "اکبر نمبر" مضمون "اکبر فنکار کی حیثیت سے" مصنف ڈاکٹر اعجاز حسین' صفحہ ۸-

۱۶- یہاں تک کہ پروفیسر محمد صادق نے "ہسٹری آف اردو لٹریچر" میں اقبال کے غیر مروج قافیوں مثلاً آشیاں بندی' الوندی' پیوندی وغیرہ پر اعتراض کیا ہے- (ہسٹری آف اردو لٹریچر' صفحہ ۳۸۷)-

باب پنجم

اصناف سخن

شاعری کا آغاز:

"کلیات اکبر" سے معلوم ہوتا ہے کہ سترہ برس کی عمر سے وہ ایسا کلام کہنے لگے تھے جو مجموعے میں شامل کرنے کے قابل سمجھا گیا۔ مگر اس سے یہ خیال کرنا درست نہ ہو گا کہ اس سے پہلے انہوں نے کچھ نہیں لکھا۔ طالب الہ آبادی اپنی تصنیف "اکبر الہ آبادی" میں لکھتے ہیں:

> اکبر حسین نے کس زمانے کس زمانے سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا؟ اس کے متعلق کسی حتمی فیصلے کی گنجائش نہیں(؟) اس لیے (کہ) خارجی اور داخلی شواہد موجود ہیں۔ ان کے حقیقی بھانجے سید زاہد حسین صاحب کا بیان ہے کہ مرحوم نے خود ان سے فرمایا تھا کہ میں گیارہ برس کا تھا جب سے شعر کہتا ہوں۔ میرے چچا وارث علی صاحب نے ایک بار مجھے بلا کر پوچھا: "بیٹا شعر کہتے ہو؟" میں ادب کی وجہ سے خاموش رہا۔ خود ہی فرمانے لگے: "اچھا ایک مصرع ہم کہتے ہیں، ایک تم کہو"۔ انہوں نے ایک مصرع کہا..... اکبر نے بھی دوسرا مصرع فوراً کہہ دیا اور بڑے چچا خوش ہوئے۔ افسوس ہے کہ باوجود کوشش کے زاہد صاحب کو وہ مصرعے یاد نہیں آئے۔"[1]

دوسری روایت "علی گڑھ میگزین" کے اکبر نمبر میں سید بشیر حسین نے بیان کی ہے جو محولہ بالا اقتباس میں مذکور سید زاہد حسین کے بیٹے ہیں۔ وہ رقم طراز ہیں:

> "گیارہ بارہ سال کی عمر ہی سے شاعری کا شوق تھا۔ ایک روز سید وارث علی صاحب نے فرمایا کہ اکبر میں نے سنا ہے کہ تو شعر کہتا ہے۔ یہ دست بستہ سامنے کھڑے رہے۔ انہوں نے فرمایا ایک مصرع بمشکل موزوں کیا ہے، اس پر اچھا مصرع لگا ورنہ شعر کہنے کی ممانعت کر دوں گا۔ مصرع یہ تھا ع

بتوں کا عشق ہے عشق مجازی بھی حقیقت میں

اکبر نے فی البدیہہ عرض کیا ع

یہ مصرع چاہیے لکھنا بیاض چشم وحدت میں

وارث علی صاحب بہت خوش ہوئے اور بہت داد دی۔"(۲)

یہ دونوں اقتباسات بعض جزئیات کے مختلف ہونے کے باوجود مماثل ہیں اور دونوں میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اکبر گیارہ بارہ برس کی عمر میں شعر کہنے لگے تھے۔ لیکن چونکہ کلیات کا آغاز سترہ برس کی عمر کے کلام سے کیا گیا ہے' اس لیے لامحالہ ابتدائی چند برسوں کا کلام اکبر نے تدوین کلام کے وقت قصداً نظر انداز کر دیا ہو گا۔ گیارہ بارہ برس کی عمر سے لے کر وفات تک اکبر نے کم و بیش پینسٹھ سال تک شعر کہے ہیں۔ وہ بہت قادر الکلام اور زود گو شاعر تھے۔ ان کا مدون کلام' جو چار جلدوں میں چھپ چکا ہے' تقریباً بارہ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ لیکن اس کے علاوہ ان کے غیر مدون اور مطبوعہ کلام کی تعداد بھی سینکڑوں تک پہنچتی ہے۔(۳) انہوں نے شاعری کا آغاز صنف غزل سے کیا مگر بعد ازاں جوں جوں ان کے کلام میں پختگی آتی گئی وہ اصناف کے تنوع کی طرف بھی زیادہ سے زیادہ میلان ظاہر کرتے رہے۔ ان کے ہاں غزل کے علاوہ قطعہ' مثنوی' رباعی اور مسمط کی مختلف شکلیں مثلاً مثلث' مربع' مخمس' مسدس' ترجیع بند' علاوہ ازیں مستزاد' تضمین' نظم غیر معریٰ وغیرہ غرض تقریباً تمام مروجہ اصناف نظر آتی ہیں۔ اس کے علاوہ ہیئتوں کے بعض ایسے تجربات بھی ملتے ہیں جو تمام مروجہ شعری شکلوں سے مختلف ہیں۔ اس اعتبار سے سے اکبر محض ندرت خیال ہی کی وجہ سے اہم نہیں ہیں' ان کے ہاں اصناف کا تنوع بھی دلچسپی کا باعث ہو سکتا ہے۔

اکبر نے جن اصناف میں زیادہ دلچسپی لی ہے وہ غزل' نظم نما مثنوی' قطعہ اور رباعی ہیں۔ باقی اصناف بہت کم ہیں لیکن وہ بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ ذیل میں بنیادی اہمیت کی حامل اصناف کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا جاتا ہے۔ دیگر اصناف پر بھی کسی قدر رائے زنی کی جائے گی۔

غزلیات

"کلیات اکبر" کا آغاز غزلیات سے ہوتا ہے۔ اکبر ہر دور میں دیگر اصناف کے ساتھ ساتھ غزل بھی برابر کہتے رہے۔ وفات تک ان کے خیالات صنف غزل میں متواتر ظاہر ہوتے رہے اور دوسری اصناف میں تمام تر دلچسپی کے باوجود انہوں نے غزل کو کسی دور میں

بھی نظرانداز نہیں کیا۔ وجہ یہ ہے کہ اکبر کی جوانی کے زمانے میں ہر شاعر اپنی شاعری کا آغاز غزل سے کیا کرتا تھا اور دوسری اصناف کی طرف اس وقت مائل ہوتا تھا جب اسے غزل میں پختگی حاصل ہو جاتی تھی۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ ابتدائی مشق کے لیے غزل سہل صنف ہے اور اس میں پختہ ہونے کے بعد دوسری اصناف میں شاعر کو زیادہ دقت پیش نہیں آتی۔ اسی طرح اس زمانے میں ایک اور روایت تھی جسے ترک کرنا ممکن نہیں تھا۔ وہ روایت تھی تلمذ کی۔ ہر شاعر کسی معروف یا پختہ عمر شخص سے اصلاح لیتا تھا اور استادی شاگردی کا یہ سلسلہ شاعر بہ شاعر برابر منتقل ہوتا چلا جاتا تھا۔ اکبر کو بھی ان دونوں مراحل سے گزرنا پڑا۔ وہ وحید کے شاگرد ہو گئے جو اس زمانے میں الہ آباد اور نواح الہ آباد کے مشہور استاد تھے۔ اس بات سے اکبر کے کسی سوانح نگار یا نقاد کو اختلاف نہیں ہے کہ وہ وحید کے شاگرد تھے۔ مگر وحید کا نام کیا تھا؟ ان کی تاریخ ولادت و وفات کیا ہے؟ وہ کہاں کے رہنے والے تھے؟ کس سے تلمذ تھا؟ یہ تمام باتیں بے حد الجھی ہوئی ہیں۔ اس سلسلے میں جتنے مختلف حوالے مل سکتے ہیں وہ درج ذیل ہیں۔ آخر میں ان کے تجزیے کے بعد اپنی رائے پیش کی جائے گی۔

لالہ سری رام اکبر کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "خواجہ آتش کے شاگرد منشی غلام حسین صاحب وحید الہ آبادی کے شاگرد رشید بلکہ سرمایہ ناز اور فخر استاد ہیں۔" (۴)

عبدالحی کی رائے ہے:

> "شعر و سخن کا ذوق ان کو بچپن سے تھا۔ کچھ دنوں مولوی وحید الدین وحید رئیس کڑہ ضلع الہ آباد سے، جو مصحفی کے شاگرد تھے، مشق سخن کی۔" (۵)

طالب الہ آبادی رقم طراز ہیں:

> "آتش کے سلسلے میں تھے۔ وحید الدین وحید سے تلمذ تھا جو بشیر صاحب کے شاگرد تھے۔ بشیر خواجہ آتش صاحب کے شاگرد تھے۔" (۶)

رام بابو سکسینہ کا خیال ہے:

> "شروع میں اپنا کلام غلام حسین وحید کو دکھاتے تھے جو آتش کے شاگرد تھے۔ (۷)

عبدالقادر سروری اس مسئلے کے بارے میں یوں اظہار رائے کرتے ہیں:

> "اکبر کے استاد وحید الدین وحید آتش کے ایک شاگرد بشیر کے تلامذہ میں سے تھے۔" (۸)

محمد یحییٰ تنہا بھی لالہ سری رام کے ہم خیال ہیں:

"اکبر منشی غلام حسین صاحب وحید الہ آبادی کے شاگرد تھے— وحید خواجہ آتش کے شاگرد تھے۔"(۹)

اس کے علاوہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اکبر کے استاد کو وحید میاں یا وحید الہ آبادی کے نام سے یاد کرتے ہیں اور اصل نام کی الجھن میں نہیں پڑتے۔ مثلاً صفدر مرزا پوری کے بقول میر وحید الہ آبادی نے اکبر کو اصلاحیں دی ہیں۔(۱۰) قمرالدین بدایونی انہیں وحید میاں کے نام سے پکارتے ہیں۔(۱۱) بعد کے نقادوں کی آرا کی اس سلسلے میں چنداں ضرورت نہیں کیونکہ وہ بھی انہی ماخذ کی تکرار یا الٹ پھیر سے وجود میں آتی ہیں۔

اب تک جو آرا نقل ہو چکی ہیں انہیں مرتب صورت میں پیش کیا جائے تو درج ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

(۱) وحید کا نام بقول بعض غلام حسین اور بقول بعض وحیدالدین تھا۔

(۲) وحید بعض تذکرہ نگاروں کے نزدیک آتش کے شاگرد تھے اور بعض کے خیال میں بشیر کے جو آتش کے تلمیذ تھے۔ صرف ایک تذکرہ نگار کی رائے میں وحید شاگرد مصحفی تھے۔

وحید کا نام غلام حسین قرار دینے والے بنیادی ماخذ تین ہیں:

(۱) خمخانہ جاوید (۲) تاریخ ادب اردو اور (۳) مراۃ الشعراء— ان میں "خمخانہ جاوید" قدیم ترین ماخذ ہے اور اس لحاظ سے زیادہ مستند ہے کہ اکبر کی وفات سے بارہ تیرہ برس پہلے چھپ چکا تھا۔ "تاریخ ادب اردو" اور "مراۃ الشعرا" کے مصنفین نے اپنی کتابوں میں "خمخانہ جاوید" سے اکثر استفادہ کیا ہے اس لیے زیادہ تر یہی امکان ہے کہ ان مصنفین نے صاحب "خمخانہ جاوید" کے تتبع میں غلام حسین وحید لکھا ہے۔

اس کے برخلاف وحیدالدین وحید لکھنے والے مصنفین عبدالحی، طالب الہ آبادی اور عبدالقادر سروری ہیں۔ ان میں سے عبدالحی کا الہ آباد میں کچھ مدت قیام رہا ہے۔ طالب الہ آبادی الہ آباد کے روڑے تھے۔ البتہ عبدالقادر سروری کی حیثیت اتنی مستند نہیں ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ وحید کے سلسلے میں لالہ سری رام زیادہ مستند ہو سکتے ہیں یا عبدالحی اور طالب زیادہ مستند ہیں۔ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے عبدالحی اور طالب دونوں کا تعلق سرزمین الہ آباد سے تھا جہاں وحید کا قیام مدت مدید تک رہا۔ دوم وحید کے جو حالات دونوں نے تحریر کیے ہیں وہ ایک دوسرے سے ماخوذ نہ ہونے کے باوجود تفصیلات کے اعتبار سے ملتے

جلتے ہیں- سوم دونوں وحید کے بارے میں ایسے واقعات تحریر کرتے ہیں جو وحید کے دیکھنے والوں سے سنے گئے- لالہ سری رام معاصر اکبر ضرور ہیں مگر ان کا کام اس قدر پھیلا ہوا تھا کہ وہ جزئیات میں بہت زیادہ احتیاط نہیں کرسکتے تھے- اس کے برعکس طالب' اکبر پر کتاب لکھ رہے تھے جس کے لیے وحید کا ذکر واقعات کی ایک اہم کڑی کی حیثیت رکھتا تھا- مزید یہ کہ تمام تذکروں کی ورق گردانی کرنے کے باوجود غلام حسین وحید نام کے کسی شاعر کا کھوج نہیں لگایا جا سکا- البتہ وحیدالدین وحید کا ذکر بعض تذکروں میں موجود ہے- مثلاً "سخن شعرا" مرتبہ عبدالغفور نساخ میں ان کے بارے میں یہ سطور لکھی ہوئی ہیں:

"وحید تخلص مولوی وحیدالدین خلف مولوی امیر اللہ باشندۂ کڑا ضلع الہ آباد- بیشتر فارسی کہتے ہیں-" (۱۲)

اس کے بعد وحید کے چار اردو شعر درج کیے گئے ہیں- علاوہ ازیں ایک اور مستند ماخذ وحید کے متعلق انجمن ترقی اردو ہند کا شائع کردہ ایک کتابچہ ہے جسے علی حسنین زیبا نے مرتب کیا ہے- اس کا نام "انتخاب وحید" ہے- اس میں وحید کے متعلق جو معلومات درج کی گئی ہیں وہ مندرجہ بالا معلومات کی تائید کرتی ہیں- اس کے بعض متعلقہ حصے درجہ ذیل ہیں:

"وحیدالدین احمد نام' وحید تخلص' قصبہ کڑا ضلع الہ آباد کے باشندے تھے- ان کے والد کا نام مولوی امیرالدین عرف مولوی امر اللہ تھا- الہ آباد میں وکالت کرتے تھے-" (۱۳)

چند صفحات کے بعد لکھتے ہیں:

"جو حالات ہم کو ملے ہیں' ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی آمدورفت لکھنؤ' الہ آباد' پٹنہ' عظیم آباد میں اکثر رہی- ایک مرتبہ حیدر آباد دکن بھی گئے تھے- دیوان میں پٹنہ اور دکن کے سفر کی طرف کہیں صاف اشارہ نہیں کیا ہے مگر لکھنؤ کا ذکر اس شعر میں ہے:

بتان لکھنؤ میں کیا وحید اسرار دیکھا ہے
یہ کیوں جاتے نہیں سوئے الہ آباد کیا باعث

اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مستقل قیام الہ آباد میں رہا کرتا تھا-(۱۴)

الہ آباد میں قیام کرنے کے باعث اکبر انہی کے شاگرد ہو سکتے تھے- طالب الہ آبادی ان معلومات میں اور اضافہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد جب دہلی اور لکھنؤ انتشار و حوادث کا مرقع بن گیا تو اہل کمال پٹنہ اور عظیم آباد کی طرف کھنچے— محمد وحید صاحب بھی(۱۵) پٹنہ گئے۔ مگر وحید صاحب یہاں آئے تو محمد جان حیرت صاحب دیوان مطبوعہ، منشی کشوری لال مصنف صاحب دیوان غیر مطبوعہ اور لسان العصر ان کے شاگرد ہوئے۔ مگر نہ تو یہاں وحید صاحب کے شاگردوں کا دائرہ وسیع ہوا اور نہ منشی منیر اور خود ناسخ نے شاگردوں کے مقابلے میں ان کو زیادہ کامیابی ہوئی۔"

اکبر کو منشی وحید صاحب کی شاگردی پر فخر تھا اور اپنے استاد کو خدا جانے کیا سمجھتے تھے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

استادی وحید میں جس کو کلام ہو
تیار اس سے بحث کو اکبر ہے آج کل (۱۶)

طالب نے مشاعروں میں وحید اور اکبر کی شرکت کے واقعات بھی لکھے ہیں۔ مندرجہ بالا اقتباس کے آخر میں جو شعر پیش کیا گیا ہے، وہ تو "کلیات اکبر" میں موجود نہیں، البتہ کلیات کی جلد اول میں ایک ایسی غزل ملی ہے جس میں وحید کا ذکر ہوا، مگر کوئی وضاحتی حاشیہ نہیں۔ شعر یہ ہے:

وحید صبح بنارس کی موج میں ہیں پڑے
بھلا وہ کیسے کریں گے اودھ کی شام قبول

علی حسنین زیبا "انتخاب وحید" میں اکبر اور وحید کی نسبت یوں بیان کرتے ہیں:
"مشہور ہے کہ اکبر الہ آبادی انہی کے شاگرد تھے۔" (۱۷) آخر میں اس کا ایک

اور ثبوت یہ ہے:

صفدر مرزا پوری "مشاطہ سخن" میں کلام اکبر پر وحید کی اصلاحیں درج کر کے حاشیے میں لکھتے ہیں:

"یہ اصلاحیں مجھے اپنے محترم دوست محمد علیم خاں صاحب علیم الہ آبادی سے ملیں جو حضرت اکبر کے خاص دوستوں میں ہیں اور مرحوم ہی سے مشورۂ سخن بھی فرماتے تھے۔ ان اصلاحوں کا ذکر خود اکبر مرحوم نے ان سے فرمایا تھا جو ان کے تحویل حافظہ میں محفوظ تھیں۔" (۱۸)

وحید الدین وحید کی حادثاتی موت پر کسی صاحب نہال احمد علوی باشندہ کڑہ الہ آباد کا ایک مضمون "اودھ اخبار" میں شائع ہوا تھا۔ اس میں محولہ بالا علیم الہ آبادی کا ایک فارسی

قطعہ وفات دربارۂ وحید بھی درج کیا گیا ہے۔ نہال علوی لکھتے ہیں :

"ایک قطعہ تاریخ جو جناب سید شاہ محمد علیم صاحب الہ آبادی کا مصنفہ ہے، ہدیہ ناظرین کرتا ہوں جس سے مجمل کیفیت وفات بھی معلوم ہو جائے گی۔" (۱۹)

حال ہی میں چھپنے والی ایک کتاب میں بھی وحید کے متعلق کچھ سطور ملتی ہیں جو ہماری رہنمائی کرتی ہیں۔ یہ کتاب اردو غزل کا انتخاب "سفینہ غزل" ہے۔ اس کے مرتب لکھتے ہیں :

"وحید : ۱۸۲۹ ع ــــــ ۱۸۹۲ ع :

وحید الدین قصبہ کڑا ضلع الہ آباد کے باشندے تھے۔ بشیر شاگرد آتش سے تلمذ رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے زمانے کے طرزِ لکھنؤ کو پسند نہیں کیا بلکہ آتش کے سادہ اور صوفیانہ رنگ کی پیروی کی۔ کلام میں تصوف کے مضامین اور جذبات حقیقی نہایت خوبی سے نظم کیے گئے ہیں۔ شاگردوں میں اکبر الہ آبادی نے استاد کا نام روشن کیا۔" (۲۰)

ان شہادتوں کے بعد اس میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ اکبر الہ آبادی وحیدالدین وحید ہی کے شاگرد تھے۔

اب رہی یہ بحث کہ وحیدالدین وحید کس کے شاگرد تھے؟ مصحفی کے، آتش کے یا بشیر کے؟ ان میں سے پہلی بات تو ناممکن ہے۔ مصحفی کی وفات ۱۸۲۴ء میں ہوئی ہے (۲۱) اور وحید کی ولادت کا سال تقریباً ۱۸۲۹ء ہے۔(۲۲) اس طرح مصحفی کی وفات کے وقت وحید پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔

اب مسئلہ آتش کی شاگردی کا ہے۔ آتش کا سال وفات ۱۸۴۶ء ہے۔(۲۳) اس لیے وحید کی عمر ان کی وفات کے وقت اندازاً سترہ سال ہو گی۔ مگر یہ بات معلوم ہے کہ آتش اپنی وفات سے کئی برس پہلے ہی شعر گوئی کو ترک کر کے گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ لالہ سری رام مصنف "خمخانہ" جاوید" لکھتے ہیں :

"شیخ ناسخ نے خواجہ صاحب سے نو برس پہلے انتقال کیا مگر خواجہ صاحب نے یہ وضع داری برتی کہ اس وقت سے شعر کہنا ہی چھوڑ دیا۔(۲۴)

گویا آتش نے جب شعر گوئی ترک کر دی تھی اس وقت وحید تقریباً آٹھ برس کے تھے، اور یہ عمر بھی ایسی نہیں جس میں کوئی شعر کہے۔ اب ایک ہی صورت باقی رہ گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ وحیدالدین وحید، بشیر کے شاگرد ہوں۔ اس کے متعلق جو شہادتیں ملتی ہیں وہ مستند ہیں۔ خود وحید کا ایک شعر ہے :

اب تم وحید واقف کس رنگ سے نہیں ہو
فیض بشیر سے یاں کیئے تو کیا نہیں ہے (۲۵)

اس کے علاوہ کئی محقق اور نقاد بھی بشیر کو استاد وحید قرار دیتے ہیں۔ چند نقادوں کی آرا یہ ہیں:

"اودھ اخبار" میں وحید کی وفات پر نہال علوی کا جو مضمون شائع ہوا ہے، اس میں یہ بیان کیا گیا ہے:

"جناب موصوف کا سن ساٹھ برس سے متجاوز تھا۔ آپ کے استاد اسی ویرانے کے ایک نامور آدمی شیخ صاحب موصوف کو سلسلہ شاعری میں حضرت خواجہ حیدر علی آتش مرحوم سے فیض تھا۔" (۲۶)

طالب الہ آبادی لکھتے ہیں:

"وحیدالدین وحید — بشیر صاحب کے شاگرد تھے۔ بشیر صاحب خواجہ آتش صاحب کے شاگرد تھے۔" (۲۷)

بشیر کے متعلق "سخن شعرا" میں عبدالغفور نساخ یوں رقم طراز ہیں:

"بشیر تخلص بشیر اللہ باشندۂ کڑہ مانک پور:

کہہ رہی ہے موت ہر دم ہر زماں بالائے سر
غافلو آتا ہے وقت ناگہاں بالائے سر (۲۸)

نساخ نے بشیر کا نام بشیر اللہ لکھا ہے لیکن نہال علوی بشیر کے ہم وطن یعنی کڑوی ہونے کی حیثیت سے ان کے نام کے متعلق زیادہ مستند ہیں۔

غرض اس ساری بحث کا حاصل یہ ہے کہ اکبر الہ آبادی نے وحیدالدین وحید متوطن کڑہ سے شروع شروع میں غزلیات پر اصلاح لی۔ وحید شیخ بشیر علی بشیر کڑوی کے شاگرد تھے اور بشیر نے مشورۂ سخن آتش سے کیا تھا۔ اور یہ بات تو سب کو معلوم ہے کہ آتش نے مصحفی سے اصلاح لی تھی۔ اس طرح اکبر الہ آبادی سلسلہ مصحفی سے متعلق قرار پاتے ہیں۔ لکھنؤ کے غزل گو شاعروں میں مصحفی اور خواجہ آتش خصوصی اہمیت رکھنے والے شعرا ہیں مگر اکبر کا ان سے تعلق چونکہ بالواسطہ ہے اس لیے محض سلسلہ استادی کی وجہ سے یہ نتیجہ اخذ کرنا درست نہیں ہو گا کہ وہ آتش یا مصحفی سے مستفید ہوئے ہیں۔ البتہ وحید سے ان کا تعلق چونکہ براہ راست رہا ہے اس لیے اکبر کے ابتدائی کلام کا وحید سے مقابلہ کر کے کچھ مفید نتیجے ضرور نکالے جا سکتے ہیں۔ صفدر مرزا پوری نے "مشاطہ سخن" میں اکبر

کے جو اشعار لکھے ہیں اور ان پر وحید کی اصلاحیں تحریر کی ہیں، ان سے وحید اور اکبر کا تعلق شاعری معلوم ہو سکتا ہے۔(۲۹) وہ اشعار یہ ہیں:

شعر اکبر:

آج آرائش گیسوئے دوتا ہوتی ہے
لو مری جان گرفتار بلا ہوتی ہے

اصلاح:

آج آرائش گیسوئے دوتا ہوتی ہے
پھر مری جان گرفتار بلا ہوتی ہے

شعر اکبر:

ہاں کسی کام کا باقی نہیں رہتا انساں
سچ تو یہ ہے کہ محبت بھی بلا ہوتی ہے

اصلاح:

پھر کسی کام کا باقی نہیں رہتا انساں
سچ تو یہ ہے کہ محبت بھی بلا ہوتی ہے

شعر اکبر:

ہوں فریب نگہ ناز کا قائل اکبر
مرتے دم تک نہ کھلا یہ کہ جفا ہوتی ہے

اصلاح:

ہوں فریب نگہ ناز کا قائل اکبر
مرتے مرتے نہ کھلا یہ کہ جفا ہوتی ہے

شعر اکبر:

انہیں سے ہوئی مجھ کو الفت کچھ ایسی
نہ تھی ورنہ میری طبیعت کچھ ایسی (۳۰)

اصلاح:

تمہیں سے ہوئی مجھ کو الفت کچھ ایسی
نہ تھی ورنہ میری طبیعت کچھ ایسی

ان اشعار کی اصلاحوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اکبر ابتدا میں اپنے دور کے عام غزل گو شاعروں کے انداز میں شعر کہتے تھے۔ اصلاحوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وحید

اپنے شاگردوں کو انہی کے رنگ میں اصلاح دینے کے قائل تھے۔ صرف ایک آدھ لفظ تبدیل کرتے تھے جس سے شعر میں معنوی حسن پیدا ہو جاتا تھا۔ مصرعے کو بلا سوچے سمجھے بدل کر اسے شاگرد کے مزاج سے دور کر دینا انہیں پسند نہیں تھا جیسا کہ اکثر اساتذہ کا طریقہ ہوتا ہے۔

وحید کا بیشتر کلام غیر مطبوعہ رہ گیا ہے۔ علی حسنین زیبا نے ان کا جو انتخاب مرتب کیا ہے، اس سے دو اہم باتیں معلوم ہوتی ہیں:

(۱) وحید مزاجاً" آتش کے بہت قریب تھے۔ وہ درویش منش، آزادہ رو اور حساس شخصیت کے مالک تھے۔ محض سلسلہ آتش سے رسمی تعلق نہیں رکھتے تھے بلکہ آتش کے رنگ کے صحیح پیرو تھے۔ (۲) اکبر الہ آبادی کے ابتدائی کلام پر وحید کا گہرا ہے۔ اس چھوٹے سے انتخاب میں بھی وحید کی کئی ایسی غزلیں موجود ہیں جو اکبر سے ہم طرح ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ طرحی مشاعروں کے لیے لکھی گئی ہوں گی مگر اس سے صرف نظر کیجئے جب بھی اکبر کی ابتدائی غزلیات وحید کے رنگ سخن کے قریب ہیں۔ طرحی غزلوں کی مثالوں سے اس لیے قطع نظر کرتا ہوں کہ طرحی مشاعروں کی بدولت جو غزلیں لکھنی پڑتی تھیں، وہ کسی شاعر کے دوسرے پر اثرات کا قطعی ثبوت نہیں ہو سکتیں۔ البتہ کلام کا کلام سے موازنہ کر کے نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ ذیل میں وحید کے چند منتخب اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

ہم نے جب وادی غربت میں قدم رکھا تھا
دور تک یاد وطن آئی تھی سمجھانے کو

کچھ کہہ کے اس نے پھر مجھے دیوانہ کر دیا
اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا

یہ نہ پوچھو مجھے الفت نے دکھایا کیا کیا
کچھ جواب اس کا نہیں آنکھ میں آنسو کے سوا

جان دی ہجر میں تم نے تو بہت خوب کیا
ان سے ملنے کی وحید اب کوئی صورت بھی نہ تھی

وقت مجھ پر دو کٹھن گذرے ہیں ساری عمر میں
اک ترے آنے سے پہلے، اک ترے جانے کے بعد

قصد پرواز ہو کہ شوق چمن
یہ تو سب بال و پر میں رکھا تھا
اس کی مژگاں کو دیکھنا تھا فقط
زخم تو خود جگر میں رکھا تھا

مرنے پر بھی نہیں بھولا مجھے دنیا کا خیال
کچھ اثر اب بھی ہے اے خواب پریشان تیرا

لب پہ کیا عذر گنہ لایئے آہوں کے سوا
عمر بھر ہم نے کیا کیا ہے گناہوں کے سوا
کون سی بات پہ دریا میں ابھرتے ہیں حباب
پاس کچھ بھی نہیں نخوت کی کلاہوں کے سوا

لالہ خوش رنگ تھا جان چمن کیا ہو گیا
جلوۂ شمع شبستان چمن کیا ہو گیا
کیا ہوئی وہ نرگس شہلا کی چشم سرمہ سا
دیدۂ شوخ غزالان چمن کیا ہو گیا
سنبل سیراب کا کیا ہو گیا وہ پیچ و تاب
گیسوئے مرغولہ مویان چمن کیا ہو گیا
اے صبا نشو ونمائے غنچہ و گل کیا ہوئی
آب و رنگ خوب رویان چمن کیا ہو گیا
اپنے موقع پر نظر آتا نہیں کوئی نہال
انتظام نخل بندان چمن کیا ہو گیا

کون سے نا واقفوں نے کاٹ ڈالا سرو کو
مصرع موزون دیوان چمن کیا ہو گیا

یہ اشعار ثابت کرتے ہیں کہ وحید محض حسن و عشق کے شاعر نہیں، زندگی کے مختلف پہلوؤں سے انہیں بڑی دلچسپی ہے۔ ان کے مصرعے رواں ہیں۔ اشعار میں ضرب المثل ہونے کی صلاحیت ہے اور بعض تو ضرب المثل ہو چکے ہیں۔ آتش کے انداز کی ایمجری اور مضامین میں درویش منشی ان کے ہاں موجود ہے۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ اکبر کو صحیح راستے پر لگانے والا استاد ابتدائے شاعری سے میسر آ گیا تھا۔ اور یہ کون نہیں جانتا کہ جو نقوش ذہن پر چھوٹی عمر میں ثبت ہو جاتے ہیں وہ مٹائے نہیں مٹتے۔ اکبر کے ہاں لفظی رعایتوں کا جو انداز ملتا ہے، ان کے مضامین غزل میں جو کہیں کہیں ایک بانکپن نظر آتا ہے اور ان کے ہاں مصرعوں کی تراش خراش کا جو شعور موجود ہے، وہ وحیدالدین وحید کا ہی فیضان ہے۔ اس رنگ میں اکبر کے کچھ اشعار ملاحظہ کیجئے:

(۱) لوگ کیونکر چھوڑ دیتے ہیں محبت دفعتاً
میں تو جب بھی قصد کرتا ہوں مچل جاتا ہے دل

---

(۲) اجل سے وہ ڈریں جینے کو جو اچھا سمجھتے ہیں
یہاں ہم چار دن کی زندگی کو کیا سمجھتے ہیں

---

(۳) سیر غربت کوئی جلسہ جو دکھا دیتی ہے
یاد احباب وطن مجھ کو رلا دیتی ہے

---

(۴) گل کو خنداں، بلبلوں کو نوحہ گر دیکھا کیے
باغ عالم کی دو رنگی عمر بھر دیکھا کیے

---

(۵) اللہ نے دی ہے جو تمہیں چاند سی صورت
روشن بھی کرو جا کے سیہ خانہ کسی کا

(۶) دیکھا ہے عجب رنگ کچھ اس دور فلک میں
کوئی نہیں اے ساقی مے خانہ کسی کا

---

(۷) ہے جو قسمت میں وہی ہو گا' نہ کچھ کم نہ سوا
آرزو کہتے ہیں کس چیز کو' حسرت کیسی

---

(۸) گو بہت کچھ رنج یاران وطن سے تھا ہمیں
آنکھ میں آنسو مگر وقت سفر آ ہی گیا

---

(۹) وہ رشک گل نہ ہوا ہم سے کنار افسوس!
بہار عمر خزاں ہو گئی' ہزار افسوس!

---

(۱۰) عالم ایجاد بھی اک عالم موہوم ہے
جتنی تعبیریں ہیں یاں کی ہیں یہ سب تعمیر خواب

ان میں سے شعر ۳ اور شعر ۸ وحید کے مخصوص رنگ میں ہیں۔ اسی طرح شعر ۴' ۹ اور ۱۰ بالکل آتش کے انداز میں ہیں۔ باقی اشعار لکھنؤ کے عام شعرا کے رنگ میں ہیں۔ وحید چونکہ لکھنوی شعرا کے سلسلے سے متعلق تھے اور الہ آباد میں ویسے ہی شعرائے لکھنؤ کے شاگردوں کی کثرت تھی اس لیے اکبر کو بھی لکھنؤ کے شعرا سے زیادہ دلچسپی تھی۔ ان کی ابتدائی غزلیات میں رند لکھنوی اور آتش کا ذکر ملتا ہے:

بقول رند مہمان فلک میں بھی ہوں اے اکبر
مری قسمت کا بھی ٹکڑا ہے اس کے خوان الواں میں

خوب فرما گئے ہیں حضرت آتش اکبر
میرے اللہ نے مجھ پر کیے احساں کیا کیا

آغا حسن امانت کی "اندر سبھا" کی پیروڈی کے طور پر اکبر نے "کرزن سبھا" لکھی ہے۔ اس کے علاوہ آتش اور ناسخ کے بارے میں وہ کہا کرتے تھے:

"آتش و ناسخ جن اشعار کی وجہ سے آتش اور ناسخ ہوئے ہیں' وہ میرے ناخنوں پر ہیں۔"(۳۱)

لکھنوی دبستان کے شعرا کے انداز کی صدائے باز گشت ان کی غزلیات کے پہلے دور میں عام ہے۔ خارجی مضامین، سراپائے محبوب کا بیان، لفظی تناسبات کا بہت زیادہ استعمال، مشکل زمینوں میں طبع آزمائی، لمبی لمبی قصیدہ طور غزلیں لکھنے کی طرف میلان اور اس طرح کی دیگر خصوصیات ان کے اس دور کے کلام پر لکھنوی شعراء کے اثرات ظاہر کرتی ہیں۔ لکھنوی شعرا کے عام انداز کے چند اشعار اکبر کے دور اول سے ذیل میں تحریر کیے جاتے ہیں:

داغ ہائے سینہ گل ہیں، آہ سرد اپنی نسیم
گلشن ہستی میں کیا اچھی ہوا کھاتا ہے دل

کافی ہیں وہ مستانہ نگاہیں، وہ خط سبز
اب ہم نہ کبھی شوق مے و بنگ کریں گے
ارشاد جو ہوتا ہے کہ لکھ وصف دہن کچھ
معلوم ہوا آپ مجھے تنگ کریں گے

لاغر اس درجہ ہوا ہوں کہ جو لیٹوں میں کبھی
تار بستر مجھے وسعت میں بیاباں ہو جائے

ناز بے جا نہ کیا کیجئے ہم سے اتنا
اسی انداز کا اک یار حسیں اور بھی ہے

رسائی زلف نے پائی قدم تک اب وہ کیوں آئیں
بہانہ خوب ہاتھ آیا کہ پابند سلاسل ہوں

ہجر میں دانتوں کے گریاں میں جو بیتاب ہوا
اشک جو آنکھ سے نکلا در نایاب ہوا
ہو گیا غرق میں یاد رخ نورانی میں
ہالہ ماہ مجھے حلقہ گرداب ہوا

پہلے دور کی غزلیات میں بعض ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جو کسی خاص واقعے کی طرف اشارہ کرتے معلوم ہوتے ہیں۔ اگرچہ سرسری نظر سے دیکھنے پر ان میں سے بعض اشعار لکھنؤ کے عام شعروں سے مختلف نظر آتے ہیں مگر کہیں کہیں اسلوب غمازی کرتا ہے کہ ان میں ذاتی واقعے کی جھلک موجود ہے۔ اکبر کے حالات زندگی میں یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ انہیں جوانی میں کوچہ مہ وشاں میں جانے کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ بعض شعروں میں وا تعیت جھلکتی دکھائی دیتی ہے:

قصد کرتا ہوں جو اٹھنے کا تو فرماتے ہیں وہ
اور بیٹھو دو گھڑی صاحب کہ گھبراتا ہے دل
یہ نہیں کہتے یہیں رہ جاؤ اب تم رات کو
بس انہیں باتوں سے اکبر میرا جل جاتا ہے دل

ہو نہ رنگین طبیعت بھی کسی کی یارب
آدمی کو یہ مصیبت میں پھنسا دیتی ہے

میلے ہیں حسینوں کے پری زادوں کے جمگھٹ
اب جا کے قیام اپنا لب گنگ کریں گے

جذبہ دل نے مرے تاثیر دکھلائی، تو ہے
گھنگرؤوں کی جانب در کچھ صدا آئی تو ہے
دل دھڑکتا ہے مرا لوں بوسہ رخ یا نہ لوں
نیند میں اس نے دلائی منہ سے سرکائی تو ہے

اس دور کی غزلیات میں لکھنؤیت کے اس شوخ رنگ سے ہٹ کر ایک قدرے دبے ہوئے تصوف اور فنا کے موضوعات کی طرف بھی میلان نظر آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ بیس بائیس سال کی عمر تک اکبر کو ذوق تصوف اور احساس فنا نہیں ہو سکتا۔ البتہ یہ رنگ ان کے اجتماعی لاشعور میں دبے ہوئے صوفیانہ رجحانات کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کا ذکر پہلے باب میں کیا جا چکا ہے کہ اکبر کے والد سید تفضل حسین تصوف سے بہت لگاؤ رکھتے تھے۔ اس رجحان کی عکاسی مندرجہ ذیل اشعار سے ہوتی ہے:

عزیزو! سادہ ہی رہنے دو لوح تربت کو
ہمیں مٹے تو یہ نقش و نگار کیا ہو گا

بہت پسند ترا رنگ ہے مجھے لیکن
بقا نہیں تجھے اے موسم بہار! افسوس

میں وہ آئینہ ہوں اس حیرت سرائے دہر میں
جس میں جوہر کے عوض رہتا ہے عکس روئے دوست

دکھلاتے ہیں بت جلوۂ مستانہ کسی کا
یاں کعبہ مقصود ہے دیوانہ کسی کا

کوئی پہنچا نہیں اے یار تیرے قد رعنا تک
ہماری فکر عالی سرو سے ہو آئی طوبیٰ تک

کیسے کیسے گل کھلے ہیں نقش پائے یار سے
غیرت دامان گل چیں ہو رہا ہے کوئے دوست

"کلیات اکبر" جلد اول کے مطابق غزلیات کا دور دوم تیس برس کی عمر سے شروع ہوتا ہے اور چالیس سال تک رہتا ہے۔ تیس سے چالیس سال کی عمر ذہنی پختگی کے آغاز کی عمر ہوتی ہے۔ اس زمانے میں نوجوانی کی تیزی و براقی برقرار نہیں رہتی۔ اس کی جگہ ایک ٹھہراؤ سا آجاتا ہے اور انسان خالص جذباتی نقطۂ نظر کو چھوڑ کر غور و فکر کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ اکبر کی زندگی میں ویسے بھی یہ زمانہ بہت اہم ہے۔ اس زمانے میں وہ معاشی طور پر مستحکم ہوئے اور ان کی جوڈیشنل سروس کا آغاز ہوا۔ ان کا تقرر علی گڑھ میں ہوا۔ دنیائے ادب میں انہیں "اودھ پنچ" کے اجرا سے ایک وسیع میدان میسر آیا۔ گویا یہ عرصہ ان کے مشاہدے کی وسعت کا ہے۔ ان کی شہرت کے آغاز کا زمانہ بھی یہی ہے۔ ان کی دوسری اور تیسری شادی بھی اسی زمانے میں ہوئی اور اس طرح کوچہ مہ وشاں بھی ہمیشہ کے لیے چھوٹ گیا۔ اس دور کے اشعار کچھ تو پہلے دور ہی کا تتمہ ہیں، تاہم اس دور سے ان کی غزل میں

کئی نئے رجحانات شروع ہوتے ہیں۔ غزل کے عام طور پر مستعمل مضامین میں وہ نئے نئے پہلو نکالنے لگے ہیں۔ ان کے ہاں سیاسی شعور ابھرتا ہوا نظر آتا ہے۔ مگر چونکہ یہ زمانہ ہندوستان میں انگریزوں کے انتہائی عروج اور رعب داب کا ہے' اس لیے کھلے لفظوں میں ان پر تنقید کرنا ناممکن تھا' چنانچہ علامتی انداز میں سیاسی مضامین کو پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اشعار میں اسلامی حکومتوں کے خاتمے کا رنج موجود ہے۔ کچھ اشعار ایسے بھی ہیں جن میں نئے دور سے اظہار بیزاری کیا گیا ہے۔ غرض یہ دور اکبر کی غزلیات کا عبوری دور ہے جس میں ایک طرف گذشتہ دور کی جھلک ہے اور دوسری طرف مستقبل کی طرف اشارہ ہے۔ ذیل کے شعر میں اکبر نے اس دور میں اپنا نظریہ شعر بھی بیان کر دیا ہے:

جلوہ نہ ہو معنی کا تو صورت کا اثر کیا
بلبل گل تصویر کا شیدا نہیں ہوتا

یہ شعر ان کے ہاں معنی کی ترجیح کو ظاہر کرتا ہے۔ چند اشعار ایسے ہیں جن میں انگریزوں کی بے انصافیوں اور ہندوستان کے تنزل کی طرف اشارے کیے گئے ہیں علاوہ ازیں مسلمانوں کے زوال کا تذکرہ بھی ہے:

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

کیا مرے عہد میں بدلی ہے گلستان کی ہوا
رنگ کیسا کہ کسی پھول میں خوشبو بھی نہیں

حرم کیا دیر کیا دونوں یہ ویراں ہوتے جاتے ہیں
تمہارے معتقد گبر و مسلمان ہوتے جاتے ہیں

نہ خود رہے' نہ حکومت رہی مسلماں کی
کہانی ہو گئی وہ سلطنت پرستاں کی
خزاں میں بلبل و گل کا نشان تک نہ رہا
ہوا بدل گئی دو روز میں گلستاں کی

فریب میں بت کافر کے آ گیا ہوں میں
نظر نہیں ہے خرابی پہ دین و ایماں کی

فلک جو روز نیا داغ اک دکھاتا ہے
ہمارے حوصلہ دل کو آزماتا ہے

قابلیت تو بہت بڑھ گئی ماشاء اللہ
مگر افسوس یہی ہے کہ مسلماں نہ رہے

ان میں سے بعض شعروں میں تو مضمون بالکل صاف لفظوں میں بیان کر دیا گیا ہے، مگر بعض اشعار میں گل و بلبل کی علامت کے ذریعے سیاسی مضامین کا اظہار کیا گیا ہے۔ آخری شعر سرسید کی تعلیمی کاوشوں کے خلاف اکبر کا اولین ردعمل ہے۔ اس زمانے میں وہ علی گڑھ میں ملازم تھے۔ یہ اشعار اس لیے بہت اہم ہیں کہ یہی وہ رنگ ہے جسے بعد میں اکبر نے زیادہ چمکایا۔

غزلیات اکبر کا دور سوم چالیس سے پچاس برس تک کا کلام ہے جو سنین کے اعتبار سے ۱۸۸۵ ع تا ۱۸۹۵ع ہوتا ہے۔ مگر اس دور کو دراصل اکبر کی جوڈیشل سروس سے ریٹائر ہونے تک شمار کرنا چاہیے۔ یعنی ۱۹۰۳ ع تک۔ یہ اکبر کی ترقیات اور ذہنی آسودگی کا زمانہ ہے۔ چنانچہ اس دور میں انہوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ بعض دیگر اصناف میں لکھنے کے علاوہ انہوں نے اس عرصے میں سیکڑوں غزلیں بھی کہی ہیں۔ اگرچہ سیاسی طور پر یہ زمانہ ابھی تک گھٹن کا تھا مگر اکبر نے اس گھٹن کی بہت کم پروا کی ہے۔ اکبر کی غزلیات کا یہ دور ان کے پورے کلام میں ممتاز حیثیت کا حامل ہے۔ اس دور میں وہ روایتی غزل کو بہت پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ غزل کی روایت کے ساتھ کسی نے اس قدر آزادی کا مظاہرہ نہیں کیا جتنا کہ اکبر کی اس دور کی غزلیات سے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ غزل کے روایتی ذخیرۂ الفاظ، امیجری، علامات تراکیب وغیرہ سے دامن کشاں نظر آتے ہیں۔ انہوں نے غزل کی ہیئت کی بعض ایسی خصوصیات کا، جو لازمہ غزل قرار دی جا چکی ہیں، سختی سے التزام نہیں کیا۔ انہوں نے اوزان کے تجربات کیے ہیں۔ غزل کی ریزہ خیالی کہیں کہیں مربوط خیالی میں بدل گئی ہے۔

انہوں نے غزل کو طنزیہ پیرایہ ہائے اظہار کا مؤثر وسیلہ بنایا ہے جو اس سے پہلے نہیں تھا۔ انہوں نے غزل کی صنف میں کثرت سے سیاسی مضامین داخل کر دیے ہیں۔ اس سے

پہلے یہ مضامین محض اشاروں اور علامتوں کی زبان میں بیان کیے جاتے تھے۔ مگر اب صاف صاف ڈنکے کی چوٹ کہے جانے لگے۔ البتہ ان کے ساتھ ساتھ علامتی اسلوب بھی برقرار رہا۔ غزل کی صنف بہت کم تبدیلیاں قبول کرتی ہے۔ موضوعات کی حد تک تو بدل بھی جاتی ہے مگر انداز بیان میں سخت روایت پسند واقع ہوئی ہے۔ اکبر کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے صنف غزل کو اس پابندی سے بالکل آزاد کر دیا۔ ان کے ہاں مضامین تو بدلے ہی تھے' انداز بیان میں بھی انقلاب آ گیا۔ مضامین میں سیاست نے باقی خیالات کو دبا لیا۔ انداز بیان میں ذخیرۂ الفاظ کے ساتھ وہ آزادی برتی گئی کہ انگریزی الفاظ فارسی اور عربی کے ساتھ ترکیب پانے لگے۔ ایسے الفاظ جنہیں مبتذل کہہ کر قلمرو غزل سے باہر رکھا گیا تھا یا جنہیں صوتی اعتبار سے ناتراشیدہ قرار دے کر تغزل کو مجروح کرنے کا باعث کہا جاتا تھا' اکبر نے ان سب کو استعمال کیا اور صرف ایک بنیادی اصول کو مدنظر رکھا' وہ یہ کہ موضوع کی مناسبت سے الفاظ استعمال کیے جائیں۔ اور اکبر کے موضوعات کا تقاضا یہ ہے کہ الفاظ سے خاص قسم کی آزادی برتی جائے۔ طنز کے لیے مزاح ضروری ہے اور مزاح کے لئے لفظی آزادی' اس لیے اکبر ان الفاظ کے استعمال پر مجبور ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اکبر لسان العصر ہیں۔ دوسرے لفظوں میں انہیں اپنے زمانے کا شاعر کہا جاتا ہے۔ وہ زمانہ انگریزی تعلیم' انگریزی ایجادوں'انگریزی اداروں' اور انگریزی لفظوں کی پیشرفت کا تھا۔ اس دور کا صحیح نقشہ کھینچا ہی نہیں جا سکتا تھا جب تک کہ اس تمدنی انقلاب کو اسی کے ذخیرۂ لفظی کے ذریعے پیش نہ کیا جاتا۔ ذیل میں اس دور کی غزلیات اکبر کے چند اشعارر پیش کیے جاتے ہیں جن سے بیک وقت موضوعات کے تنوع اور اسالیب کی ندرت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے

رنگ چہرے کا تو کالج نے بھی رکھا قائم
رنگ باطن میں مگر باپ سے بیٹا نہ ملا

یہ پاس اور وہ پاس' نہ موجد نہ اہل زر
اخبار میں جو چھپ گئے ارماں نکل گیا

تہ کرو صاحب نسب نامے وہ وقت آیا ہے اب
بے اثر ہو گی شرافت' مال دیکھا جائے گا

کھو گئی ہند کی فردوس نشانی اکبر
کاش ہو جائے کوئی ملٹن ثانی پیدا

عزت ملی ہے شرکت کونسل کی شیخ کو
غازہ ملا گیا ہے رخ فاقہ مست پر

کسی نے خوب فرمایا اک اسلامی کمیٹی میں
نمازی ہیں ندارد' وہ رہ گئی خالی اذاں ہو کر

کس قدر حار تھے سید کے وہ اجزائے رفارم
علماء دے رہے ہیں قوم کو تبرید ہنوز

مشرقی تو سر دشمن کو کچل دیتے ہیں
مغربی اس کی طبیعت کو بدل دیتے ہیں

عوض قرآں کے اب ہے ڈارون کا ذکر یاروں میں
جہاں تھے حضرت آدم وہاں بندر اچھلتے ہیں

شیخ کو وجد میں لائی ہیں پیانو کی دھنیں
پیچ دستار فضیلت کے کھلے جاتے ہیں

مری ناکامیابی کی کوئی حد ہو نہیں سکتی
صداقت چل نہیں سکتی خوشامد ہو نہیں سکتی

پاؤں کانپا ہی کیے خوف سے ان کے در پر
چست پتلون پہننے پہ بھی پنڈلی نہ تنی

دل ملیں تو کیا ملیں اہل قوم کے بہم
ایک آیا کعبے سے، ایک آیا لاج سے

سدھاریں شیخ کعبے کو ہم انگلستان دیکھیں گے
وہ دیکھیں گھر خدا کا ہم خدا کی شان دیکھیں گے

اگر کسی ایسے شخص کو جو غزل کی روایات سے بخوبی واقف ہو مگر اس نے اکبر کا مطالعہ نہ کیا ہو، یہ اشعار سنائے جائیں تو وہ انہیں غزل کے اشعار ماننے میں متامل ہو گا، تاہم یہ غزل ہی کے شعر ہیں۔ اکبر نے غزل کے مضامین میں اس قدر اضافے کیے ہیں کہ ان سے پہلے اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پروفیسر حمید احمد خاں لکھتے ہیں :

> "غزل میں بلحاظ موضوع جو ارتقا ہوا ہے اس کے پیش نظر یہ حقیقت خود بخود ظاہر ہو جاتی ہے کہ غزل کی تعریف کو کسی خاص موضوع میں مقید کر دینا غلط ہے بلکہ.... یہ بھی قرین قیاس ہے کہ آگے چل کر غزل کی ہیئت ایسے مضامین کو قبول کرنے لگے جو اس وقت غزل سے خارج ہیں۔"(۳۲)

پروفیسر صاحب موصوف اکبر کی غزلیات سے زیادہ واقف معلوم نہیں ہوتے کیونکہ محولہ بالا مضمون میں انہوں نے اکبر کا ذکر نہیں کیا حالانکہ اکبر کی غزل اس صنف کی روایت میں ایک انقلاب کی مظہر ہے، حتیٰ کہ انہوں نے غزل کی بعض بنیادی خصوصیات میں بھی تغیر پیدا کر دیا ہے۔

پروفیسر حمید احمد خاں اسی مضمون میں آگے چل کر لکھتے ہیں :

> "غزل کے مضمون میں تین عناصر ایسے ہیں جو بحیثیت مجموعی اسے عام شاعری کے مضامین سے ممتاز کرتے ہیں۔ ان میں سب سے پہلا عنصر غزل کے مضمون کی عمومیت ہے.... تاریخ اور وقت و مقام کا تعین اور کسی معلوم شخصیت سے تعلق، جو عام ادبیات میں صداقت کی ضد سمجھا جاتا ہے؛ غزل کو پسند نہیں آتا۔"(۳۳)

اکبر کی غزل کے اشعار بعض معلوم شخصیتوں کی طرف نہ صرف واضح اشارے کرتے ہیں بلکہ ان کے اسما کو بھی ظاہر کر دیتے ہیں۔ سید، گاندھی، شوکت، حسرت وغیرہ ایسے نام

ان کی غزلیات میں آجاتے ہیں اور جب تک ان افراد کے بارے میں کچھ معلومات نہ ہوں، غزل کا لطف نہیں اٹھایا جا سکتا۔ اکبر کی غزل کی یہ خصوصیت بھی عام رجحانات سے ہٹ کر ہے۔

اس بحث سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اس دور میں اکبر کی غزل تمام تر اسی قسم کی ہے۔ ان کے ہاں اس دور میں بھی ایسے اشعار کی کمی نہیں جو غزل کی روایت سے رشتہ باندھے ہوئے ہیں۔ اگرچہ ان میں سے بھی بعض اشعار علامتی ہیں مگر ان میں علامتوں کا وہی انداز اختیار کیا گیا ہے جو غزل کے لیے اجنبی نہیں ہے۔ ان اشعار میں ذخیرۂ الفاظ کے استعمال میں بھی زیادہ احتیاط برتی گئی ہے اور ایسے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جنھیں روایتی غزل کے شائق بھی ٹکسال باہر قرار نہیں دے سکتے۔ ایسے اشعار کی کچھ مثالیں یہ ہیں:

بزم یاراں سے پھری باد بہاری مایوس
ایک سر بھی اسے آمادۂ سودا نہ ملا

سب کے سب باہر ہوئے وہم و خرد ہوش و تمیز
خانہ دل میں تم آؤ، ہم نے پردا کر دیا

اک عکس ناتمام پہ عالم کو وجد ہے
کیا پوچھنا ہے آپ کے حسن و جمال کا

گیا شباب تو اب آئینہ میں کیا دیکھوں
وہ لطف ہی نہ رہا باغ میں بہار کے بعد

یا شہید جلوۂ ساقی ہو یا مے خانہ چھوڑ
ہوش کی پروا نہ کر یا شیشہ و پیمانہ چھوڑ

کچھ نہ پوچھ اے ہم نشیں میرا نشیمن تھا کہاں
اب تو یہ کہنا بھی مشکل ہے وہ گلشن تھا کہاں

اجل کی نیند آجاتی ہے آخر سننے والوں کو
قیامت کا اثر پاتا ہوں دنیا کی کہانی میں

چمن کی یہ کیسی ہوا ہو گئی
کہ صرصر سے بدتر صبا ہو گئی

غرض یہ تیسرا دور اکبر کی غزل کا انقلابی دور ہے جس نے غزل کی روح اور قالب کو اس قدر بدل دیا ہے کہ روایتی غزل کا شیدا اسے پہچاننے میں دقت محسوس کرے گا- اگرچہ کہیں کہیں اب بھی اس میں بعض مروجہ علامتیں نظر آجاتی ہیں مگر وہ بھی مفہوم کے اعتبار سے بالعموم انفرادیت لیے ہوئے ہیں-

غزلیات کا چوتھا دور ۱۹۰۴ع سے شروع ہوتا ہے اور اکبر کی وفات تک رہتا ہے- ۱۹۰۳ع کے آخر میں اکبر ملازمت سے فارغ ہوئے مگر علیل اور نحیف- عشرت بھی انگلستان میں تھے- خرچ کم نہ ہوا' تنخواہ آدھی رہ گئی- اس پر امراض کا ہجوم- ۱۹۰۷ع میں عشرت واپس آئے مگر اب اکبر کی عمر ساٹھ سال سے تجاوز کر چکی تھی- صحت ان کی کبھی قابل رشک نہ رہی تھی- اب تو وہ بوڑھے ہو چکے تھے- اس بڑھاپے میں بھی انہیں کئی صدمات سہنے تھے- پہلے ان کی بیوی فوت ہوئی چنانچہ ایک صدمہ بیوی کی وفات کا' دوسرے اس بات کی پریشانی کہ گھر کون سنبھالے گا- عشرت ان سے دور نوکری پر اور ہاشم کم سن- ابھی وہ اس صدمے سے سنبھلے نہیں تھے کہ ایک اور سانحہ پیش آیا- چودھویں سال میں ہاشم فوت ہوا- اب ان کی رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی- اس کے بعد وہ جتنا عرصہ زندہ رہے آرزوے مرگ میں رہے:

نئے انجام مبارک رہیں نوخیزوں کو
میں ہوں اور آرزوے مرگ و گرفتاری دل

اس دور کی غزلیات انہیں واقعات کی نسبت سے افسردہ دلی اور شکستہ مزاجی کی مظہر ہیں- تصوف کی طرف وہ پہلے بھی مائل تھے اب اس میں زیادہ شدت آگئی- عشرت کے سات سالہ قیام یورپ نے انہیں مغرب سے اور بھی برگشتہ کر دیا- بیوی اور بچے کی وفات نے انہیں بے ثباتی دنیا کا بھرپور احساس دلایا- چنانچہ اس دور کی غزلیات میں فنا اور تصوف کے مضامین کا غلبہ ہے- اگرچہ اب بھی جوانی کی شوخی کہیں کہیں اپنا رنگ دکھاتی ہے مگر

اسکی حیثیت شعلہ مستعجل کی سی ہے- زیادہ تریہی رنگ ہے جس کی مثالیں درج ذیل ہیں :

وقت طلوع دیکھا وقت غروب دیکھا
اب فکر آخرت ہے دنیا کو خوب دیکھا

سکھ ملا جس کو زمانے میں مبارک ہو اسے
ہم نے تو کچھ بھی نہ پایا غم و حسرت کے سوا

ہر ارادے میں نظر آتی ہے اک صورت یاس
شغل اب کچھ بھی نہیں فسخ عزیمت کے سوا

دنیا کا دیدنی وہ تماشا نکل گیا
اب گرد رہ گئی ہے یہ' میلا نکل گیا

کام کوئی مجھے باقی نہیں مرنے کے سوا
کچھ بھی کرنا نہیں اب کچھ بھی نہ کرنے کے سوا

چھا گئی زردی چمن پر جلوۂ گل ہو چکا
جور صرصر کے دن آئے' دور بلبل ہو چکا

سانس لینے میں بھی اے اکبر کرو اب احتیاط
موقع فریاد و آہ بے تامل ہو چکا

مجھ کو محبت اب نہ رہی زندگی کے ساتھ
کیا زندگی' گذر نہ سکے جب خوشی کے ساتھ

وہ سوز و گداز اس محفل میں باقی نہ رہا اندھیر ہوا
پروانوں نے جلنا چھوڑ دیا شمعوں نے پگھلنا چھوڑ دیا

زندگانی کا مزا، دل کا سہارا نہ رہا
ہم کسی کے نہ رہے، کوئی ہمارا نہ رہا

زمانہ میرے زخم دل کو ہرگز سی نہیں سکتا
جیوں شاید مگر آرام سے اب جی نہیں سکتا

اس دور کے بارے میں یہ تاثر صحیح نہیں کہ اس میں سراسر اسی قسم کی شاعری کی گئی ہے۔ خاصی بڑی تعداد میں اب بھی ایسے اشعار موجود ہیں، اور وفات تک برابر ملتے ہیں، جن میں انفرادیت، اختراع اور جدت پائی جاتی ہے جو اکبر کے خاص انداز میں ہیں اور جن سے اکبر کے تخیل میں کسی انحطاط کا احساس نہیں ہوتا، بلکہ ان اشعار میں سے چند ایک تو حاصل کلام کہلانے کے مستحق ہیں۔ اس کی بھی کچھ مثالیں درج کی جاتی ہیں:

بازار مغربی کی ہوا سے خدا بچائے
میں کیا، مہاجنوں کا دوالا نکل گیا

غالباً خاتمہ بالخیر، سمجھ لو اس کا
جس کے مرنے کا نئی روشنی نے غم نہ کیا

ان کا تیر پالسی اور شیخ و بابو کا گریز
خوب ہی لطف شکار روبہ و خرگوش ہے

تارک الوضعوں میں دو چار نے پایا ہے فروغ
خیر اتنے شہدا تھے تو یہ غازی بھی سہی

رزولیوشن کی شورش ہے مگر اس کا اثر غائب
بلبلوں کی صدا سنتا ہوں اور کھانا نہیں آتا

تنگ دل دنیا سے اس دور فلک میں آ گیا
جس جگہ میں نے بنایا گھر، سڑک میں آ گیا

تھی شب تاریک، چور آئے، جو کچھ تھا لے گئے
کر ہی کیا سکتا تھا بندہ کھانس لینے کے سوا

مجھ کو تو اکبر کا یہ مصرع رہا کرتا ہے ورد
جمع ہیں اولاد آدم ہند کے گیہوں کے گرد

تمہارے کھیت سے لے جاتے ہیں بندر چنے کیونکر
یہ بحث اچھی ہے اس سے حضرت آدم بنے کیونکر

بوڑھوں کے ساتھ لوگ کہاں تک وفا کریں
لیکن نہ آئے موت تو بوڑھے بھی کیا کریں

کیوں سول سرجن کا آنا روکتا ہے ہم نشیں
اس میں ہے اک بات آنر کی، شفا ہو یا نہ ہو

مولوی صاحب نہ چھوڑیں گے، خدا گو بخش دے
گھیر ہی لیں گے پولیس والے، سزا ہو یا نہ ہو

سر افرازی ہو اونٹوں کی تو گردن کاٹئے ان کی
اگر بندر کی بن آئے تو فیض ارتقا کہئے

مرے صیاد کی تعلیم کی ہے دھوم گلشن میں
یہاں جو آج پھنستا ہے وہ کل صیاد ہوتا ہے

یہ اشعار اگرچہ دور چہارم کے ہیں مگر ان میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جن کی تفصیل دور سوم میں درج کی گئی ہے۔ اور یہی وہ خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے اکبر منفرد غزل گو تسلیم کیے گئے ہیں۔ مگر اس کے باوجود اکبر کی غزل کو ہماری تنقید میں اہمیت نہیں دی جاتی اکثر نقاد جدید غزل کا آغاز حالی سے کرتے ہیں اس کے بعد سمجھا جاتا ہے کہ غزل کو زوال آگیا۔ پھر اس کا نشاۃ الثانیہ حسرت، اصغر اور فانی وغیرہ سے ہوا۔ چند لکھنے والے اقبال کی غزلیات کو بھی بہت اہم سمجھتے ہیں مگر اکبر کی غزل کا اول تو کوئی نقاد خصوصی طور پر ذکر ہی نہیں کرتا اور اگر رائے زنی کرتا بھی ہے تو اس کا انداز ویسا ہوتا ہے جیسا کہ عبدالقادر سروری کی اس رائے سے ظاہر ہے:

> ''تغزل کا چسکا اکبر کو آخر تک باقی رہا لیکن ابتدائی زمانے کے عاشقانہ جذبات بعد میں متصوفانہ خیالات میں تبدیل ہو گئے تھے—— اکبر کی غزل رفتہ رفتہ اخلاق، معرفت، فلسفہ اور سیاست کے مسائل کی حامل ہوتی گئی۔ ظرافت اور خوش مذاقی، جو اکبر کی شاعری کا نمایاں وصف ہے، کہیں کہیں غزل میں بھی نظر آجاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ غزل میں اکبر کو کوئی اجتہاد کا درجہ نہیں ملا۔ بقول مولانا عبدالماجد بی۔ اے غزل گو شاعر کی حیثیت سے اکبر کو شہرت عام کبھی حاصل نہیں ہوئی۔'' (۳۴)

عبدالماجد نے جو کچھ کہا ہے وہ سروری کی رائے کی تائید نہیں کرتا۔ شہرت عام کا حاصل نہ ہونا اور بات مگر غزل میں منفرد حیثیت رکھنا اور چیز ہے۔ اگرچہ یہ بات یقیناً درست ہے کہ اکبر کے منفرد مقام کو بحیثیت غزل نگار کبھی تسلیم نہیں کیا گیا مگر حقیقت یہ ہے کہ اکبر غزل کے بہت بڑے مجتہد ہیں۔ ان کی غزل حالی سے زیادہ جدید ہے اور اقبال سے زیادہ متنوع۔ حالی نے اگرچہ غزل کو سیاسی مضامین کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے مگر وہ بہت حد تک غزل کی روایت کے قریب رہے ہیں اور انہوں نے الفاظ، تراکیب اور علامتوں میں غزل کی روایت کی بہت حد تک پیروی کی ہے۔ یہی کیفیت اقبال کی ہے۔ وہ بیشتر مقامات پر غزل کی آراستہ زبان اور اس کے مخصوص ذریعہ اظہار کے پابند ہیں۔ حسرت، اصغر اور فانی تو اسالیب میں روایتی تغزل کا بھرپور تتبع کرتے ہیں مگر اکبر کے ہاں غزل کی روایت کی پیروی سے آغاز کر کے اس میں اس قدر انقلابی تبدیلیاں کی گئی ہیں کہ اس سے پہلے یا اس کے بعد کسی نے نہیں کی تھیں۔ ان کی غزلیات میں نہ صرف یہ کہ موضوعات میں ایسی جدت ہے جو کسی اور غزل گو کے ہاں موجود نہیں بلکہ اسلوب میں بھی اس قدر

ندرت ہے جو کسی دوسرے غزل گو شاعر کے ہاں نہیں پائی جاتی- سیاسی اور تہذیبی اور معاشرتی مضامین ہمیشہ غزل کا حصہ رہے ہیں لیکن ہر غزل گو شاعر کے ہاں ان کی ایک خاص نسبت عشقیہ' اخلاقی اور فنا کے مضامین سے ہوتی ہے- اکبر کے ہاں یہ نسبت تبدیل ہو گئی ہے- ان کے ہاں تہذیبی' معاشرتی اور سیاسی مضامین غزل کا غالب حصہ بن گئے ہیں- اسلوب میں اکبر نے اور بھی زیادہ تبدیلی کی ہے- ایسے الفاظ جنہیں غزل گو تغزل کے منافی سمجھتے تھے' بکثرت استعمال کیے ہیں- نئی علامتیں وضع کی ہیں- خاص کردار تراشے ہیں- بالکل نئی امیجری استعمال کی ہے جو دنیائے غزل میں تازہ وارد ہے- مگر اس کے باوجود انہیں غزل کا مجتہد نہیں سمجھا جاتا تو اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ اکبر کی غزل اس قدر منقلب ہو گئی ہے کہ نقاد اسے غزل کی بجائے نظم سمجھتے ہیں مگر یہ اکبر کی غزل سے انصاف نہیں ہے- ان کی غزل میں اس صنف کی بہت سی خصوصیات اب بھی برقرار ہیں- انہوں نے غزل کی بنیاد یعنی ہیئت سے کہیں انحراف نہیں کیا- ان کے ہاں ایک ہی غزل میں اشعار عموماً مربوط نہیں ہوتے بلکہ مفہوم کے اعتبار سے الگ تھلگ ہوتے ہیں - اور اگر کہیں ایسا ہوتا ہے تو غزل کی یہ بنیاد بہر حال برقرار رہتی ہے کہ ہر شعر اپنی جگہ بالکل مکمل ہو- غزل کی ایک بڑی خوبی نکتہ سنجی ہے- بڑا غزل گو شاعر وہی ہے جو کوئی منفرد' دلچسپ اور نئی بات کہے- اس اعتبار سے کوئی اور غزل گو مشکل سے اکبر کا مقابلہ کر سکتا ہے- اب رہا ان کا انداز بیاں تو اکبر نے غزل کے اسالیب میں بھی اس بات کو ملحوظ رکھا ہے کہ اسلوب موضوع کے مطابق ہونا چاہیے اور اسی کا نام بلاغت ہے-

قطعات

اکبر الہ آبادی بطور قطعہ نگار خصوصی اہمیت رکھتے ہیں- اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ صنف ان کے موضوعات سے ایک خصوصی تعلق رکھتی ہے- دوسرا سبب یہ ہے کہ اردو قطعات میں اکبر نے کئی اضافے کیے ہیں- ان دونوں نکات کی تفصیل بیان کرنے کے لیے صنف قطعہ پر کچھ روشنی ڈالنی ضروری ہے-

قطعہ (بکسر اول و فتح سوم) عربی زبان کا لفظ ہے جس کا لغوی مطلب کسی چیز کا ٹکڑا' حصہ یا جزو وغیرہ ہے- بعض لوگ ق پر فتح بھی پڑھتے ہیں اور فصحائے متاخرین نے اسے جائز قرار دیا ہے-(۳۵) شاعری کی اصطلاح میں قطعہ ایسی نظم کو کہتے ہیں جو دو یا دو سے زیادہ اشعار پر مشتمل ہو- قافیے کی ترتیب میں غزل اور قصیدے سے مشابہ ہو' مگر مطلع کی موجودگی ضروری نہیں- البتہ تمام اشعار میں ایک ہی مضمون ادا کیا جانا ضروری ہے-

قطعہ عربی زبان کی قدیم ترین اصناف میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے آغاز کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ابتدا میں یہ قصیدے یا غزل کا حصہ ہوتا تھا مگر رفتہ رفتہ الگ ہو کر اس نے ایک مستقل صنف سخن کی حیثیت کر لی۔ عربی شعرا کے ہاں قصائد کے ساتھ ساتھ قطعات بھی خاصی تعداد میں ملتے ہیں۔

اہل فارس نے بیشتر اصناف شعر اہل عرب سے اخذ کی ہیں قطعہ بھی ایسی ہی صنف ہے۔ ایرانیوں کے ہاں فارسی شاعری کے اسلامی عہد میں آغاز کے ساتھ ہی قطعات نگاری کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ محمد بن وصیف، حنظلہ بادغیسی، محمود وراق، فیروز مشرقی اور شہید بلخی وغیرہ کے ہاں قطعات کا آغاز ہوا۔ بعد میں یہ صنف مقبول ہوئی۔ فارسی میں قطعہ نگاری کے بہتر نمونے سنائی، مسعود سعد سلمان، انوری، اوحدی، ابن یمین اور سعدی وغیرہ کے ہاں مل جاتے ہیں۔ ان شعرا کے قطعات سے صنف قطعہ کی جو خصوصیات معلوم ہوتی ہیں وہ یہ ہیں کہ ایک اچھی نظم کی طرح قطعے کے تمام اشعار زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں۔ دوم قطعات کے لیے اگرچہ کسی موضوع کی قید نہیں تاہم عموماً عشقیہ مضامین قطعات میں بیان نہیں کیے جاتے۔ جن مضامین کو قطعے میں زیادہ جگہ دی جاتی ہے وہ عموماً فلسفیانہ اور اخلاقی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ سوم قطعات میں عموماً فضا غیر رومانی اور حقیقت پسندانہ سی ہوتی ہے اور اس میں بسا اوقات تفصیلات بھی ایسی ہی پیش کی جاتی ہیں جو واقعیت پر مبنی ہوں چہارم اگرچہ قطعات میں زیادہ سے زیادہ اشعار کی کوئی حد مقرر نہیں لیکن عموماً اس کا ایک موزوں اور متناسب جسم ہوتا ہے۔ اور اگر کوئی قطعہ غیر ضروری طور پر طول کھینچ جائے تو اس کے اثر میں لازماً کمی آ جاتی ہے۔

اردو کے قطعہ نگار شعراء نے فارسی شعرا کی مقرر کی ہوئی حدود کو پوری طرح مدنظر رکھا ہے۔ اردو میں قطعہ نگاری کے چار ادوار ہیں:

پہلا دکنی دور جس کی نمائندگی نصرتی، محمد قلی قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ، غواصی اور ولی وغیرہ کرتے ہیں۔ دوسرا دور شمالی ہند میں حاتم سے شروع ہو کر میر و سودا اور اس کے بعد میرحسن و مصحفی و انشا سے ہوتا ہوا ذوق و غالب پر ختم ہوتا ہے۔ تیسرا دور حالی سے شروع ہوتا ہے اور اقبال کی وفات کے لگ بھگ ختم ہو جاتا ہے۔ اکبر بھی اسی دور میں شامل ہیں۔ یہ قطعات کے انتہائی عروج کا دور ہے چوتھے دور کا آغاز ۱۹۴۰ع کے لگ بھگ ہوتا ہے اور آج تک جاری ہے۔ ان چار ادوار میں سے پہلے دو دور ایسے ہیں جن میں قطعے کو کوئی اہمیت حاصل نہیں تھی۔ دکن میں اس کی بہت کم مثالیں ملتی ہیں۔ اس کے بعد شمالی

ہندوستان میں بھی اسے کچھ زیادہ مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ میر و سودا کے دور میں البتہ غزل میں قطعہ بند اشعار لکھنے کا رواج زیادہ تھا مگر ذوق و غالب پر پہنچ کر یہ بھی کم ہو چکا تھا۔ حالی نے قطعات کو حیات نو بخشی۔ انہوں نے بعض سیاسی' معاشرتی اور اخلاقی مضامین کے بیان کے لیے قطعے کی صنف سے بہت کام لیا۔ اکبر الہ آبادی حالی سے بھی آگے نکل گئے۔ اقبال کے ہاں بھی قطعات اکبر کے قطعات سے ہرگز کم مایہ نہیں ہیں "ضرب کلیم" بیشتر قطعات ہی پر مشتمل ہے۔ ۱۹۴۰ء ع کے بعد سے رباعی کے انداز پر دو اشعار والے قطعات کا رواج زیادہ ہو گیا ہے۔ اختر انصاری' احسان دانش' احمد ندیم قاسمی' جوش ملیح آبادی—— اور اب اخباروں میں روزانہ لکھے جانے والے سیاسی قطعات کے مصنفین اس کی مقبولیت کا سبب بن گئے ہیں۔

اکبر کے ہاں قطعات اتنی تعداد میں موجود ہیں جو ان سے پہلے کسی اردو شاعر کے ہاں نہیں۔ ان کے کلیات کی چاروں جلدوں سے قطعات و رباعیات کو الگ کر کے دو جلدوں میں شائع کیا گیا جنہیں بھیا احسان الحق نے مرتب کیا ہے اور "بزم اکبر" کراچی نے چھاپا ہے۔(۳۶) پہلی جلد چار سو صفحات پر مشتمل ہے اور دوسری جلد دو سو چالیس صفحات پر محیط ہے۔ ان میں رباعیات کم ہیں اور قطعات زیادہ ہیں۔ اس سے اکبر کے قطعات کی تعداد کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ بالفاظ دیگر اکبر نے صنف قطعہ میں اتنا کچھ لکھا ہے جتنا بعض شعراء کا کل کلام ہوتا ہے۔

اکبر نے صنف قطعہ پر اتنی توجہ کیوں صرف کی ہے؟ اس سلسلے میں ڈاکٹر اعجاز حسین لکھتے ہیں:

> "غزل' قصیدہ' مستزاد' رباعی سب ہی پر وہ اگلے زمانے میں طبع آزمائی کر چکے تھے۔ اس کے لیے یہ سب کے سب ڈھانچے مناسب نہ تھے.... انہوں نے زیادہ تر قطعات و رباعیات کو اپنی مہم کا وسیلہ منتخب کیا.... ویسے کبھی کبھی غزل کی بھی تکنیک کام میں لاتے رہے۔ فرد پر طبع آزمائی کرتے تھے لیکن عام طور سے قطعات و فردیات ہی پر اکتفا تھی۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ عام مسائل کو طوالت کے ساتھ بیان کرنا نہیں چاہتے تھے کیونکہ ان کا پیرایہ بیان اس کا متقاضی تھا کہ بات چٹکلے میں ادا کر دی جائے۔ تسلسل کے ساتھ دیر تک کسی بات کو بیان کرنے میں ذہن پر بھی بار پڑتا ہے اور ہنسی ضبط کرنے میں ایک ایک (کذا) بات کا اثر بھی کم ہو جاتا ہے.... علاوہ اس کے اکبر کے سامنے زیادہ

تر ایسے مسائل تھے جن کو زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کرنے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ مثلاً پردے کی موافقت' انگریزی لباس سے منافرت' نماز نہ پڑھنے والوں کی مذمت وغیرہ۔ ان باتوں کی مخالفت میں زیادہ کہنے سننے کی گنجائش نہ تھی۔ اور سب سے خاص بات یہ ہے کہ اکبر کسی فلسفیانہ صلاحیت کے مالک بھی نہ تھے کہ باتوں کو تبحر علمی کے ساتھ شاعری میں پیش کرتے۔ چنانچہ ان کے یہاں تخیل کی بلندی بہت کم ملتی ہے۔ ان دقتوں اور ضرورتوں کو دیکھ کر یہ ماننا پڑتا ہے کہ اکبر نہایت دور اندیش فنکار تھا جس نے اپنی صلاحیت کا صحیح اندازہ کر کے زمانے کی دلچسپی اور ضرورت کو ظریفانہ انداز میں پیش کر کے خراج تحسین وصول کر لیا۔"(۴۷)

سب سے خاص بات تو صحیح نہیں ہے۔ اس مقالے کے ابتدائی ابواب میں اکبر کے تبحر علمی اور فلسفیانہ صلاحیت کی تفصیل بیان کی جا چکی ہے' البتہ یہ باتیں بالکل درست ہیں کہ عصر حاضر کے مسائل کو موضوع بنانے کے سبب طول کلامی کی ضرورت نہ تھی' کیونکہ وہ جن رجحانات کو ہدف طنز بنا رہے تھے' ان کی تفصیلات سے لوگ آگاہ تھے' مگر چونکہ نتائج سے غافل تھے اس لیے اکبر رجحانات کی طرف اشارے کر کے نتائج بیان کر دیتے ہیں یہ بات بھی بالکل درست ہے کہ مزاح نگار شاعر کا فن پارہ زیادہ تفصیل کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ غرض اکبر کے فن کار ہونے کا عمدہ ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ وہ ایسی اصناف کو منتخب کرتے ہیں جو ان کے موضوعات سے ہم آہنگ ہوتی ہیں۔

اکبر کی شاعری کے دور اول میں علیحدہ قطعات نہیں ملتے۔ البتہ غزلیات میں قطعہ بند اشعار جا بجا نظر آجاتے ہیں۔ ان کے موضوعات عشقیہ اور متصوفانہ ہیں۔ یہ غزل کے عام روایتی قطعات سے کسی طرح مختلف نہیں ہیں۔ ان کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

غریب خانے میں للہ دو گھڑی بیٹھو
بہت دنوں میں تم آئے ہو اس گلی کی طرف
ذرا سی دیر ہی ہو جائے گی تو کیا ہو گا
گھڑی گھڑی نہ اٹھاؤ نظر گھڑی کی طرف
جو گھر میں پوچھے کوئی' خوف کیا ہے کہہ دینا
چلے گئے تھے ٹہلتے ہوئے کسی کی طرف

اس میں موضوع یا فن کے لحاظ سے کوئی جدت نظر نہیں آتی۔ ان قطعات کے

مطالعے سے یہ توقع نہیں ہو سکتی کہ ان کا لکھنے والا کبھی صنف قطعہ کا ماہر بنے گا۔ اکبر غزل گوئی کے ابتدائی دور کو چھوڑ کر جب عصری موضوعات کی طرف مائل ہوئے' اس وقت انہیں صنف قطعہ کی اہمیت کا احساس ہوا۔ چنانچہ "کلیات اکبر" کی جلد اول میں ایسے قطعات بڑی تعداد میں نظر آتے ہیں جن میں اس دور کے مختلف مسائل پیش کئے گئے ہیں ان مسائل کی تفصیل باب چہارم میں بیان کی جاچکی ہے۔ قطعات میں زیادہ تر یہ مسائل اس دور کے دونوں گروہوں کے نظریات کا تقابل کرتے ہوئے پیش کیے گئے ہیں۔ مثلاً اس قطعے میں:

قدیم وضع پہ قائم رہوں اگر اکبر
تو صاف کہتے ہیں سید یہ رنگ ہے میلا
جدید طرز اگر اختیار کرتا ہوں
خود اپنی قوم مچاتی ہے شور واویلا
جو اعتدال کی کہئے تو وہ ادھر نہ ادھر
زیادہ حد سے دیے سب نے پاؤں ہیں پھیلا
ادھر یہ ضد ہے کہ لیمنیڈ بھی چھو نہیں سکتے
ادھر یہ دھن ہے کہ ساقی صراحی مے لا
ادھر ہے دفتر تدبیر و مصلحت ناپاک
ادھر ہے وحی ولایت کی ڈاک کا تھیلا
غرض دو گونہ عذاب است جان مجنوں را
بلائے صحبت لیلیٰ و فرقت لیلیٰ

ظاہر ہے کہ اس افراط و تفریط میں اکبر اعتدال کی تلقین کرتے ہیں۔ ان کے ہاں اس انداز کے تقابلی قطعات اور بھی ہیں۔

غزلیات میں اکبر کے طنزیہ اسالیب زیادہ تر لفظی رعائتوں' روزمرہ و محاورہ اور علامتوں پر مشتمل ہیں۔ غزل کے مقابلے میں قطعہ چونکہ نسبتاً تفصیل پسند صنف ہے اس لیے قطعات میں طنز کا جو حربہ انہوں نے سب سے زیادہ استعمال کیا ہے وہ "بیان واقعہ" ہے وہ کسی ایسے واقعے کو منتخب کرتے ہیں جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے علامتی شکل اختیار کر لیتا ہے اس لیے اس میں معنویت کی دو سطحیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ایک عام واقعاتی سطح' دوسری علامتی سطح۔ واقعات کے بیان میں وہ بعض شوخ جزئیات کو مرکزی واقع کا تاثر ابھارنے کے

لیے بڑی فنکاری سے استعمال کرتے ہیں- مندرجہ ذیل قطعہ ان تمام خصوصیات کی بہت اچھی مثال ہے:

اک مس سیمیں بدن سے کر لیا لندن میں عقد
اس خطا پر سن رہا ہوں طعنہ ہائے دل خراش
کوئی کہتا ہے کہ بس اس نے بگاڑی نسل قوم
کوئی کہتا ہے کہ یہ ہے بدخصال و بدمعاش
دل میں کچھ انصاف کرتا ہی نہیں کوئی بزرگ
ہوکے اب مجبور خود اس راز کو کرتا ہوں فاش
ہوتی تھی تاکید لندن جاؤ' انگریزی پڑھو
قوم انگلش سے ملو' سیکھو وہی وضع و تراش
جگمگاتے ہوٹلوں کا جا کے نظارہ کرو
سوپ وکاری کے مزے لو چھوڑ کر یخنی و آش
لیڈیوں سے مل کے دیکھو ان کے انداز و طریق
ہال میں ناچو' کلب میں جا کے کھیلو ان سے تاش
بادۂ تہذیب یورپ کے لنڈھاؤ خم پہ خم
ایشیا کے شیشۂ تقویٰ کو کر دو پاش پاش
جب عمل اس پر کیا' پریوں کا سایہ ہو گیا
جس سے تھا دل کی حرارت کو سراسر انتعاش
سامنے تھیں لیڈیاں زہرہ وش و جادو نظر
یاں جوانی کی امنگ اور ان کو عاشق کی تلاش
اس کی چتون سحر آگیں' اس کی باتیں دل ربا
چال اس کی فتنہ خیز' اس کی نگاہیں برق باش
وہ فروغ آتش رخ جس کے آگے آفتاب
اس طرح جیسے کہ پیش شمع پروانے کی لاش
جب یہ صورت تھی تو ممکن تھا کہ اک برق بلا
دست سیمیں کو بڑھاتی اور میں کہتا دور باش؟

دونوں جانب تھا رگوں میں جوش خون فتنہ زا
دل ہی تھا آخر، نہیں تھی برف کی یہ کوئی قاش
بار بار آتا ہے اکبر میرے دل میں یہ خیال
حضرت سید سے جا کر عرض کرتا کوئی، کاش !
درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ ای
باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

تکنیک کے اعتبار سے اکبر کے بہت سے قطعات ایسے ہیں جنہیں رباعی نما قطعات کہنا چاہیے۔ ان میں اور رباعی میں صرف بحر کا فرق ہے۔ رباعی ایک مخصوص بحر یعنی ہزج مثمن کی اخرب و اخرم شاخوں میں لکھی جاتی ہے جب کہ قطعے کے لیے بحر کی کوئی پابندی نہیں۔ باقی خصوصیات میں یہ قطعات رباعی سے مختلف نہیں ہوتے۔ رباعی کی ترتیب قوافی، تعداد اشعار اور خیال کی رو میں بتدریج اضافہ ان میں بھی موجود ہے۔ اگرچہ ایسے قطعات شاذ و نادر اکبر سے قبل بھی مل جاتے ہیں مگر اکبر نے بڑی تعداد میں یہ قطعات پہلی مرتبہ لکھے ہیں اور ان میں شعوری طور پر رباعی کی خوبیاں پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اس وجہ سے انہیں رباعی نما قطعات کا بانی قرار دیا جائے تو مناسب ہو گا۔

رباعی نما قطعات میں اکبر کے ہاں مضامین کا بے حد تنوع ملتا ہے۔ حمد، نعت، مذہب، تصوف، اخلاق، فلسفہ، معاشرت، سیاست، تہذیب، تعلیم، غرض کہ کوئی موضوع ان کی حدود سے باہر نہیں۔ بعض قطعات طنز و ظرافت کے اچھے نمونے ہیں اور بعض میں ڈرامائی کیفیت ملتی ہے۔ غرض اکبر کے یہ رباعی نما قطعات صنف قطعہ میں ایک نیا تجربہ اور ایک اچھا اضافہ ہیں۔ ذیل میں چند ایسے قطعات پیش کیے جاتے ہیں جس سے موضوعات کی وسعت اور تکنیک کے تنوع کا اندازہ ہو سکے گا:

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

دیکھا مناظروں کا بہت اس نے رنگ ڈھنگ
اکبر کے دل میں اب نہ رہی بحث کی امنگ

کہتے بہت صحیح تھے یہ حضرت مذاق
ایماں برائے طاعت و مذہب برائے جنگ

میں دیکھتا ہوں صلح و محبت ہے اٹھ گئی
ہر دل سے، ہر گروہ سے، ہر خاندان سے
اس کا سبب نہیں ہے سوا اس کے اور کچھ
یعنی کہ اٹھ گیا ہے خدا درمیان سے

چہرۂ یورپ کا میں پروانہ ہوں
اس کی ہر اک بات کا دیوانہ ہوں
شب میں پیدائش ہوئی ہے پیش شمع
جلوۂ خورشید سے بیگانہ ہوں

خواہان نوکری نہ رہیں طالبان علم
قائم ہوئی ہے رائے یہ اہل شعور کی
کالج میں دھوم مچ رہی ہے پاس پاس کی
عہدوں سے آ رہی ہے صدا دور دور کی

نہ لیسنس ہتھیار کا ہے، نہ زور
کہ ٹرکی کے دشمن سے جا کر لڑیں
رزولیشن بد دعا کردو پاس
کہ اٹلی کی توپوں میں کیڑے پڑیں

ہوں مبارک حضور کو گاندھی
ایسے دشمن نصیب ہوں کس کو
کہ پٹیں خوب اور سر نہ اٹھائیں
اور کھسک جائیں جب کہو کھسکو

جدید دور میں جوش، احسان دانش، احمد ندیم قاسمی، اختر انصاری اور ان کے بعد بہت سے شاعروں نے رباعی نما قطعات پر جو اس قدر توجہ دینی شروع کی ہے تو انہوں نے اکبر کے چراغ سے اپنا چراغ جلایا ہے۔ ممکن ہے ان میں سے بعض لوگ اکبر سے براہ راست متاثر نہ ہوں مگر جوش کے اکبر سے روابط مسلم ہیں، یہاں تک کہ ان کے پہلے مجموعے "روح ادب" کا دیباچہ اکبر نے لکھا تھا۔ اسی طرح احسان دانش کو اکبر سے عقیدت ہے اس لیے ان دو حضرات کے ہاں اکبر کے اثرات کا امکان ہو سکتا ہے۔ باقی لوگوں پر یہ اثرات بالواسطہ ہیں۔

اکبر کے ہاں قطعات کی تیسری قسم قطعات تاریخ کی ہے۔ یہ قطعات عموماً اہم موقعوں پر لکھے جاتے ہیں۔ ولادت، وفات، تقریب، تعمیر اور اسی قبیل کے دوسرے موقعوں پر قدیم زمانے میں ایسے قطعات کا لکھا جانا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ ایسے قطعات کے آخری مصرعے یا بعض اوقات آخری شعر سے اس واقعے کا سنہ حروف ابجد کے حساب سے نکل آتا ہے۔ اکبر الہ آبادی تک پہنچتے پہنچتے قطعات تاریخ لکھنے کا رواج کم ہو چکا تھا، تاہم بعض شعرا اسے روایت کے طور پر قبول کر لیتے تھے اور کبھی کبھی دوستوں کی فرمائشیں انہیں مجبور کر کے ایسے قطعات لکھوا لیتی تھیں۔ اکبر نے قطعات تاریخ بہت کم لکھے ہیں۔ ان کے ہاں یہ قطعات کچھ تو فرمائشی ہیں جیسے نوحہ وفات عثمان پرشاد پسر مہاراجہ سرکشن پرشاد۔ کچھ ایسے ہیں جن کی طرف وہ از خود مائل ہوئے ہیں۔ ان قطعات میں "بر وفات مولانا شبلی نعمانی" "بر وفات سید ہاشم مرحوم"، "تاریخ وفات بی بوٹا صاحبہ زوجہ ثانی اکبر" شامل ہیں۔ قطعات تاریخ میں سب سے بڑی خوبی یہ دیکھی جاتی ہے کہ مادۂ تاریخ ایسا دلکش اور انوکھا ہو جس میں حفظ ہو جانے کی صلاحیت ہو۔ اکبر کے قطعات تاریخ میں سب سے اچھا قطعہ بوٹا جان کی وفات والا ہے۔ اس کے اشعار ادبی خصوصیات سے مالا مال ہیں اور مادۂ تاریخ بھی دلچسپ ہے۔ اس قطعے کے چند اشعار مع مادہ تاریخ پیش خدمت ہیں :

آں نونہال خوبی، ماہ دو ہفتہ من
در نوبہار عمرش رفت از فضائے ہستی
پیمانہ مئے غم سرشار و نیشم کرد
رفتم سر مزارش در بے خودی و مستی
آہے ز دل کشیدم گفتم کہ اے مہ من
با ایں کمال رفعت حیف است میل پستی

اے خوش نگاہ وا کن چشمان سحر آگیں
چیزے بگو بہ عاشق لب ھا چرا بہ بستی
ناگہ ندائے از غیب آمد بگوش جانم
کاے بے خبر ز ایماں اے محو بت پرستی
آں را کہ شعلہ خوانی واں را کہ برق دانی
آں جملہ بود رنگ نقش طلسم ہستی
عبرت کشود چشم حیرت بہ ہوشم آورد
در سینہ دفن کردم جوش و خروش ہستی
تاریخ فوت گفتم در صنعت عجیبے
بوٹا بروں شد اکبر از گرد باغ ہستی

یہ مادۂ تاریخ صنعت تخرجہ میں ہے۔ یعنی "گرد باغ ہستی" کے اعداد ۱۸۰۲ ہوتے ہیں۔ ان میں سے "بوٹا" کے اعداد جو ۴۰۹ ہیں، تفریق کرنے سے سال وفات ۱۳۹۳ برآمد ہوتا ہے۔ اس میں علاوہ اس صنعت کے معنوی حسن بھی موجود ہے۔ لیکن اکبر کے تمام قطعات تاریخ میں یہ حسن موجود نہیں۔

آخر میں اکبر کے ہاں قطعات کی ایک اور قسم بھی ملتی ہے۔ یہ قطعات بعض تقریبات اور دیگر اہم مواقع پر لکھے گئے ہیں مگر ان میں تاریخ نکالنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ ان میں سے ایک قطعہ ڈاکٹر منیارڈ کی مہارت جراحی کے متعلق ہے۔ ایک قطعہ سید جلال الدین طہرانی مدیر "حبل المتین" کے بارے میں ہے۔ ایک لالہ نہال چند کے متعلق ہے جو اس زمانے میں کونسل کے ممبر تھے۔ ایک میں منشی نثار حسین سے آموں کی فرمائش کی ہے۔ ایک کسی محمد موسیٰ صاحب کی بھیجی ہوئی لیچیوں کے شکریے کے طور پر لکھا گیا ہے۔ اسی قبیل کے دوسرے قطعات میں ڈاکٹر اقبال کی ایک نظم کی تعریف، ایم۔ آر۔ آرزو کا بنولے کا تیل، تقریظ کتاب "ہدیہ حیدری" وغیرہ ہیں۔ بروفات سید محمود میں مرثیے کا رنگ پیدا نہیں ہوا، اسے بھی قطعات کے ماتحت شمار کرنا چاہیے۔ یہ قطعات، جیسا کہ عموماً ہوتا ہے، محض رسمی ہیں۔ ان میں ادبی خصوصیات بہت کم ملتی ہیں۔ فرمائشی شاعری کے ہونے کے باعث ان میں آورد اور تکلف جھلکتا ہے۔ مثلاً منشی نثار حسین سے آموں کی فرمائش والا قطعہ ملاحظہ کیجیے جو اس قسم کے قطعات میں نسبتاً بہتر چیز ہے:

نامہ کوئی نہ یار کا پیغام بھیجئے
اس فصل میں جو بھیجئے بس آم بھیجئے
ایسے ضرور ہوں کہ انہیں رکھ کے کھا سکوں
پختہ اگر ہوں بیس تو دس خام بھیجئے
معلوم ہی ہے آپ کو بندے کا ایڈریس
سیدھے الہ آباد مرے نام بھیجئے
ایسا نہ ہو کہ آپ یہ لکھیں جواب میں
تعمیل ہو گی، پہلے مگر دام بھیجئے

ان کی ادبی قدر و قیمت تو کیا ہوگی البتہ ان سے اکبر کے احباب سے مراسم' ان کی دلچسپیاں اور زندگی کے بعض پہلو معلوم ہو جاتے ہیں۔

رباعیات:

اردو شاعری میں رباعی کو زیادہ مقبولیت حاصل نہیں ہو سکی' تاہم ہر دور میں کچھ رباعیاں ضرور لکھی گئی ہیں اور بعض ادوار میں ان کی تخلیق میں خاصا اضافہ بھی ہوا۔ یہ صنف اپنی بعض خصوصیات کی وجہ سے بہت دلچسپ ہے۔ ایک اس سبب سے کہ اردو میں جتنی مشہور اصناف رائج ہیں' ان سب کا سلسلہ کسی نہ کسی طرح عربی شاعری سے مل جاتا ہے مگر رباعی فارسی الاصل صنف ہے۔ دوم رباعی واحد صنف سخن ہے جس کے لیے ایک معین وزن کی پابندی لازم ہے۔ اگر کوئی سے چار مصرعے رباعی کی مخصوص ترتیب قوافی میں لکھے جائیں مگر ان میں اس معین وزن کی پابندی نہ کی گئی ہو تو اسے رباعی نہیں کہا جا سکتا۔

رباعی کی ایجاد کے بارے میں عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ یہ ہنگامی اور اتفاقی ایجاد ہے۔ اس سلسلے میں مختلف تذکرہ نگاروں نے افراد کے ناموں کی تبدیلی کے ساتھ ایک ہی واقعہ بیان کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کسی بادشاہ یا امیر کا بچہ جوز بازی کر رہا تھا۔ اس نے جوز لڑھکائے جو رفتہ رفتہ گو کی طرف لڑھکنے لگے۔ ایک جوز دوسری طرف جاتا نظر آیا مگر تھوڑی دیر میں وہ بھی گو کی طرف مڑ گیا۔ اس پر بچے کی زبان سے بے ساختہ یہ مصرعہ نکلا: "غلطاں غلطاں ہمی رود تالب گو" اس امیر یا بادشاہ کو یہ مصرع موزوں معلوم ہوا۔ اس نے اپنے درباری شاعر سے اس نئے وزن کے متعلق پوچھا تو اس نے وضاحت کی کہ یہ ہزج کی قسم سے تعلق رکھتا ہے۔ اور بعد میں اس پر تین مصرعوں کا اضافہ کر کے اسے رباعی بنا دیا۔(۳۸) حافظ

محمود شیرانی اس روایت کو تسلیم نہیں کرتے۔ ان کی رائے یہ ہے:

"حقیقت یہ ہے کہ نظم کی وہ صنف خاص جس کو ہم رباعی کہنے کے عادی ہیں، کوئی شخصی ایجاد نہیں ہے بلکہ چہار بیتی کا ارتقائی نتیجہ ہے۔ قدیم الایام میں ایران میں ایک خاص قسم کی نظم رائج تھی۔ اس کے اوزان عربی اوزان سے غالباً متخرج نہیں بلکہ ایران زا اور مقامی معلوم ہوتے ہیں۔ قدما ہزج کے مربعات میں ان کا شمار کرتے ہیں۔ تعداد میں وہ چار شعر ہوتے ہیں اور چاروں شعروں میں قافیہ لانا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ متاخرین نے اس میں ترمیم کی کہ اس کے وزن مربع کو مثمن قرار دیا جس کا قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ ان چار ابیات کی تعداد دو شعروں میں محدود ہو گئی اور چار قافیوں کے بجائے صرف تین قافیے ضروری سمجھے گئے اور مصرعہ سوم خصی رکھا گیا۔" (۳۹)

خود حافظ محمود شیرانی اسے بگمان غالب ایرانی صنف تسلیم کرتے ہیں اور اس بات کی تصدیق اس بات سے ہو جاتی ہے کہ عربی میں اس کا سراغ نہیں ملتا۔ ایران میں خیام، ابو عبداللہ انصاری، ابو سعید ابوالخیر اور سحابی جیسے عمدہ رباعی نگار پیدا ہوئے جنہوں نے اس صنف کے لیے اپنی کوششوں کو وقف کر دیا۔ ان کے علاوہ بھی متعدد شعرا نے رباعیاں لکھیں۔

اردو میں اسے فارسی جیسی مقبولیت تو حاصل نہیں ہو سکی، پھر بھی ہر دور میں دیگر اصناف کے ساتھ ساتھ رباعیات بھی لکھی جاتی رہیں۔ دکنی شاعروں میں محمد قلی قطب شاہ، غواصی، علی عادل شاہ شاہی، نصرتی، ولی اور سراج وغیرہ نے رباعیاں لکھی ہیں۔ شمالی ہند میں میر و سودا کے دور سے اس کا سلسلہ شروع ہوا۔ میر، سودا، تاباں، بیاں، بیدار، ہدایت، سوز وغیرہ نے رباعیات لکھیں مگر ان میں سے درد کی رباعیات کو خاص درجہ دیا جاتا ہے۔

لکھنوی شعرا میں میر حسن، انشا، جرات، مصحفی، رنگین وغیرہ نے رباعیات کی طرف کم و بیش توجہ مبذول کی ہے مگر انیس اور دبیر نے اسے زیادہ اہمیت دی ہے۔ غالب، مومن اور ذوق کے ہاں ان کا وجود محض رسمی ہے۔ جدید دور میں حالی اور اکبر کو اس سلسلے میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کے بعد جگت موہن لال رواں، فانی بدایونی، یاس یگانہ چنگیزی، امجد حیدر آبادی، جوش ملیح آبادی، تلوک چند محروم، اثر لکھنوی، فراق گورکھپوری اور علاء الدین کلیم وغیرہ اہم رباعی نگار ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ اردو رباعیات میں اکبر کا مرتبہ کیا ہے؟ اکبر کو اردو رباعی میں مخترع کی حیثیت حاصل نہیں۔ نہ ہی انہوں نے اپنے آپ کو رباعی کے لیے مخصوص کر لیا

ہے۔ رباعی ان کے ہاں بعض دیگر اصناف کے مقابلے میں ضمنی حیثیت رکھتی ہے مگر اس کے باوجود انھوں نے اس سے بہت زیادہ صرف نظر بھی نہیں کیا۔ ان کی رباعیات غزل جتنی تعداد یا قطعے جیسے معیار کی حامل تو نہیں ہیں، پھر بھی وہ یکسر نظر انداز کرنے کے قابل بھی نہیں۔ ان کی رباعیات تعداد میں سینکڑوں تک پہنچتی ہیں۔ موضوعات کے اعتبار سے بھی ان میں خاصا تنوع ہے۔ طنزیہ اور مزاحیہ مضامین سے لے کر نہایت سنجیدہ، فلسفیانہ، اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی مضامین ان کی رباعیات میں موجود ہیں۔ اگرچہ رباعی کے لیے موضوعات کی کوئی تخصیص نہیں مگر بعض موضوعات ایسے ہیں جو شروع سے صنف رباعی کے ساتھ وابستہ رہے ہیں۔ ان میں خصوصاً بے ثباتی دنیا کے خیالات اور اخلاقی نصائح کا رواج زیادہ رہا ہے۔ کچھ اس روایت کی وجہ سے اور کچھ اس لیے کہ اکبر کی رباعیاں جوانی گزارنے کے بعد کی تخلیق ہیں، ان میں زیادہ رباعیاں پند و نصائح سے بھرپور ہیں۔ یہاں تک کہ فن کے تقاضوں کو عموماً نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ کہیں کہیں فن کی حدود میں آنے کی کوشش ضرور کی گئی ہے مگر یہ خال خال ہے، جیسے ذیل کی رباعیات میں:

کیا تم سے کہیں جہاں کو کیسا پایا
غفلت ہی میں آدمی کو ڈوبا پایا
آنکھیں تو بے شمار دیکھیں لیکن
کم تھیں بخدا کہ جن کو بینا پایا

غفلت کی ہنسی سے آہ بھرنا اچھا
افعال مضر سے کچھ نہ کرنا اچھا
اکبر نے سنا ہے اہل غیرت سے یہی
جینا ذلت سے ہو تو مرنا اچھا

ان رباعیات میں لہجے کا جو اعتماد ہے وہ انہیں بے کیف نثریت کی سطح سے بلند کر دیتا ہے۔

سماجی موضوعات، جو ان کی غزلوں اور نظموں میں علامتوں کے پیرائے میں یا طنزیہ انداز بیان کے ساتھ ادا ہوتے ہیں اور اچھے لگتے ہیں، رباعیات میں براہ راست بیان کر دیئے گئے ہیں:

بھولے جاتے ہیں ہسٹری بھی اپنی
مذہب کو بھی ضعیف پاتے ہیں ہم

ہے دولت و جاہ بھی کمی پر ہر روز
ظاہر یہ ہے کہ مٹتے جاتے ہیں ہم

سیاسی رباعیات نسبتاً بہتر ہیں۔ سبب یہ ہے کہ ان میں طنز و مزاح موجود ہے۔ تقابل و تمثیل وغیرہ سے بھی انہیں موثر بنانے میں مدد لی گئی ہے:

تدبیر کریں تو اس میں ناکامی ہو
تقدیر کا نام لیں تو بدنامی ہو
القصہ عجیب ضیق میں ہیں ہندی
یورپ کا خدا کہاں ہے جو حامی ہو

بعض اوقات بے کیف رباعیوں کو محض قافیوں کے صوتی کھٹکوں نے گوارا بنا دیا ہے:

اللہ کا حق اگر تلف ہوتا ہے
اس کے لیے کون سر بکف ہوتا ہے
دنیا طلبی میں ہے یہ ہنگامہ و شور
حاصل پھر اس سے کیا شرف ہوتا ہے

رباعیات اکبر کے متعلق سید عابد علی عابد لکھتے ہیں:

"اکبر کی رباعیات اکثر معیاری طور پر مترنم اور خوش آہنگ نہیں ہیں۔"[۸]

البتہ مصرعوں کی تراش خراش کی حد تک ان میں بڑی پختگی ہے۔ اس سلسلے میں چند مثالیں بے موقع نہ ہوں گی:

یورپ والے جو چاہیں دل میں بھر دیں
جس کے سر پر جو چاہیں تہمت دھر دیں
بچتے رہو ان کی تیزیوں سے اکبر
تم کیا ہو خدا کے تین ٹکڑے کر دیں

سید کی طرف تو چندہ لانے کی ہے بیخ
اور شیخ کے گھر میں بھجگانے کی ہے بیخ
بہتر ہے یہی کہ بت پرستی کیجیے
گو اس میں بھی صبح کو نہانے کی ہے بیخ

اب تک کوئی بہتری تو ظاہر نہ ہوئی
گزرے جاتے ہیں ہم پہ سال و مہ و یوم
شاید کہ یہی ترقی قومی ہے
ہر شخص بجائے خود بنا ہے اک قوم

غرض اکبر کی رباعیات اس صنف میں کوئی بہت بڑا کارنامہ نہ سہی، تاہم اردو رباعی کے عام معیار کو دیکھتے ہوئے اردو رباعی نگاروں میں انہیں کچھ نہ کچھ اہمیت دینی پڑتی ہے۔

مثنویات:

اردو میں مثنوی کی اصطلاح سنتے ہی طویل واقعاتی نظموں کا ایک سلسلہ ذہن میں آ جاتا ہے جو دکن میں شروع ہوا اور وہیں درجہ کمال تک پہنچا۔ بعد میں اسے اتنی زیادہ ترقی تو نہ مل سکی، تاہم "خواب و خیال" (اثر) "سحر البیان" (میر حسن) "گلزار نسیم" (دیا شنکر نسیم) اور "زہر عشق" (نواب مرزا شوق) نے اس روایت کو ختم ہونے سے بچا لیا۔ اردو ادب کی تاریخ میں ان مثنویات کے علاوہ کچھ چھوٹی چھوٹی نظمیں بھی لکھی جاتی رہی ہیں جو اگرچہ ترتیب قوافی کے لحاظ سے مذکورہ واقعاتی مثنویوں سے مختلف نہیں ہیں مگر ان کی نوعیت میں بڑا فرق ہے۔ یہ مثنویاں صرف قافیے کی حد تک طویل مثنویوں سے ملتی جلتی ہیں ورنہ ان میں اختلاف کا میدان زیادہ وسیع ہے۔ ان کو نظمیہ مثنویاں یا نظم نما مثنویاں کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ بعض صورتوں میں صرف نظم کا لفظ بھی کافی ہوگا۔ سید احتشام حسین نے لکھا ہے:

> "نظم کا لفظ مختلف سلسلوں میں مختلف معانی میں استعمال ہوتا رہا ہے.... کبھی غزل کو الگ کر کے باقی تمام اصناف کو نظم کہہ دیتے ہیں لیکن جب نظم کا لفظ شاعری کی ایک خاص صنف کے لیے استعمال ہوتا ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے اشعار کا ایسا مجموعہ جس میں ایک مرکزی خیال ہو۔ اس کے لیے کسی موضوع کی قید نہیں اور نہ ہی اس کی حیثیت معین ہے۔ ایسی نظموں کو اردو کی قدیم اصناف ادب سے الگ ہی رکھا جاتا ہے جن کی ایک علیحدہ حیثیت اور تاریخ ہے۔"(۱۴)

اس اقتباس سے یہ نتیجہ صریح حاصل ہوتا ہے کہ اگر مرکزی خیال کے حامل چند اشعار کا مجموعہ کسی بھی ہیئت میں لکھا جائے تو اسے نظم کہا جا سکتا ہے۔ اردو میں ایسی مختصر نظمیں قدیم زمانے میں قطعہ، مثنوی، مسمط کی مختلف شکلوں، ترجیع اور ترکیب بندوں کی

صورت میں ہمیں ملتی ہیں۔ چونکہ موضوع زیر بحث میں ہمارا تعلق ان مختصر نظموں سے ہے جو مثنوی کی ہیئت میں لکھی گئی ہیں اس لیے فی الحال ہم بحث کو مثنوی نما نظموں تک ہی محدود رکھیں گے۔ اکبر کی ان ہیئتوں میں لکھی ہوئی منظومات کا تذکرہ آئندہ صفحات میں ہو گا۔

مختصر نظم نما مثنویات اردو ادب میں بہت قدیم زمانے سے رائج ہیں۔ اس سلسلے میں قدیم ترین نمونہ فرید الدین مسعود گنج شکر سے منسوب ہے:

تن دھونے سے دل جو ہوتا پوک
پیش رو اصفیا کے ہوتے غوک
ریش و سبلت سے گر بڑے ہوتے
بوکڑوان سے نہ کوئی بڑے ہوتے
خاک لانے سے گر خدا پائیں
گائے بیلاں بھی واصلاں ہو جائیں
(یہ)(۴۲) عشق کا رموز نیارا ہے
جز مدد پیر کے نہ چارا ہے (۴۳)

اس طرح کی نظمیں دکن کے بعض شعرا کے ہاں بھی ملتی ہیں۔ بندہ نواز گیسو دراز، میراں جی شمس العشاق، محمد قلی قطب شاہ، علی عادل شاہ شاہی وغیرہ۔

شمالی ہندوستان میں بھی قدیم زمانے کے شعراء کے ہاں ایسی منظومات ملتی ہیں۔ فائز کی نظمیہ مثنویاں مثلاً تعریف پنگھٹ، تعریف ہولی وغیرہ اس کے دلچسپ نمونے ہیں۔ اسی طرح حاتم کی مثنوی "قہوہ تماکو و حقہ" اور شاہ مبارک آبرو کی "در آرائش معشوق" بھی اس قسم کی نظموں کے ابتدائی نمونے ہیں۔ میر کے ہاں در صفت مرغ بازاں، مذمت خانہ خود، در مذمت دنیا وغیرہ اچھی نظمیں ہیں جو ان مختصر نظموں کے ارتقا کا ثبوت ہیں۔ سودا اور فغاں نے بھی بعض ہجویات کے لیے یہی صنف اختیار کی ہے۔ شعرائے لکھنؤ کے ہاں اگرچہ کمتر تاہم نظمیہ مثنویوں کا رواج رہا ہے۔ انشا کی "مرغ نامہ" اور مثنوی "زنبور" وغیرہ اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ بعد میں دلی کے شعرا کے ہاں یہ رجحان بہت کم ہو گیا ہے بلکہ مطلقاً کلام مربوط کی طرف شعرا نے توجہ کرنا چھوڑ دیا، پھر بھی کہیں نہ کہیں مختصر مثنوی کے نمونے مل جاتے ہیں۔ مومن کی مثنوی "برائے جہاد" اور غالب کی مثنوی "در صفت انبہ" اس سلسلے کی مشہور مثالیں ہیں۔ انجمن پنجاب کی نظم نگاری کی تحریک نے اس صنف پر

شعرا اور سامعین کی توجہ کو پھر سے مرکوز کر دیا تھا- چنانچہ حالی و آزاد اور آزاد کے شاگردوں اور بعض دوسرے شاعروں نے اُسی صنف میں برسات' سردی' حب وطن اور امید' انصاف وغیرہ ایسے موضوعات پر مختصر مثنویاں لکھیں- انجمن پنجاب کے ان جدید مشاعروں کے فوراً بعد ایسی نظموں کا رواج بڑھ گیا- اسمٰعیل میرٹھی کی بہت سی مختصر مثنوی نما نظمیں اور شبلی نعمانی کی بعض تخلیقات اسی ذیل میں آتی ہیں-

اکبر الہ آبادی اسی دور کے شاعر ہیں- انجمن پنجاب کے جدید مشاعروں کے آغاز کے وقت ان کا شہرہ بطور غزل گو ہو چکا تھا لیکن ان کی طرف اتنی توجہ نہیں دی جاتی تھی جتنی اس دور کے دوسرے غزل گو اساتذہ مثلاً داغ' امیر مینائی' ریاض خیر آبادی' جلیل مانک پوری' جلال' بے خود اور سائل وغیرہ کے کلام کو حاصل تھی- اسی دور میں اکبر نے محض غزل گوئی کو ترک کر کے دوسری اصناف سخن میں شعر کہنے کے تجربات شروع کر دیے تھے- ان کی نظم نگاری کا دور ان کی غزلیات کے تیسرے دور کے ساتھ شروع ہوا- اس لحاظ سے یہ تقریباً "اودھ پنچ" کے اجرا سے شمار کرنا چاہیے- "نامہ بنام اودھ پنچ" مثنوی کی ہیئت میں ہے اور غالب امکان یہی ہے کہ یہ اکبر کی پہلی "نظمیہ" مثنوی ہے- اس میں اشعار کی تعداد ایک سو پندرہ ہے- اس میں مختلف خیالات اور جزئیات کے ذریعے مرکزی تاثر کو جس عمدگی سے ابھارا گیا ہے' وہ خاصے کی چیز ہے- اس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس صنف اور اس ترتیب قوافی میں ان کا دل خوب لگا ہے-

اس پہلی کامیابی سے حوصلہ پا کر انہوں نے ایک زیادہ طویل مثنوی کا تجربہ کیا- چنانچہ اسی سال انہوں نے ایک رزمیہ مثنوی لکھی جو ۱۸۷۷ع میں ہونے والی روس اور ترکی کی جنگ کے بارے میں ہے-اس کے متعلق "علی گڑھ میگزین" کے اکبر نمبر میں سید شبیہ الحسن نونہروی لکھتے ہیں:

"ذیل میں ہم اکبر کی ایک رزمیہ مثنوی کے کچھ منتخب اشعار درج کر رہے ہیں- یہ تمام اشعار غیر مطبوعہ ہیں-"(۴۴)

چند صفحوں کے بعد ایک نامکمل مثنوی کے کچھ اشعار درج کیے گئے ہیں- یہ تو درست ہے کہ کلیات اکبر میں یہ اشعار نہیں چھپے مگر انہیں غیر مطبوعہ قرار دینا درست نہ ہوگا- یہ مثنوی "علی گڑھ میگزین" کے اکبر نمبر سے بہت پہلے طالب الہ آبادی کی تصنیف "اکبر الہ آبادی" میں شائع ہو چکی ہے- طالب اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

"اس غیر مطبوعہ جنگ نامے کو "صبح" میں اس لیے شامل کر رہا ہوں کہ ۱۸۷۷ع

کے واقعات کے متعلق ہے جس کا واسطہ اکبر کے حیات و کلام کے دور اول سے ہے.... اگر یہ اشعار اردو کی جگہ فارسی میں ہوتے تو فردوسی کے فنا نہ ہونے (والے) شاہ نامے کا ایک جزو ضرور ہوتے۔ طرز بیان، زمین، انتخاب الفاظ، سیاست، نغمہ، زور اور روانی کے اعتبار سے اکبر کے شعر ایسے نہیں ہیں کہ ہر شعر کے عوض میں کوئی سچا محمود ان کو ایک اشرفی نہ دے۔ میں اس موقعے پر بھی ڈاکٹر سید زاہد حسین صاحب اسسٹنٹ سرجن کا اعتراف احسان کیے بغیر نہیں رہ سکتا جنھوں نے اپنی پرائیویٹ بیاض سے مجھے ان اشعار کے نقل کی اجازت دے دی۔ غالباً یہ جنگ نامہ ان کے علاوہ اور کسی کے پاس اب باقی نہیں ہے۔ اس واسطے میں نے انتخاب بھی نہیں کیا کہ جو کچھ باقی رہ جائے وہی غنیمت ہے۔"(۴۵)

ظاہر بات ہے کہ شبیہہ الحسن نے انتخاب دیا ہے اور طالب نے تمام اشعار (جن کے باوجود مثنوی نامکمل ہے)، اس لیے ہم طالب الہ آبادی کے زیادہ شکر گزار ہیں جنھوں نے تمام و کمال مثنوی درج کر کے بہت سے اشعار کو ضائع ہونے سے بچا لیا ہے۔ یہاں طالب اور شبیہہ الحسن کے متون کا مقابلہ کرنا طوالت کا باعث ہوگا، تاہم دونوں کے ہاں تعداد اشعار کا فرق بتا دینا بھی بات کو بخوبی واضح کر دے گا۔ "علی گڑھ میگزین" میں اس مثنوی کے ایک سو چوبیس اشعار درج کیے گئے ہیں جبکہ طالب اس سے بیس بائیس برس پہلے اس کے دو سو پچپن اشعار چھاپ چکے ہیں، یعنی دگنے سے بھی کچھ زیادہ۔

یہ مثنوی مشہور رزمیہ بحر متقارب مثمن مقصور و محذوف میں لکھی گئی ہے اسی بحر میں فردوسی کا شاہنامہ اور فارسی کی بعض دیگر رزمیہ مثنویاں ہیں۔ اور یہ رزم نگاری کے موضوعات کے لیے موزوں بھی ہے۔ اس میں بعض ٹکڑے تو ایسے ہیں جہاں صحیح معنوں میں قدیم رزمیہ مثنویوں کی فضا پیدا ہو گئی ہے:

وہ عثمان پاشائے جنگ آزما
بہ اقبال و ہمت مقابل ہوا

پکارا کہ اے جنرل روسیاہ
نہ کر اپنے لشکر کو ناحق تباہ

فریب و دغا پر تجھے ناز ہے
یہاں زور بازو میں اعجاز ہے

تجھے حیلہ سازی میں بس ہے کمال
یہاں حق پرستی کا ہر دم خیال

اگر تجھ کو ہے دعویٰ جنرلی
تو ہے اپنے قبضے میں تیغ علی

زبس اس کے دل میں تھا نخوت کا جوش
لگا کہنے اے ترک ناداں! خموش

عبث اس قدر ہے یہ لاف و گزاف
ابھی تیرے لشکر کو کرتا ہوں صاف

کیا الغرض اس نے سامان جنگ
پیاپے لگی چلنے توپ و تفنگ

عجب جوشش فضل یزداں ہوئی
کہ ترکوں کو فتح نمایاں ہوئی

ان ابتدائی مثنویوں کے نسبتاً طویل تجربات کے بعد اکبر نے مختصر مثنویوں کا آغاز کیا جو ترتیب قوافی کے لحاظ سے مثنویاں مگر خصوصیات کے اعتبار سے قطعات کے زیادہ قریب ہیں۔ ان میں اشعار کی تعداد عموماً آٹھ دس ہوتی ہے۔ اگرچہ بعض اوقات یہ تعداد کم ہوتے ہوئے صرف دو رہ جاتی ہے اور کبھی بڑھتے بڑھتے پندرہ بیس تک بھی پہنچ جاتی مگر عموماً یہ مختصر مثنویاں اور نظمیہ مثنویاں متناسب جسامت کی حامل ہوتی ہیں۔ اکبر کو ان نظموں میں قطعات سے بھی زیادہ کامیابی ہوئی ہے جس کی وجہ بظاہر یہ ہے کہ قطعے کے قافیوں کی ترتیب زیادہ پیچیدہ ہوتی ہے جس کے لیے مضمون میں بعض اوقات قافیوں کی وجہ سے قطع و برید کرنی پڑتی ہے۔ مگر اردو کی مقفیٰ اصناف میں مثنوی کے قافیوں کی ترتیب سب سے سادہ ہے۔ اس میں ایک مصرع کسی ذہنی تحفظ اور قافیے کی رکاوٹ کے بغیر ہو جاتا ہے۔ کوئی بھی قادرالکلام شخص دوسرے مصرعے کا قافیہ بلا دقت پیدا کر سکتا ہے' اور دوسرے شعر کے لیے وہ پھر اسی عمل سے گزرتا ہے' جبکہ قطعے میں خیال کے ساتھ ساتھ ہر شعر میں قافیے کا پیشگی خیال رکھنا پڑتا ہے۔

قافیے کی آسانی کی وجہ سے اکبر کی مثنویات میں جو تنوع ہے' وہ ان کے قطعات میں نہیں ہے۔ دوسرے ان میں جو ربط کلام موجود ہے وہ بھی ان کی دیگر اصناف میں کمتر نظر آتا ہے۔ ان کی نظمیہ مثنویوں میں اگر ایک طرف "برق کلیسا" جیسی طنزیہ نظم ہے تو

دوسری طرف ذیل کی نہایت متین نظم بھی ہے جس کے بعض مصرعوں پر اقبال کا شبہہ ہوتا ہے:

گرمی بحث میں انور نے یہ اکبر سے کہا
کہ رہ احمدؐ مرسل پہ تو قائم نہ رہا
رہ گئی ہے فقط اوہام پرستی تجھ میں
بادۂ جہل کی بس آ گئی مستی تجھ میں
نہ مقاصد میں بلندی' نہ خیالات صحیح
بحر عصیان و تعصب میں تو ڈوبا ہے صریح
سخت ناعاقبت اندیش ہیں شیخ و ملا
قوم برباد ہوئی جاتی ہے کھلم کھلا
کہا اکبر نے یہ الزام ہے بے شبہہ درست
تو ہے مجھ سے بھی زیادہ مگر اس راہ میں ست
کبر و تزئین و تجمل سے تجھے ہے بس کام
دل میں انکار ہے اور لب پہ ہے نام اسلام
طاعت حق کی ترے قافلے میں گرد نہیں
نفس سرد نہیں ہے' دل پر درد نہیں
ہم اگر پختگی سے جاتے ہیں خامی کی طرف
تیرا میلان ہے الحاد و غلامی کی طرف
تو بھی اس رنگ سے محروم ہے' ہم بھی محروم
صادق آتا ہے یہی قول شہید مرحوم
"اے صبا! مایہ سودا نہ تو داری و نہ من
بوئے آں زلف چلیپا نہ تو داری و نہ من"

مناظر فطرت کی طرف اکبر کا میلان بہت کم ہے مگر جتنا کچھ ہے وہ مثنویوں ہی میں نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں خصوصاً دو نظمیں قابل ذکر ہیں۔ ایک نظم "آب لوڈور" ہے جسے انگریز شاعر رابرٹ ساؤدے کی نظم سے اخذ کیا گیا ہے۔ اکبر نے قدرے آزاد ترجمہ کیا ہے اور انگریزی نظم میں جو روانی اور زور ہے اسے پوری طرح سے اردو میں منتقل کر دیا ہے۔ روانی آب کا ایسا واقعی اور خوبصورت نقشہ دکھایا ہے کہ منظر نگاری کا حق ادا کر دیا ہے۔

اس سلسلے کی دوسری نسبتاً مختصر نظم یہ ہے:

دو تیتریاں ہوا میں اڑتی دیکھیں
اک آن میں سو طرف کو مڑتی دیکھیں
بھولی، خوش رنگ، چست، نازک، پیاری
پہنے ہوئے فطرتی منقش ساری
پھرتی ہے کہ برق کی طبیعت کا ابھار
تیزی ہے کہ آنکھ کو تعاقب دشوار
جو فاصلہ کر لیا ہے باہم قائم
وہ بھی ہے بلا زیادت و کم قائم
گو تابع جوش برق پروازی ہیں
دونوں کے خطوط طیر متوازی ہیں
کیونکر میں کہوں کہ یہ نظر بندی ہے
اللہ اللہ! کیا ہنرمندی ہے
ان جانوروں میں گرل اسکول کہاں
فطرت کے چمن میں صنعتی پھول کہاں
کس بزم میں ایسا ناچ سیکھ آئی ہیں
پریاں اندر کی جس سے شرمائی ہیں
اس سمت اگر خیال انساں بڑھ جائے
دامان نظر پہ رنگ عرفاں چڑھ جائے

اس مختصر نظم میں منظر کی خوبصورتی اور اکبر کا نقطۂ نظر مل جل گئے ہیں۔ یہاں تک کہ کلیم الدین احمد جیسا نقاد بھی اس نظم سے متاثر ہوا ہے:

> کس سادگی، صفائی اور پاکیزگی سے تیتریوں کے ناچ کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ یہ تصویر رسمی نہیں۔ اکبر اس منظر سے متاثر ہوئے ہیں اس لیے یہ تصویر ایسی حسین و موثر ہے۔(۴۶)

آخر میں اکبر کی دو اور مختصر مثنویوں کا ذکر ضروری ہے۔ دونوں اپنے عہد کی سیاست کے متعلق ہیں۔ ایک چار اشعار پر مشتمل ہے، دوسری کے اشعار چھ ہیں مگر مختصر نظم کی ٹیکنیک کی کون سی خوبی ہے جو ان میں موجود نہیں۔ ایجاز کی حد تک پہنچا ہوا ایجاز علامتی

مفہوم کو حد درجہ وسیع معنویت عطا کرتا ہے۔ لفظوں کا نہایت موزوں انتخاب اور سب سے بڑھ کر ایسا ربط کلام کہ باید و شاید۔ ایسی مربوط نظمیں اردو ادب میں بہت کم لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک نظم یہ ہے:

ڈپوٹیشن کی سرسبزی جو دیکھی اس نے شملے میں
برہمن نے کہا یہ شاخ بید اور ایسے گملے میں!
کہا مہدی نے بھائی تم کو کیوں اس درجہ حیرت ہے
تمہارے واسطے یہ کیا محل رشک و غیرت ہے
تعجب کیا ہے ہم اس بت کے پہلو میں جو لیٹے ہیں
حرم کے محترم کیا دیر کے خادم سے ہیٹے ہیں؟
برہمن نے کہا بس آپ کی باتیں ہی باتیں ہیں
اجی یہ وصل کی راتیں نہیں ہیں' ان کی گھاتیں ہیں
کہا مہدی نے ہم کو تو مزے سے اپنے مطلب ہے
محبت ہو نہ ہو ان کو' امید اس کی یہاں کب ہے
برہمن نے کہا ایسا مزا اعضا کا مضعف ہے
کہا مہدی نے ہاں اس بات سے بندہ بھی واقف ہے

نواب مہدی (محسن الملک) سرکردہ مسلمانوں کا ایک وفد لے کر اس وقت شملے گئے جب انگریز ہندوؤں سے ناراض ہو گئے تھے اور مسلمانوں کو ان کے مقابلے میں ابھارنا چاہتے تھے۔ نظم میں اسی واقعے کی طرف اشارہ ہے۔ نظم مہدی اور برہمن کے درمیان مکالمے کے انداز میں شروع اور ختم ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ نام علامتی حیثیت رکھتے ہیں۔ پھر جوں جوں نظم آگے بڑھتی ہے ہر مصرع بلکہ ہر لفظ خیال کے ارتقا میں معاون ہوتا چلا جاتا ہے۔ نظم کے خاتمے پر انگریزوں کی حکمت عملی' ہندوؤں کا نقطۂ نظر اور مسلمانوں کی مجبوریاں سبھی آئینہ ہو جاتی ہیں۔ چھ اشعار کی یہ نظم ایک کارنامہ ہے۔

دوسری نظم اس سے بھی مختصر ہے۔

باون تو ہے ہوس کا' دھنہ ہے پالسی کا
لیکن ادھر تصور جاتا نہیں کسی کا
ہے کوفت لیکن اس پر مسرور ہو رہے ہیں
ہر سو اچھل رہے ہیں اور چور ہو رہے ہیں

اس قبلہ رو جماعت کا انتشار دیکھو
اس باغ میں خزاں کی اکبر بہار دیکھو
لکھے گا کلک حسرت دنیا کی ہسٹری میں
اندھیر ہو رہا ہے بجلی کی روشنی میں

اس نہایت مختصر نظم میں بھی علامتی انداز بیان کے ذریعے بتایا ہے کہ مسلمان کس طرح انگریزوں کی پالیسی کا شکار ہو کر اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ یہ سب کچھ ان کے مفاد میں ہے۔ بقول اقبال "کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا" اس نظم کی امیجری موضوع سے ہم آہنگ ہے۔ خصوصاً مسلمانوں کی کوششوں کو ایسی اچھل کود سے تشبیہ دینا جو انہیں تھکا کر چور کر دے گی اور مزید نقصان کا باعث ہوگی نہایت موزوں ہے۔

غرض اکبر الہ آبادی چھوٹی چھوٹی مثنویاں لکھنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ان سے پہلے ایسی نظموں کی جو روایت اردو ادب میں موجود ہے' وہ بڑی سیدھی سادی سی ہے۔ حتیٰ کہ حالی اور آزاد کے ہاں بھی مثنوی کی ہیئت میں لکھی ہوئی نظمیں غیر دلچسپ بیانات سے آگے نہیں بڑھ سکیں۔ مجموعی طور پر یہ نظمیں متاثر کرنے کی صلاحیت سے محروم ہیں' البتہ ان کے بعض ٹکڑے ضرور شاعری کی ذیل میں آتے ہیں۔ مگر اکبر کے ہاں ان نظموں میں قسم قسم کے تجربے کیے گئے ہیں۔ علامتی مفاہیم' امیجری کی ندرت' ربط و تسلسل کا کمال اور ایجاز بیانی قصہ کوتاہ یہ کہ جدید اردو نظم نگاری کی روایت میں یہ نظمیں ایک نہایت خوشگوار اضافہ ہیں۔

مسمط :

نجم الغنی "بحر الفصاحت" میں مسمط کی تعریف ذیل کے الفاظ میں کرتے ہیں :

"مسمط مفعول ہے تسمیط کا اور تسمیط کے معنی موتی پرونا اور جمع کرنا ہیں۔ اور اصطلاح شعرا میں اسے کہتے ہیں کہ چند مصرعے متحد الوزن والقوافی جمع کر کے بند اول کریں۔ اسی طرح اور کئی بند اسی وزن میں لکھیں اور ہر بند کا قافیہ جدا ہو۔ لیکن مصرع آخر ہر بند کا قافیے میں بند اول کا تابع ہو۔ اور اس کی آٹھ قسمیں ہیں : مثلث' مربع' مخمس' مسدس' مسبع' مثمن' متسع' معشر۔"(۴۷)

مسمط کی ان شکلوں میں سے مثلث' مربع' مخمس' مسدس اور مثمن اردو میں رائج ہیں۔ اکبر الہ آبادی نے مثمن کو استعمال نہیں کیا۔ باقی چاروں شکلیں یعنی مثلث' مربع' مخمس اور مسدس ان کے ہاں مل جاتی ہیں۔ بعض ہیئتیں شاذ ہیں جیسے مثلث' مگر بعض نسبتاً زیادہ

ہیں جیسے مخمس اور مسدس۔

مثلث کی ہیئت کا وہ نمونہ جو ان کے کلام میں ملتا ہے' کلیات کے حصہ سوم میں ہے۔ مگر اسے بمشکل مروجہ مثلث کی مثال قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس مثلث کا نمونہ یہ ہے:

اب تو یاری کا اسی پر رہ گیا ہے انحصار
جس کا تو حاسد ہے اس کا جو ہو حاسد تیرا یار
واسطے اللہ کے ہو دوستی' وہ اب کہاں؟

جنگ جب تک تھی بتوں سے نام تھا اللہ کا
اب تو ہر اک ہے مجاور اک جدا درگاہ کا
واسطے اللہ کے ہو دوستی' وہ اب کہاں؟

ہاں تجارت اور پالیٹکس میں دیکھیں جو سود
چند روزہ متفق ہوں ورنہ اے شیخ و ہنود
واسطے اللہ کے ہو دوستی' وہ اب کہاں؟

یہ نظم اس لحاظ سے تو مثلث ہے کہ ہر بند تین تین مصرعوں پر مشتمل ہے لیکن اردو مثلث میں قافیوں کی ترتیب ااا۔ ب ب ا۔ ج ج ا ہوتی ہے۔ ہر بند کا تیسرا مصرع دہرایا نہیں جاتا' تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ مگر اکبر کی اس مثلث کے ہر بند کا آخری مصرع ترجیع بند کا ہے اس لیے اس نظم کے لیے زیادہ موزوں اصطلاح مثلث در ترجیع بند ہو سکتی ہے۔

مربع ہیئت میں دو نظمیں "کلیات اکبر" جلد اول میں موجود ہیں۔ ایک نظم "جلوۂ دربار دہلی" ہے جو ۱۹۰۳ء میں دربار دہلی کے موقعے پر لکھی گئی جب لارڈ کرزن کے زمانے میں ایک بہت بڑا دربار منعقد ہوا تھا۔(۴۸) اس دربار کا تخیلی خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ اکبر اس میں شریک نہیں تھے۔ اس کی جو روداد اخباروں وغیرہ میں چھپتی رہی' اسی کو دیکھ کر زور تخیل سے نظم کا روپ دے دیا جیسا کہ آخری بند سے ظاہر ہے:

کی ہے یہ بندش ذہن رسا نے
کوئی مانے خواہ نہ مانے
سنتے ہیں ہم تو یہ افسانے
جس نے دیکھا ہو وہ جانے

لیکن یہ ذہن رسا کی بندش ایسی موزوں واقع ہوئی ہے کہ قاری اسے حقیقی نقشہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ نظم اس زمانے میں لکھی گئی جب انگریزی عملداری ہندوستان میں

اپنے عروج پر پہنچی ہوئی تھی، جسے اکبر نے خود اس نظم کے ایک مصرعے میں اس طرح ظاہر کیا ہے۔ : ع "اوج برٹش راج کا دیکھا۔" برطانوی حکومت کے اس عروج کے زمانے میں اس پر کھلم کھلا تنقید کرنا ممکن نہیں تھا۔ مگر محض توصیف اکبر کے حق بین ذہن سے بعید تھی اس لیے انھوں نے ایہام اور علائم کے ذریعے تنقید کی جسے ہندوستان کے وہی افراد سمجھ سکتے تھے جو اردو شاعری کی روایت سے آگاہ تھے۔ اس نظم کے کچھ بند برطانوی حکومت کے عروج، رعب داب اور اس کی لائی ہوئی تبدیلیوں کے مرقعے پیش کرتے ہی جیسا کہ ذیل کے بندوں میں :

پلٹن اور رسالے دیکھے
گورے دیکھے کالے دیکھے
سنگینیں اور بھالے دیکھے
بینڈ بجانے والے دیکھے

سڑکیں تھیں ہر کمپ سے جاری
پانی تھا ہر پمپ سے جاری
نور کی موجیں لمپ سے جاری
تیزی تھی ہر جمپ سے جاری

ہاتھی دیکھے بھاری بھرکم
ان کا چلنا کم کم تھم تھم
زریں جھولیں نور کا عالم
میلوں تک وہ چم چم چم چم

مندرجہ بالا بندوں میں طنز نہیں ہے مگر ذیل کے بندوں میں شوخ اشارے ملتے ہیں :

خیموں کا اک جنگل دیکھا
اس جنگل میں منگل دیکھا
برہما اور ورنگل دیکھا
عزت خواہوں کا دنگل دیکھا

کچھ چہروں پر مردی دیکھی
کچھ چہروں پر زردی دیکھی
اچھی خاصی سردی دیکھی
دل نے جو حالت کر دی دیکھی

اوج بخت ملاقی ان کا
چرخ ہفت طباقی ان کا
محفل ان کی ساقی ان کا
آنکھیں میری باقی ان کا

"عزت خواہوں کا دنگل" صریح طنز ہے ہندوستان کے درباریوں پر۔ جن چہروں پر مردی ہے، وہ ظاہر ہے کہ انگریز ہیں اور نیٹو حضرات کے چہرے زرد ہیں۔ خدا معلوم احساس کمتری سے، رعب حاکم سے یا ندامت سے۔ 'سردی' کا لفظ اکبر کے ہاں علامتی مفہوم رکھتا ہے۔

اس نظم میں سردی سے مراد یہ ہے کہ ہندوستانیوں اور انگریزوں کے مابین گرم جوشی کی کمی تھی۔ ہندوستانیوں کی پذیرائی کا کوئی سوال نہیں تھا۔ وہ مجبور تماشا تھے اور بس۔

فن کے اعتبار سے بھی اس نظم کی ایک خاص اہمیت ہے۔ یہ نظم نصاب کی بے شمار کتابوں میں شامل رہی ہے۔ اس کے بعض مصرعے ضرب المثل کا درجہ اختیار کر گئے ہیں۔ اس میں قافیہ بندی کا کمال نظر آتا ہے جس کا اکبر کو خود بھی احساس ہے:

نظم ہے مجھ کو بادۂ صافی
شغل یہی ہے دل کو کافی
مانگتا ہوں یاروں سے معافی
خیر اب دیکھیے لطف قوافی

قافیوں کی مہارت اس نظم کے متعدد بندوں سے آشکار ہوتی ہے۔ جو بند پہلے درج کیے گئے ہیں ان میں "آنکھیں میری باقی ان کا" والا بند اس کی نہایت عمدہ مثال ہے۔ ایک اور بند اس سلسلے میں پیش کیا جاتا ہے۔ یہ قافیے بھی اردو میں کسی کو کبھی نہیں سوجھے تھے:

پر تھا پہلوئے مسجد جامع
روشنیاں تھیں ہر سو لامع

کوئی نہیں تھا کسی کا سامع
سب کے سب تھے دید کے طامع

اگر اکبر عربی سے ناواقف ہوتے تو یہ قافیے انہیں کبھی نہ سوجھ سکتے۔

یہ نظم خیالات کے ارتقا کے اعتبار سے بھی بہت عمدہ ہے۔ ہر بند کا ہر مصرع خیال کے سلسلے کو آگے بڑھاتا ہے اور ہر بند دوسرے بند کے خیال پر کچھ اضافہ کرتا ہے۔ البتہ بندوں کی ترتیب میں تبدیلی کی جا سکتی ہے۔ اگر یہ خامی نہ ہوتی تو اسے اردو کی بہترین نظموں میں شمار کیا جاتا۔

مربع ہیئت کی دوسری نظم عنوان کے بغیر ہے، مگر اندرونی شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے بارے میں لکھی گئی ہے۔ اس میں نئے نظام تعلیم اور اس کے آوردگان کا بڑی بے رحمی سے خاکہ اڑایا گیا ہے۔ اس کے بعض بندوں میں تو مضحک خاکے کی خصوصیات پیدا ہو گئی ہیں:

جمع ہیں ممبر بھولے بھالے
جاڑوں کا موسم پھولے پھالے
آنکھیں پھاڑے، دانت نکالے
چندہ دے کر چھٹنے والے

اس نظم میں اکبر کے بہت سے نظریات بڑے واضح انداز میں آ گئے ہیں۔ مثلاً ان کا خیال ہے کہ سر سید احمد خاں کی کوششیں ایک خاص دور میں ضروری تھیں مگر انہیں مستقل لائحہ عمل کے طور پر اپنا لینا قوم کے حق میں سخت مضر ہے:

سید کا جو عہد مشن تھا
اس سکے کا ٹھیک چلن تھا
حسب ضرورت طرز سخن تھا
وقت وہ اور تھا اور وہی سن تھا

اسے مستقل طرز عمل بنا لینے سے قوم کو متعدد نقصانات ہوئے ہیں۔ مثلاً قوم احساس عزت سے محروم ہو گئی ہے اور چندے جمع کرنے کی عادت نے اسے بھک منگوں کی قوم میں بدل دیا:

گرمیوں میں بچوں کو تھکانا
شہروں شہروں بھیک منگانا

اور اس پر یہ بات بنانا
مفلس لڑکوں کا ہوگا ٹھکانا

اکبر یہ سمجھتے ہیں کہ یہ جال انگریزوں کا پھیلایا ہوا ہے تاکہ لوگ اسے قومی ترقی سمجھ کر اسی میں الجھے رہیں اور ان کی چالوں کی طرف توجہ نہ دے سکیں :

اک انگریز نے بات یہ کہہ دی
جس نے ترقی وہ دی یہ دی
اس بازی کی ہمیں نے شہ دی
کیسے سید، کیسے مہدی

اکبر یہ بھی واضح طور پر بتاتے ہیں کہ یہ سرکاری تعلیم اور بازاری عقل، جو لوگوں کو سکھائی جا رہی ہے، بیکار محض ہے۔ جس تعلیم کی وجہ سے یورپ نے اتنی ترقی کی ہے، وہ ہم سے دور رکھی جا رہی ہے اور ہمیں "نقلی علوم" کی تحصیل میں الجھایا جا رہا ہے، حالانکہ جس تعلیم کی ہمیں ضرورت ہے وہ فنی اور تیکنیکی ہے :

ہو گیا عقل میں کون اضافہ
خوشبو پھیلی نہ دیکھا نافہ
دیکھ لیا یاروں کا قیافہ
پایا بس خوش رنگ لفافہ

دوڑاؤ تدبیر کے ریشے
قوم میں پھیلیں فن اور پیشے
صنائی کے چلاؤ تیشے
تاکہ کٹیں افلاس کے بیشے

غرض مربع ہیئت میں یہ دوسری نظم اپنے موضوعات کے اعتبار سے پہلی نظم سے بھی زیادہ اہم ہے۔ فنی خصوصیات میں یہ اس کے برابر ہے جبکہ طنز و تعریض میں بھی کامیاب ہے۔

ان دونوں نظموں کی ترتیب قوافی اااا ــــ ب ب ب ب ــــ ج ج ج ج وغیرہ ہے۔ حالانکہ مروجہ مربع کی ترتیب قوافی ااا ب ــــ ج ج ج ب ــــ د د د ب وغیرہ ہوتی ہے۔

اس لحاظ سے یہ اکبر کی اختراع ہے۔ یہ اختراع روایتی ہیئت سے اس لیے بہتر ہے کہ روایتی مربع ہیئت میں پیچیدہ ترتیب قوافی کے باعث خیالات میں کتر بیونت کرنی پڑتی ہے' مگر اکبر کی نو دریافتہ تبدیلی نے اسے سہل کر کے خیالات کی پیشکش کے لیے زیادہ موزوں بنا دیا ہے' جس طرح مسدس کی پیچیدہ ہیئت کو مرثیہ نگاروں نے سہل کر کے روایتی مسدس سے زیادہ قابل استعمال بنا دیا تھا۔ نئی مسدس کا رواج تو عام ہو گیا' حتیٰ کہ لوگ بھول گئے کہ مسدس کی ہیئت میں تبدیلی ہوئی ہے یا نہیں۔ مگر تعجب ہے کہ مربع میں ترمیم رواج نہ پا سکی۔

مخمس کی ہیئت میں اکبر نے دس نظمیں لکھی ہیں۔ ان کے ہر دور کے کلام میں مخمس کی کوئی نہ کوئی مثال موجود ہے۔ مسمط کی مختلف شکلوں میں مخمس کو اکبر نے سب سے زیادہ استعمال کیا ہے۔ اردو میں مخمس کی ہیئت کسی زمانے میں بڑی مقبول رہی ہے۔ شہر آشوب کے لیے اکثر شاعروں نے یہی ہیئت اختیار کی ہے۔ اس کے علاوہ تضمین کے لیے بھی مخمس سے بہت دلچسپی لی جاتی رہی ہے۔ اکبر کے ہاں بیشتر مخمسات تضمین کے انداز میں لکھے گئے ہیں۔ تین مخمس حافظ کی غزل کی تضمین میں ہیں اور دو مخمس فارسی کے مشہور اشعار پر۔ ایک عرفی کی غزل پر' ایک میں ناسخ کی غزل پر تضمین ہے۔ ایک تضمین مومن کی غزل پر ہے۔ دو مخمس ایسے بھی ہیں جو تضمین کے انداز میں نہیں ہیں مگر ان میں ترجیع بند کا انداز اختیار کیا گیا ہے۔ گویا مروجہ ہیئت میں اکبر نے ایک بھی مخمس نہیں لکھا۔

ان دس مخمسات میں بالخصوص تین اہم ہیں۔ ان تینوں کا پہلا بند درج ذیل ہے :

مسان خود فروش آخر فرستادند ایں بلہا
طلب کردند زر چنداں کہ خوں افتاد در دلہا
مزاج طبع برہم شد شکست آں رنگ محفل ہا
"الا یا ایھا الساقی ادر کاسا" و ناولھا
کہ عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکل ہا"

بکری کو ساگ پات کا سودا نہیں رہا
بنگالیوں کو بھات کا سودا نہیں رہا
چوروں کو اپنی گھات کا سودا نہیں رہا
اور شاطروں کو مات کا سودا نہیں رہا

الجھا ہوا ہے چندہ و اسکول میں ہر ایک
(مخمس در ترجیع بند)

جاہ و زر کے رہے انگلش سے ہمیشہ طالب
عہد پیری میں بدل سکتے ہیں کیونکر قالب
مشتہر کر دیں یہ ہمدم میں جناب جالب
زندگی بھر تو رہا عشق بتاں ہی غالب
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے
(مخمس در ترجیع و تضمین غزل مومن)

اکبر کے مخمسات میں بھی وہی فنی خصوصیات ہیں جن کا بیان مربع کی ذیل میں ہو چکا ہے۔ تضمینوں کے ضمن میں اتنا اضافہ ضروری ہے کہ وہ جس شعر کی تضمین کرتے ہیں اس کا مزاج بدل دیتے ہیں اور وہ بالکل اکبر کے انداز کا شعر معلوم ہونے لگتا ہے۔ اکبر کے مصرعوں اور تضمین کیے جانے والے اشعار میں نہ تو بے ربطی پیدا ہوتی ہے اور نہ ہی پیوند بے جوڑ معلوم ہوتا ہے۔ تضمین نگاری میں یہی وصف اس کی کامیابی کا ثبوت ہے۔

اکبر کو مسدس کی ہیئت سے بھی دلچسپی ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مسمط کی تمام شکلوں میں مسدس سب سے زیادہ مقبول ہے۔ مرثیے اور واسوخت کے لیے تو اسے لازم و ملزوم کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ بھی سودا سے لے کر حالی تک بہت سے شعرا نے اس پر طبع آزمائی کی ہے۔ حالی کی "مسدس مد و جزر اسلام" نے اسے بے حد مقبولیت عطا کی ہے۔ اس کے بعد اقبال کی بہت سی نظموں بالخصوص شکوہ اور جواب شکوہ نے اس کی مقبولیت کو مزید آگے بڑھایا ہے۔ بعد میں کوئی مقبول عام نظم اسے میسر نہ آ سکی اور اس کے بعد اس کی طرف سے توجہ رفتہ رفتہ کم ہو گئی۔ اکبر کے ہاں کلیات اول میں اس کی چار مثالیں ملتی ہیں۔ مگر حصہ دوم اس سے خالی ہے۔ حصہ سوم اور چہارم میں محض اس کی ایک ایک مثال موجود ہے۔

ان مسدسوں کے علاوہ ایک طویل مسدس اکبر سے منسوب ہے اور "گنج پنہاں" کے نام سے چھپ چکا ہے مگر مجھے اس کے کلام اکبر ہونے کے متعلق شبہہ ہے۔ ذیل میں اس کا کسی قدر تفصیلی تجزیہ پیش کیا جاتا ہے جس سے اس کے اصلی یا نقلی مال ہونے کا راز کھل سکے گا۔

یہ مسدس ۱۹۴۱ء میں طبع ہوا ہے جسے رضا بک کمال ڈپو لاہور نے شائع کیا ہے اور کسی صاحب ایس محمد حسنین جونپوری نے اسے مرتب کیا ہے۔ پیش لفظ میں مرتب نے ایک لمبا افسانہ اس بات کی وضاحت میں لکھا ہے کہ انہیں یہ نظم کیسے دستیاب ہوئی جو انہی کے الفاظ میں درج ذیل ہے :

"۲۹ــــ ۱۹۲۸ء میں جبکہ میرا قیام بہ سلسلہ تلاش معاش الہ آباد میں تھا، میری جائے رہائش کے قریب ہی محلہ بخشی بازار میں ایک قاضی صاحب کا دولت خانہ تھا۔ قاضی صاحب کا اصلی نام تو مجھے یاد نہیں ہے، البتہ لوگ انہیں قاضی جانی کے نام سے پکارتے تھے۔ قاضی صاحب مرحوم ایک صاحب ذوق اور ادب نواز بزرگ تھے۔ اس بنا پر میں اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہو کر موصوف کے خیالات و تاثرات ادب و شعر سے مستفید ہوا کرتا تھا۔ ایک روز بر سبیل تذکرہ قاضی صاحب نے فرمایا کہ میرے پاس حضرت لسان العصر مرحوم کا ایک مسدس ہے جو حضرت نے آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے اجلاس ہفتم منعقدہ الہ آباد (۱۹۱۵ء) میں پڑھنے کے لیے تصنیف فرمایا تھا، مگر نہ جانے کن مصلحتوں کی بنا پر یا شاید ناسازی طبع کے باعث کانفرنس میں پڑھ نہ سکے۔ اس کے بعد آپ نے مسدس جوں کا توں مجھے دے دیا اور فرمایا کہ اب جب کہ یہ کانفرنس میں پیش نہ کیا جا سکا، میں اس کی اشاعت بھی مناسب نہیں سمجھتا۔ قاضی صاحب مرحوم نے بتایا کہ مسدس مرحوم کے اپنے ہاتھوں کا لکھا ہوا بے حد بلند پایہ چیز ہے۔ میں نے اسے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو قاضی صاحب نے اس شرط پر یہ مسدس مجھے دکھلایا کہ میں اسے ایک بیاض پر صاف کر دوں۔ میں نے یہ خدمت بخوشی منظور کر لی اور مسدس کو اپنی جائے قیام پر لے آیا۔ پڑھا گیا بلکہ آنکھوں سے لگایا لیکن مکروہات زمانہ اور عدیم الفرصتی کے سبب اسے ایک عرصے تک صاف کرنے اور قاضی صاحب کو واپس دینے سے قاصر رہا۔ اسی زمانے میں ایک ملازمت مل جانے کی وجہ سے میں بنارس چلا آیا۔ بنارس میں قاضی صاحب کے دو تین خط آئے کہ اگر تم نہیں صاف کر سکتے تو بغیر صاف کیے ہوئے ہی واپس بھیج دو۔ مگر میں اس تذبذب میں رہا کہ اتنے دنوں کے بعد واپس کر دینا اور صاف بھی نہ کرنا اخلاق سے بہت ہی بعید ہے۔ القصہ کچھ دنوں کے بعد میں نے اس کی دو نقلیں تیار کیں، ایک تو اپنے پاس رکھ لی اور دوسری نقل مع

اصل مسودہ کے قاضی صاحب کے پاس بذریعہ رجسٹری بھیج دی- لیکن افسوس ہے
کہ رجسٹری واپس آئی- قاضی صاحب کا انتقال ہو چکا تھا- اب وہ اصل مسودہ
اور بیاض میرے پاس محفوظ رہی- جب بنارس میں ہندو مسلم فساد کے شعلے
بھڑکے تو میں بیک بنی و دوگوش بھاگ کر وطن چلا آیا- میری عدم موجودگی میں
مکان میں آگ لگی اور تمام سامان خاکستر ہو گیا- میں نے جب سنا تو تن بہ تقدیر
صبر کر کے بیٹھ رہا- کچھ دنوں کے بعد بسلسلہ تلاش معاش لاہور چلا آیا-

مسدس کی وہ نقل جو میں نے اپنے لیے کی تھی میرا ایک بھانجا' جو بنارس
پولیس میں ملازم تھا' پڑھنے کے لئے لے گیا تھا اور وہ اسی کے پاس رہ گئی تھی-
سال گزشتہ جب میں وطن گیا ہوا تھا اور وہ بھی رخصت لے کر آیا ہوا تھا' اس
نے مجھے بتایا کہ آپ کی ایک کاپی میرے پاس ہے جو میں بنارس میں آپ کے
یہاں سے لے گیا تھا اور اس میں ایک مسدس اور کئی دوسری چیزیں لکھی ہوئی
ہیں- میں یہ سن کر اسے دیکھنے کے لیے اس قدر بیتاب ہوا کہ دوسرے ہی دن
اس کے ہمراہ تھانہ پھولپور' جہاں وہ ان دنوں تعینات ہے' گیا- خوش قسمتی سے
مسدس مجھے دستیاب ہو گیا- اب میں اسے لاہور لیتا آیا-

میرا خیال ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی حادثے کے سبب یہ نادر و نایاب
مسدس ضائع ہو جائے اس لیے میں اسے چھپوا دینا چاہتا ہوں.... آخر میں ایک
بات مجھے اور بھی کہنا ہے کہ مسدس کا اصل مسودہ اگرچہ صاف خط میں تھا مگر
کہیں کہیں مرحوم نے ترمیم و تنسیخ میں الفاظ ردو بدل کیے تھے- بعض جگہ
الفاظ قلم زد تو تھے مگر ان کے بجائے کوئی دوسرا لفظ نہ لکھا تھا- نقل کرتے وقت
جو الفاظ مجھ سے پڑھے نہ گئے' وہاں میں نے جگہ خالی چھوڑ دی تھی کہ قاضی
صاحب سے پوچھ کر پر کر لوں گا مگر واحسرتا! کہ نہ قاضی صاحب ہی رہے نہ
اصل مسودہ ہی رہا- اب اس کاپی سے نقل کر کے یہ مسدس جیسا کچھ بھی ہے'
شائع کیا جا رہا ہے- اس میں بھی وہ جگہیں نقطوں سے پر کی گئی ہیں- کیا اہل
ادب حضرات بتائیں گے کہ اس نقص کو دور کرنے کے لیے کون سی صورت
اختیار کی جا سکتی ہے؟"(۲۹)

اقتباس اگرچہ طویل ہو گیا ہے مگر اس کے بغیر تجزیہ ممکن نہ تھا- پیش لفظ کے اس
قصے کی تصدیق کسی اور ذریعے سے نہیں ہوتی- یہ درست ہے کہ شیعہ کانفرنس ۱۹۱۵ء میں

بمقام الہ آباد منعقد ہوئی تھی لیکن اکبر کی اس میں شمولیت کا امکان اس لیے نہیں ہو سکتا کہ وہ پکے سنی تھے اور یہ ممکن نہیں تھا کہ شیعہ کانفرنس کے پلیٹ فارم پر انہیں بلایا جاتا۔ اکبر نے اپنے تین خطوں میں شیعہ کانفرنس کا ذکر کیا ہے۔ ایک خط میں عبدالماجد دریابادی کو لکھتے ہیں :

"شیعہ کانفرنس کا خوب ہنگامہ رہا۔"(۵۰)

دوسری جگہ اس کانفرنس کا ذکر دو غیر مطبوعہ خطوں میں آیا ہے۔ ایک خط اکبر نے بتاریخ ۱۵ اکتوبر ۱۹۱۵ع اپنے فرزند عشرت حسین کو لکھا تھا اور نیشنل میوزیم کراچی میں محفوظ ہے۔ اس میں اکبر لکھتے ہیں :

"خسرو باغ میں شیعہ کانفرنس آج سے شروع ہے' پرسوں ختم ہوگی۔"(۵۱)

دوسرا خط ۱۹ اکتوبر ۱۹۱۴ع کو لکھا گیا ہے۔ یہ بھی عشرت حسین کے نام ہے۔ اس میں یہ جملہ ملتا ہے :

"شیعہ کانفرنس میں آنے والے کئی شاعر مجھ سے ملنے آئے' خصوصاً عزیز۔"(۵۲)

ان تینوں خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شیعہ کانفرنس میں وہ مدعو ہی نہیں تھے۔ اس لئے اتنی طویل نظم لکھنا ممکن نہیں لگتا ورنہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اکبر جو اپنے ایک ایک شعر کی اطلاع عشرت کو دیتے ہیں تقریباً نوے بندوں کی نظم لکھتے اور اس کا ذکر نہ کرتے۔ عشرت نے بھی خطوط اس قدر احتیاط سے رکھے ہوئے ہیں کہ ان کے گم ہونے کا امکان نہیں ہو سکتا۔ اس لیے نظم کا کہیں ذکر نہ ہونے کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اس طرح کی کوئی نظم نہیں لکھی ہوگی۔

علاوہ ازیں یہ دور اکبر کی متفرق نویسی کا دور ہے۔ اس دور میں وہ مسلسل گوئی بہت کم کرتے تھے اور ان کی صحت کے پیش نظر اتنی طویل نظم پر خامہ فرسائی ممکن معلوم نہیں ہوتی۔

اب پیش لفظ میں مذکورہ قاضی جانی کے مسئلے کو لیجئے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ ان کے پاس اس نظم کا مسودہ موجود تھا' جو انہیں اکبر نے دیا تھا اگر وہ اکبر الہ آبادی کے حلقہ احباب میں ہوتے تو ان کا ذکر اکبر کے کسی نہ کسی خط میں ضرور ہوتا جیسا کہ ان کے پاس آنے والے لوگوں کا ذکر ہوا ہے' مگر خطوط اکبر کسی ایسے شخص کے ذکر سے یکسر خالی ہیں۔

پیش لفظ میں کہا گیا ہے کہ "نہ جانے کن مصلحتوں کی بنا پر یا شاید ناسازی طبع کے باعث کانفرنس میں نہ پڑھ سکے۔" مسدس کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ اس میں کوئی ایسی

قابل اعتراض بات نہیں تھی کہ مصلحت کی بنا پر نہ پڑھی جاتی۔ ناسازی طبع والی بات اس لیے غلط ہے کہ اکبر جو ہر خط میں اپنی ناسازی طبع کا بالالتزام ذکر کرتے ہیں، کانفرنس کے زمانے کے خطوط میں خرابی صحت کے متعلق کچھ نہیں لکھتے۔

اب تک جتنے خارجی شواہد پیش کیے گئے ہیں ان سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اکبر نے اس قسم کی کوئی چیز نہیں لکھی۔

اب نظم کے چند اندرونی حوالے دیکھیے۔ اس میں اکبر کے شعری اسالیب کا شائبہ تک نہیں۔ صرف انگریزی کے چند الفاظ جا بجا استعمال کیے گئے ہیں یہ الفاظ اکبر کے کلام میں کہیں اور استعمال نہیں ہوئے۔ مثلاً :

کسی کو اسسٹنٹ پہلے بناؤ
مدد ٹیم ورک میں تا کہ پاؤ
کہاں ہیں وہ ہادی نیچر بلاؤ
ہر اک شے جو ہے چینج ایبل دکھاؤ
طبیعت جو دونوں کی یکساں لڑے گی
نئی کوئی دنیا بنانی پڑے گی

اس میں بھرتی کے انگریزی الفاظ کے علاوہ مصرعوں میں ربط مفقود ہے اور مفہوم اکثر جگہ در بطن شاعر رہ گیا ہے۔ یہی کیفیت تمام بندوں کی ہے۔ اکبر مشق شعری کے آغاز میں بھی اتنے خام کبھی نہ تھے چہ جائیکہ ۱۹۱۵ء میں وہ اس قدر معمولی شعر کہتے۔ اس بند کے علاوہ بھی بیشتر بندوں میں الفاظ اور محاوروں کی غلطیاں، بندش کی خامیاں اور مصرعوں میں ربط کی کمی موجود ہے۔ اکبر کا کلام ایسا نہیں ہو سکتا۔ مسدس میں ایک بھی ایسا بند نظر نہیں آتا جسے قابل تعریف قرار دیا جائے۔ بیشتر شعر نہایت معمولی درجے کے ہیں اور محض کلام منظوم کی ذیل میں آتے ہیں۔ لطف قوافی جو اکبر کا بڑا کامیاب حربہ ہے، اس کا بھی کہیں پتا نہیں ہے۔ ذیل میں ایک اور بند نمونے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جو اس قدر غلط سلط، بھسبھسا بلکہ بے معنی ہے کہ اکبر تو کجا کسی ادنیٰ درجے کے شاعر کا بھی نہیں ہو سکتا :

شب و روز کہنہ ہوئے ان کو بدلو
نئی روشنی میں نیا چل کے ڈھونڈو (۵۳)

فرشتے نئے ہوں وہ تدبیر سوچو
اگر بن سکے عرش و کرسی نیا ہو
گھر اپنا بھی بدلو تمہیں گو ہے اچھا (۵۴)
جہنم مگر پھر بھی ہے تو پرانا

بالکل مہمل بند ہے۔ بیشتر بند اس سے بہتر نہیں ہیں۔ آخر میں ایک اور بات یہ ہے کہ اس مسدس کے موضوع کا کوئی تعلق شیعہ کانفرنس سے نہیں ہے۔ ان تمام دلائل اور شواہد کی روشنی میں ہم یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہیں کہ یہ مسدس اکبر کا کلام نہیں ہو سکتا بلکہ محمد حسنین جونپوری نے غالباً خود ہی لکھ کر اکبر کے نام سے منسوب کر دیا ہے تاکہ اس طرح ان کا نام بھی امر ہو جائے اور اس میں وہ ایک حد تک کامیاب بھی رہے ہیں۔

اکبر کی جو دیگر مسدسات ہیں ان میں نسبتاً اہم "نیشنل اینتھم" اور "نظم قومی" حسب فرمائش نواب محسن الملک بہادر ہیں۔ نیشنل اینتھم مسدس در ترجیع بند ہے۔ اس میں ترجیع کا شعر مولانا جامی کا ہے :

ہنوز آں ابر رحمت درفشان است
خم و خمخانہ با مہر و نشان است

یہ چونکہ قومی ترانہ ہے اس لیے اس میں اکبر نے متشائم خیالات کو وقتی طور پر ترک کر دیا ہے :

سرور قلب و حرز جاں ہے اسلام
معین شاہی و شاہاں ہے اسلام
جہاں میں با سر و ساماں ہے اسلام
ابھی تک حافظ ایماں ہے اسلام
ہنوز آں ابر رحمت در فشان است
خم و خمخانہ با مہر و نشان است
مساجد میں وہی شور اذاں ہے
وہی اللہ اکبر بر زباں ہے
وہی جوش دل اسلامیاں ہے
وہی رت ہے وہی اب تک سماں ہے

ہنوز آں ابر رحمت در فشان است
خم و خمخانہ با مہر و نشان است

نواب محسن الملک کے حسب فرمائش لکھے جانے والا مسدس بعض مصرعوں کی حد تک مسدس حالی کی یاد دلاتا ہے۔ یہ قوم کے زوال کا ماتم ہے۔ اور حالی کے انداز میں :

تمہاری عزتیں تھیں، اوج تھا، رتبہ تھا، شانیں تھیں
تمہاری بات تھی، احکام تھے، کہنا تھا، آنیں تھیں
تمہارے ذکر میں سر گرم دنیا کی زبانیں تھیں
تمہیں تم تھے زمانے میں، تمہاری داستانیں تھیں
غرور و ناز کم کرنا پڑا تھا ایک عالم کو
سر تسلیم خم کرنا پڑا تھا ایک عالم کو

غضب ہے حب اسلامی سے خالی سب کا سینا ہے
حسد ہے، ناتواں بنی ہے، بے مہری ہے، کینا ہے
بس اپنے ہی مزے کے واسطے ہر اک کا جینا ہے
یہی قومی ترقی کا، ذرا سوچو تو، زینا ہے؟
کہاں ہے اب مسلمانوں میں باہم بے غرض الفت
جو باقی شاعروں میں ہے تو ہے وہ اک مرض الفت۔

اکبر کے یہ مسدسات قدرے غیر شاعرانہ اور کچھ بے لطف سے ہیں۔ غالباً کچھ موضوع کا تقاضا بھی ہے۔ پھر بھی یہ کلام اکبر ہے۔ کچھ بھی نہ ہوگا جب بھی لفظوں کا انتخاب اور بندشوں کی چستی تو ہوگی۔ بہر کیف اکبر نے مسمط کی ہیتوں میں جتنی نظمیں لکھی ہیں، ان میں سے مثلث کی حیثیت تو محض تبرک کی ہے۔ مسدس کی ہیئت میں نسبتاً زیادہ نظمیں ہیں مگر اتنی کامیاب نہیں۔ مربع کی ہیئت میں دو نظمیں ہیں مگر دونوں ان کے منتخب کلام میں شامل ہونے کی اہل ہیں۔ مخمس تعداد میں زیادہ ہیں اور معیار میں مربع ہیئت کی نظموں کے بعد سب سے بہتر ہیں۔

ہیئتوں کے تجربات :

اکبر کے متعلق یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ وہ روایتی ہیئتوں سے کام چلاتے رہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب کبھی ان کی اصناف شاعری پر تبصرہ کیا جاتا ہے ان کی غزلیات، قطعات، رباعیات اور کبھی کبھار مخمسات کا ذکر کر دیا جاتا ہے۔ یہ بات بہت کم لوگ جانتے

ہیں کہ انہوں نے ہیئت کے کئی تجربے بھی کیے ہیں۔

انہوں نے اقبال سے قبل ڈرامائی نظمیں لکھیں مگر ان کا موجد اقبال کو سمجھا گیا۔ انہوں نے ایک ہی نظم مختلف بحروں میں لکھنے کا طریقہ نکالا مگر کسی نے اس کی طرف توجہ نہ کی۔ انہوں نے غیر مقفی نظمیں بھی لکھیں مگر اس سلسلے میں اسمٰعیل میرٹھی اور شرر کے تجربات کے ساتھ ان کا کبھی ذکر نہ ہوا۔ اکبر کے ہاں ہیئتوں کے یہ تجربات بیسویں صدی کے آغاز کے ارد گرد شروع ہو جاتے ہیں۔ یہ سب تجربات اس قابل ہیں کہ اردو نظم کے ارتقا میں ان کی حیثیت متعین کی جائے۔

اس سلسلے میں ان کی سب سے پہلی نظم "کرزن سبھا" ہے۔ اس کے چار حصے ہیں۔ ان میں تین بحریں استعمال کی گئی ہیں۔ پہلا حصہ جو طویل ہے' آغا حسن امانت کی اندر سبھا کے انداز میں یوں شروع ہوتا ہے :

سبھا میں دوستو کرزن کی آمد آمد ہے
گلوں میں غیرت گلشن کی آمد آمد ہے

دوسرے حصے کا عنوان "آمد اقبال پری" ہے۔ اس میں فقط ایک شعر ہے :

اقبال پری آئی جو انداز بدل کر
دنیا کی ہوا ساتھ ہوئی ساز بدل کر

تیسرا حصہ ہے غزل اقبال پری کی زبانی جو اس شعر سے شروع ہوتی ہے :

ہوں ناز سے معمور' حکومت سے بھری ہوں
زریں مرا دامن ہے' میں اقبال پری ہوں

ظاہر ہے کہ یہ غزل نہیں' اسے قطعہ کہنا چاہیے۔

چوتھا حصہ ہے "مبارک باد پنچ کی طرف سے" جو دو شعروں پر مشتمل ہے :

قوم انگلش کو یہ دربار مبارک ہووے
لارڈ کرزن سا یہ سردار مبارک ہووے
ہو مبارک شہ انگلینڈ کو تخت و دیہیم
مجھ کو یہ طبع گہر بار مبارک ہووے

اس نظم کا دوسرا حصہ فرد ہے اور باقی تین حصے قطعات۔ ان چار حصوں کو' جن میں بحریں بھی مختلف ہیں' باہم ملا کر ایک نظم بنا دیا گیا ہے۔ موضوع کے اعتبار سے یہ کوئی خاص چیز نہیں۔ وسیع پیمانے پر بہت سی ایسی سبھائیں لکھی گئی ہیں مگر مختصر نظم کی حد تک

یہ نیا تجربہ ہے۔

کلیات اول کے صفحہ ۴۰۳ پر دو رباعیاں ہیں جو ایک دوسری کا جواب ہیں۔ مختلف رباعیوں میں ربط پیدا کرنے کا تجربہ بھی نیا ہے۔ دو رباعیوں سے مل کر ایک نظم بن گئی ہے۔

شیطان نے دیا یہ شیخ جی کو نوٹس
بالکل ہی گیا ہے زور اب آپ کا ٹوٹ
آئندہ پڑھیں گے آپ لاحول اگر
فوراً داغوں گا اک ڈ فیمیشن سوٹ
شیطان کا سنا جو شیخ صاحب نے یہ قول
بولے کہ فضول تجھ کو آتا ہے یہ ہول
میں خود ہوں بدل گیا زمانے کے ساتھ
پڑھتی ہے مجھی پہ اب تو دنیا لاحول

کلیات اکبر حصہ دوم میں ایک نظم بعنوان "نئی اور پرانی روشنی کی مکالمت۔" ہے اس کی ہیئت مسدس کی ہے مگر اسے اکبر نے مکالماتی نظم بنا دیا ہے۔ پہلا بند ہے "نئی روشنی کی تعلّی" دوسرے حصے میں جو پرانی روشنی کا جواب ہے' تین بند ہیں۔ ان میں سے ایک بند شکوہ اقبال کا پیشرو معلوم ہوتا ہے:

غربا بھی ہیں مگر قوم کے اجزا اکثر
غربا ہی سے تعلق میں ہے ان کو تو مفر
دور ہے ان سے خود آرائی مغرب کا اثر
بحث ان کی بھی اسی بات پہ ہے ختم مگر
آپ کا دل رہ مغرب کا اگر سالک ہے
کیجئے چین' غریبوں کا خدا مالک ہے

اس طرح کی ڈرامائی نظمیں اقبال کے ہاں بال جبریل اور ضرب کلیم وغیرہ میں نظر آتی ہیں۔

کلیات کے اسی حصے میں ایک نظم "جنگ ٹرکی و اٹلی کے متعلق رائیں" کے عنوان سے ہے۔ یہ چھ مختلف ٹکڑوں سے مل کر بنی ہے۔ چھ کے چھ ٹکڑے مختلف بحروں میں ہیں۔ اصناف کے اعتبار سے بھی ان ٹکڑوں کو مختلف نام دیے جا سکتے ہیں۔

پہلا ٹکڑا قطعہ ہے:

دکھائے گی نیا اب رنگ ٹرکی
نہ ہو گی مبتلائے جنگ ٹرکی
وہاں بھی آ گئیں مغرب کی لہریں
ہوئی اب ہم کنار گنگ ٹرکی
بہت خود رائے تھے سلطان سابق
رہا کرتی تھی ان سے تنگ ٹرکی
ہوئے رخصت وہاں سے اولڈ فیشن
ترقی اب کرے گی ینگ ٹرکی

اس کے بعد عنوان ہے "بعض یہ کہتے ہیں-" یہ حصہ ایک رباعی پر مشتمل ہے:

بدلی وہ ہوا وہ سنبل و گل رخصت
ساقی رخصت وہ ساغر مل رخصت
اب دل میں ہیں دوستان ٹرکی شاداں
لو ہو گئے پانیر کے عبدل رخصت

پھر عنوان ہے "لیکن بعض یہ فرماتے ہیں-" اس کے ماتحت مسدس کے دو بند ہیں- یہ دونوں فارسی زبان میں ہیں- ان میں سے ایک یہ ہے:

یلدیز سد راہ مخالف کنوں نماند
اندیشہ حریف بحال زبوں نماند
آں تیغ عقل و آں نگہ پرفسوں نماند
سودا بہ جوش آمد و آں رنگ و خوں نماند
چوں رخت خود بہ بست و بروں از مقام شد
عبدالحمید گفت کہ ترکی تمام شد

پھر عنوان ہے "بہت لوگ یہ کہتے ہیں-" اس کے ضمن میں صرف ایک شعر ہے:

مجھ پہ ہے تقلید واجب ہند کے دربار کی
رائے میری ہے وہی جو رائے ہے سرکار کی

اس کے بعد عنوان ہے "کوئی انقلاب زمانہ کی یوں شکایت کرتا ہے"- اس کی ذیل میں مسدس کے چار بند فارسی میں اور باقی تین اردو میں ہیں- ان میں سے ایک بند یہ ہے:

حالت ایں چیست کہ من پیش نظر می بینم
در پس کار بتاں فتح و ظفر می بینم
در حرم سوز دل و خون جگر می بینم
چرخ را وضع دگر رنگ دگر می بینم
ایں چہ شوریست کہ در دور قمر می بینم
ہمہ آفاق پر از فتنہ و شر می بینم

آخری شعر حافظ سے منسوب ہے۔ یہ تین بندوں میں دہرایا گیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ مسدس ترجیع بند میں ہے مگر آخری بند میں اسی غزل کے ایک شعر کی تضمین کی گئی ہے' اس لیے نہ تو یہ پوری ترجیع ہے' نہ ہی تضمین اور نہ ہی مسدس۔

آخری عنوان ہے "اور میں کہتا ہوں۔" یہ تین شعر کا قطعہ ہے:

کیا بحث ہے ایران سے یا ترک و عرب سے
اس وقت تجھے قطع نظر چاہیے سب سے
یا تخت پہ بیٹھے کوئی یا تخت سے اترے
رکھ کام تو دن رات فقط طاعت رب سے
تاریخ نے دیکھے ہیں بہت رنگ فلک کے
خورشید نکلتا ہے سدا پردۂ شب سے

یہ دراصل مختلف الاصناف ٹکڑوں اور مختلف الفیہ موضوعات سے متحد الاثر نظم وجود میں لانے کا ایک کامیاب تجربہ ہے۔ لوگوں کی آرا کا اختلاف اصناف اور بحور کے تنوع سے اور بھی واضح ہو جاتا ہے۔ غرض یہ نظم کامیاب ہے۔

کئی جگہ اکبر نے روایتی ہیئت میں معمولی سی تبدیلی کر کے اسے نئی ہیئت میں بدل دیا ہے۔ مثلاً یہ نظم:

سمجھا رہے تھے مجھ کو کومٹ کی وہ گردشیں
خود کر رہے تھے ناک کی ٹٹی سے سازشیں
نقشے میں دیکھتا تھا' وہ پیتے تھے جام مے
میں نے کہا حضور یہ مضمون عجیب ہے
ہیں خود تو مست بادۂ عشرت کے خم سے آپ
الجھا رہے ہیں مجھ کو ستاروں کی دم سے آپ

بولے کہ اس زمیں میں کوئی اور شعر بھی
میں نے کہا یہ بات مرے ذہن میں بھی تھی
اللہ رے ارتقائے سگان در حضور
کل تو سے تم ہوئے تھے، ہوئے آج تم سے آپ
ہنس کر دیا انھوں نے ورق بحث کا الٹ
گانے لگے وہ گیت میں پڑھنے لگا سبق

اس بلیغ نظم کی علامتوں سے قطع نظر اس میں مثنوی کی ہیئت اختیار کر کے پھر اس میں تبدیلی کی گئی ہے۔ جیسے دو افراد کی بے ترتیب سی بحث ہو اس لیے صنف میں بھی ذرا بے قاعدگی آ گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض اوقات روایتی ہیئتوں سے اس قسم کی تجرباتی ہیئتیں زیادہ موزوں ہوتی ہیں۔ اس طرح کی کئی اور مثالیں بھی اکبر کے ہاں موجود ہیں۔

گاندھی نامہ:

کتابستان الہ آباد نے ۱۹۴۸ء میں "گاندھی نامہ" کے نام سے اکبر الہ آبادی کی ایک کتاب شائع کی جو تین سو اکہتر اشعار پر مشتمل ہے۔ اس پر مقدمہ پروفیسر نعیم الرحمن نے لکھا ہے اور حواشی دیے ہیں۔ یہ اشعار مختلف بحروں کے ایک سو اٹھانوے نظم پارے ہیں جو اصناف کے اعتبار سے قطعہ، رباعی، مثنوی، فردیات وغیرہ ہیں مگر ان میں ایک اتحاد معنوی موجود ہے جو کہیں کہیں کمزور اور خفی ہو گیا ہے۔ بہرحال ان تمام اشعار میں گاندھی کی مرکزی شخصیت کے حوالے سے بیسویں صدی کے ربع اول کے سیاسی واقعات کو دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ گاندھی کو مہاتما سمجھنے والے افراد سے لے کر انہیں برطانیہ کا ایجنٹ کہنے والوں تک سبھی قسم کے لوگ اس زمانے میں موجود تھے۔ اکبر نے ان سب کے احساسات کو ان اشعار میں پیش کر دیا ہے۔ اس پورے "گاندھی نامہ" کو اگر ایک نظم سمجھا جائے تو اسے صنف نظم میں ایک تجربہ قرار دینا ہوگا۔ اس مجموعے کی تعارفی سطور میں پروفیسر نعیم الرحمن لکھتے ہیں:

> "معلوم ہوتا ہے کہ جناب مصنف کسی خاص رسالے یا اخبار کے ایڈیٹر سے مخاطب ہیں۔ افسوس ہے کہ اس مخطوطے میں کہیں کوئی تحریر ایسی نہیں ہے جس سے یہ معلوم ہو سکتا کہ یہ خطاب کن ایڈیٹر صاحب سے ہے، اور نہ کہیں کوئی تاریخ درج ہے جس سے زمانہ تحریر کا سراغ ملتا۔" (۵۵)

عبدالماجد دریابادی ان دونوں باتوں کا جواب یوں تحریر کرتے ہیں:

"۱۹۱۹ع و ۱۹۲۰ع و ۱۹۲۱ع میں یہ نیاز مند برابر حاضر خدمت ہوتا رہا اور گرامی ناموں سے بھی مشرف ہوتا رہا- یاد نہیں پڑتا کہ کبھی اس رسالے کا ذکر فرمایا ہو- سب سے پہلے اس کا ذکر آخر جولائی میں فرمایا اور آہ کہ وہی آخری ملاقات تھی- قیاس ہوتا ہے کہ اس زمانے میں اس سارے کلام کو یعنی جو کچھ بھی گاندھی جی اور ان کی تحریک ترک موالات وغیرہ کے سلسلے میں تھا' یکجا کر دینے کا خیال آیا تھا-"(۵۶)

دوسرے سوال کے جواب میں لکھتے ہیں :

"حضرت اکبر کی جس عبارت کا حوالہ ہے وہ اصل میں یوں ہے : "جناب اڈیٹر صاحب! دو چار روز سے آپ کے اڈیٹوریل فتنہ موجودہ کے متعلق بہت معنی خیز ہوتے ہیں...." اس ٹکڑے نے صاف کر دیا کہ کوئی رسالہ یا ہفتہ وار نہیں بلکہ کوئی روزنامہ ہی مراد ہے اور روزنامہ پابندی کے ساتھ صرف لکھنؤ کا "ہمدم" ہی حضرت اکبر کی نظر سے گزرتا تھا اور اڈیٹر "ہمدم" سید جالب دہلوی سے حضرت اکبر کے ذاتی تعلقات تھے- جالب صاحب گاندھی کے معاملے میں حضرتِ اکبر کے ہم خیال بھی تھے..... شاعر کا مکتوب انہی جالب صاحب اڈیٹر "ہمدم" کے نام ہے-(۵۷)

"گاندھی نامہ" کے دو حصے ہیں- پہلے حصے میں شعروں کا ربط قائم رکھنے کے لیے جا بجا نثر کے ایک ایک دو دو جملوں سے کام لیا گیا ہے- اس کی مثال بہ اختصار اشعار یہ ہے :

"جناب اڈیٹر صاحب! دو چار روز سے آپ کے اڈیٹوریل فتنہ موجودہ کے متعلق بہت معنی خیز ہوتے ہیں- آپ صحیح فرماتے ہیں کہ مہاتما گاندھی کی نسبت خیالات متحد نہیں ہیں- ایک طرف کہا جاتا ہے کہ افغانستان کا حملہ ہوگا' انگریز چلے جائیں گے' محمود شاہی ہوگی' ہندوؤں کا نقصان ہوگا- لیکن یہ کیوں نہیں کہا جاتا کہ افغانستان کا بھی پیمانہ لبریز ہو گیا-- برطانیہ سے بھڑ کر وہ بھی اپنا الحاق برٹش ہند سے کرا دے گا- وہاں بھی سگ زرد برادر شغال موجود ہیں- یہی مضمون ہے جس کی طرف شاعر اس شعر میں اشارہ کرتا ہے :

بھائی گاندھی کا وسیلہ چاہیے
ہضم کابل کا بھی حیلہ چاہیے

ایک صاحب کا یہ خیال ہے :

وہ شیخ کی شیخی رہ نہ گئی، اسلام کو بت کا رام کیا
سرکار خفا کیوں ہونے لگی، گاندھی نے تو چوکھا کام کیا

اگرچہ شیخ و برہمن ان کے خلاف اس وقت ابل رہے ہیں
نگاہ تحقیق سے تو دیکھو انہی کے سانچے میں ڈھل رہے ہیں

بعض صاحبوں کا خیال ہے کہ یہ ایک اضطراری حالت ہے، کوئی اتحاد ملکی وجود پذیر نہیں ہے:

نہ مولانا میں لغزش ہے، نہ سازش کی ہے گاندھی نے
چلایا ایک رخ ان کو فقط مغرب کی آندھی نے

ایک بڑا گروہ ترک موالات سے معذوری ظاہر کرتا ہے:

جاہ و زر کے رہے انگلش سے ہمیشہ طالب
عہد پیری میں بدل سکتے ہیں کیونکر قالب

کسی نے صاف کہہ دیا ہے:

یہ دال لب گنگ کبھی گل نہیں سکتی
کلو کے پٹاخے سے بلا ٹل نہیں سکتی

اگرچہ بعض کو وہم ہے کہ گورنمنٹ پریشان ہے:

تہمد اور دھوتی بہت تنگ آئے تھے پتلون سے
لیکن اب پتلون ڈھیلی ہے اسی مضمون سے

لیکن غالب کا خیال یہ ہے:

انگریز قوی بھی ہیں سر افراز بھی ہیں
تدبیر میں علم و فن میں ممتاز بھی ہیں
بابو کو نچا دیا جو چابی دے کر
اس سے یہ کھلا کہ دل لگی باز بھی ہیں

اس طرح یہ انداز بارہ صفحات تک چلا جاتا ہے۔ دوسرے حصے میں پانچ عنوانات یعنی اعتراضات، ترک موالات کی توجیہہ، بے پروائی و بے تعلقی اور ظرافت کے ماتحت مختلف اشعار پیش کر دیئے گئے ہیں جو کسی نہ کسی طرح گاندھی سے متعلق ہیں۔ یہ حصہ زیادہ طویل اور نسبتاً غیر مربوط ہے اور اکسٹھ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

ان دونوں حصوں میں بیشتر اشعار ایسے ہیں جو "کلیات اکبر" جلد چہارم مطبوعہ کتابستان الہ آباد و کراچی میں بھی چھپ چکے ہیں۔ کلیات چہارم میں ظاہر ہے کہ "گاندھی نامہ" میں شامل اشعار کے علاوہ بھی بہت سے اشعار ہیں مگر "گاندھی نامہ" میں ایسے اشعار کی تعداد بہت کم ہے جو کلیات میں نہیں ہیں۔ بہر حال "گاندھی نامہ" کو اگر ایک نظم قرار دیا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ بیسویں صدی کے ربع اول کے سیاسی انتشار کا بہت عمدہ مرقع ہے جس میں کوئی ایک نقطۂ نظر ٹھونسنے کی کوشش نہیں کی گئی بلکہ سب گروہوں کے نظریات پیش کر دیئے گئے ہیں اور نتیجہ قاری پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

اکبر اور ریبرن:

اس نام سے فرزند اکبر سید عشرت حسین نے ایک مجموعہ شائع کیا ہے جس میں فرانس کے نامور مصور ریبرن کی سات تصویریں اور ان کے متعلق اکبر کے اشعار ہیں۔ اس کے دو ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۲۷ء میں چھپا۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۴ء میں کراچی سے شائع ہوا۔ اس مجموعے کا تعارف سید عشرت حسین نے یوں کرایا ہے:

> "یہ اشعار ۱۶ اور ۱۷ مارچ 1915ء کو لکھے گئے۔ جناب والد صاحب مرحوم ہم لوگوں کو دیکھنے کو جونپور تشریف لائے ہوئے تھے.... میرے پاس طرح طرح کی کتابیں ہیں۔ ازاں جملہ جیک کے "ماسٹر پیسز ان کلر" کی کچھ جلدیں ہیں، یعنی دنیا کے بڑے بڑے مصوروں کے حالات اور ان کی آٹھ آٹھ منتخب رنگین تصویریں۔ یہ چھوٹی چھوٹی کتابیں ہیں۔ ایک دن شام کو کچہری سے واپس آیا تو والد صاحب مرحوم کے ہاتھ میں ریبرن کے متعلق کتاب دیکھی۔ میں نے کہا: "آپ تصویریں دیکھ رہے ہیں؟" فرمایا: "نہیں صرف تصویریں ہی نہیں دیکھتا بلکہ بعض بعض تصویروں کے نیچے میں نے کچھ اشعار بھی لکھ دیئے ہیں۔" (۵۸)

غرض عشرت حسین نے تصویریں اور ان پر لکھے ہوئے اشعار ایک جلد میں چھپوا دیے۔ تصویروں پر جو اشعار لکھے ہیں، وہ بہت کم ہیں۔ اکثر پر ایک شعر، دو تصویروں پر چار اور چھ اشعار ہیں۔ ان اشعار میں ربط بھی نہیں لیکن چونکہ اردو میں یہ بھی ایک جدت ہے، اس لیے اس مجموعے کا ذکر یہاں کر دیا گیا ہے۔ اشعار معمولی درجے کے ہیں۔ اگر تصویریں سامنے ہوں تو بھی ایک بات ہے۔ تصویروں کے بغیر ان کی مثال پیش کرنا بالکل لا حاصل ہے۔

نظم غیر مقفیٰ :

اکبر نے نظم غیر مقفیٰ میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اگرچہ اکبر اس فن کے اردو میں بانی نہیں ہیں، تاہم ان کی غیر مقفیٰ نظمیں جس زمانے میں لکھی گئی ہیں، اس وقت بے قافیہ نظم لکھنے کو بدعت تصور کیا جاتا تھا اور محض گنتی کے چند نمونے اس طرز پر تخلیق ہوئے تھے۔ یوں اکبر کی غیر مقفی نظموں کی ایک اہم تاریخی حیثیت ہے جسے نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

سب سے پہلے غیر مقفیٰ نظم کا تجربہ اردو میں محمد حسین آزاد نے کیا۔ نظم آزاد کا پہلا تجربہ عبدالحلیم شرر نے کیا اور "نظم غیر مقفیٰ" کے عنوان سے ایک منظوم ڈراما مئی ۱۹۰۰ء کے "دلگداز" میں شائع کیا۔ شرر کا یہ ڈراما آج کی اصطلاح میں آزاد نظم ہے۔ (۵۹) اسی طرح اسمٰعیل میرٹھی کی دو بے قافیہ نظمیں یعنی "تاروں بھری رات" اور "چڑیا کے بچے" کلیات اسمٰعیل میں شامل ہیں۔ (۶۰) یہ کلام اسمٰعیل کے آخری چند برسوں کا ہے۔ اسی زمانے میں اکبر الہ آبادی نے بھی بے قافیہ نظمیں لکھیں۔ اکبر کے شرر سے تعلقات بھی تھے جس کا ثبوت ان غیر مطبوعہ خطوط سے ملتا ہے جو شرر نے اکبر کو لکھے ہیں اور نیشنل میوزیم کراچی میں محفوظ ہیں۔ شرر نے "دلگداز" میں نئی ہیئتوں کے حق میں ایک مہم شروع کر رکھی تھی۔ (۶۱) اکبر کی نظر سے یہ خیالات گزرتے رہتے ہوں گے۔ چنانچہ انہوں نے بھی بے قافیہ نظمیں لکھنے کی طرف توجہ کی۔ ان کے کلیات کے حصہ دوم اور سوم میں بلینک ورس کے چار نمونے موجود ہیں۔ چونکہ "کلیات سوم" میں تقریباً ۱۹۱۲ء تک کا کلام شامل ہے اس لیے بلینک ورس لکھنے کی ابتدا ۱۹۱۲ء سے قبل کر چکے تھے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب اسمٰعیل میرٹھی نے اس طرح کی نظمیں لکھیں، اس لیے اکبر اس سلسلے میں اگر اولیت کا مقام پانے کے مستحق نہ بھی ہوں جب بھی وہ نظم غیر مقفی کے اولین لکھنے والوں میں یقیناً شامل ہیں۔ ان کی چار غیر مقفی نظموں میں سے جو نظم نسبتاً اہم ہے، وہ بطور نمونہ پیش ہے :

چلا جاتا تھا اک ننھا سا کیڑا رات کاغذ پر
بلا قصد ضرر اس کو ہٹایا میں نے انگلی سے
مگر وہ ایسا نازک تھا کہ فوراً پس گیا بالکل
نہایت ہی خفیف اک داغ کاغذ پر رہا اس کا

ابھی وہ روشنی میں شمع کی کاغذ پہ پھرتا تھا
ابھی یوں مٹ گیا اک جنبش انگشت انساں سے
لیا میرے سوا نوٹس ہی کس نے اس کا دنیا میں
نہ تھی فطرت کی کیا کاری گری اس کے بنانے میں
نسب نامہ بھی اس کا عالم ذرات میں ہو گا
یہی تھی اس کی ہستی اور اسی میں اس کی مستی تھی
نہ ماتم کرنے والا ہے، نہ لائف لکھنے والا ہے
وہ دھبا درس عبرت دے رہا ہے مجھ کو اے اکبر
معاذ اللہ! کیا سمجھا ہے تونے اپنی وقعت کو
تجھے بھی صفحہ روئے زمیں سے ایک دن آخر
مٹا دے گی کوئی تحریک فطرت حکم باری سے
عجب حیرت سے میں ہوں دیکھتا اس داغ کاغذ کو
مری نظروں میں تو نقشہ یہ ہے دنیائے فانی کا
صریحاً جسم تھا، اک جان تھی، احساس تھا اس میں
اور اب دھبا سا ہے، کیا جانے کوئی کیسا دھبا ہے
عجب کیا ہے جو سمجھے کوئی پنسل کی لکیر اس کو
معاذ اللہ! معاذ اللہ! سناٹے کا عالم ہے
بہت جی چاہتا ہے روؤں اس ہستی کے دھبے پر
یہ ہیں برسات کے دن، تیسری بھادوں گزرتی ہے
میں اپنا غم غلط کرتا ہوں کچھ اشعار لکھنے سے

آزاد و اسمٰعیل میرٹھی کی بے قافیہ نظموں سے یہ نظم بہتر ہے۔ اس میں ایک متصوفانہ موضوع ہے جو نہایت آسان لفظوں میں بیان کر دیا گیا ہے، تاہم اس میں آمد اور اثر ہے۔ اس ہیئت میں جتنی نظمیں اس دور میں لکھی گئی ہیں، ان میں یہ نظم سب سے بہتر ہے۔ اس میں قافیے ترک کیے گئے ہیں لیکن خیالات کے ارتقا کا ہر مصرعے میں التزام کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ قافیوں کی کمی محسوس بھی نہیں ہوتی۔

اصناف کے اس جائزے سے اکبر کی شاعری کے بارے میں جو باتیں معلوم ہوئی ہیں وہ یہ ہیں :

اکبر محض طنز و ظرافت کے شاعر نہیں ہیں۔ انہوں نے فقط فردیات اور قطعات ہی تخلیق نہیں کئے بلکہ انہوں نے اتنی مختلف اصناف میں اپنا کلام چھوڑا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے اردو کے بہت کم شاعر ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ میر' سودا' نظیر وغیرہ کے بعد اصناف کا جتنا تنوع اکبر کے ہاں نظر آتا ہے' اتنا کسی اور شاعر کے ہاں موجود نہیں۔ غزل' قطعہ' رباعی اور مثنوی میں اکبر نے جتنا عمدہ کلام چھوڑا ہے' وہ دور جدید کے کسی اور شاعر کے ہاں موجود نہیں۔ اقبال نے بھی بہت سی اصناف میں لکھا ہے اور بڑے کامیاب تجربے کیے ہیں مگر اکبر کو غزل' رباعی اور مثنوی میں ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ اقبال کی غزلیات میں ایک وسیع دنیا نظر آتی ہے مگر اکبر نے ان سے پہلے غزل کی روایتی صنف میں جتنے انقلابی تجربے کیے' وہ اپنی تمام تر وسعت اور گہرائی کے باوجود اقبال کو حاصل نہ ہو سکے۔ اکبر کے قطعات میں جو ربط و تسلسل نظر آتا ہے' اس نے اقبال کو متاثر کیا ہے۔ "ضرب کلیم" کی بیشتر نظمیں قطعات کی صورت میں ہیں۔ گو بڑی کامیاب ہیں تاہم انہیں اولیت کا شرف حاصل نہیں ہے کیونکہ انہی موضوعات پر اکبر نے نصف صدی پیشتر لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اقبال کے ہاں جو ڈرامائی نظمیں ملتی ہیں' ان کا آغاز بھی اکبر ہی نے کیا تھا۔ اقبال نے اس صنف میں قابل قدر اضافے کیے مگر تاریخی اہمیت اکبر کی نظموں کو حاصل ہے۔ اکبر ہیئت کے تجربات کو قبول کرنے میں اتنے آگے نکل گئے کہ انہوں نے ایک ہی نظم میں مختلف بحور اور اصناف کے تجربے کیے اور اس کے بعد نظم غیر مقفیٰ کو بھی اختیار کیا۔ اقبال نے ایک ہی نظم میں مختلف بحور و اصناف کے تجربات کو قبول کیا مگر وہ نظم غیر مقفیٰ کو اکبر کے بعد بھی قبول نہ کر سکے۔

جو نقاد اکبر کو قدامت پسند شاعر ثابت کرنے پر زور قلم صرف کرتے ہیں' انہوں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ کوئی قدامت پسند شخص اسالیب اور اصناف میں روایت سے بغاوت نہیں کر سکتا۔ اگر اکبر نے لگے بندھے اور فرسودہ اسالیب میں متعدد اضافے کیے اور اصناف میں نت نئے تجربات سے جھجک محسوس نہیں کی تو وہ نئے خیالات کے قبول کرنے میں کس طرح رجعت پسند ہو سکتے ہیں۔ اس کا ایک ہی صریح نتیجہ نکلتا ہے' وہ یہ ہے کہ اکبر نئے افکار' نئی تعلیم اور نئے خیالات کو قبول کرنے پر آمادہ تھے لیکن ان کی حتمی رائے تھی کہ انگریز یورپ کی اصل ترقیات اور سائنسی تعلیم سے ہمیں بے خبر رکھنے کے لیے ادھر ادھر کی فضولیات میں الجھا رہے ہیں۔

اکبر کی نظمیں بالعموم ہیئت اور موضوع کے امتزاج کے عمدہ نمونے ہیں۔ ان کی

نظمیں نظم نگاری کے جدید تصور کے عین مطابق ہیں اور ان میں خیالات کا ارتقا ملتا ہے۔ خیالات کی رو مصرع بہ مصرع چڑھتی چلی جاتی ہے۔ وہ مختلف اشعار میں ایک ہی خیال کی تکرار نہیں کرتے۔ ان کا ہر شعر خیال کے سلسلے کو آگے بڑھاتا ہے۔ بالعموم ان کی نظموں میں شعروں کی ترتیب ایسی منطقی ہوتی ہے کہ اسے تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے ہاں جزئیات اس طرح نظم کا اٹوٹ حصہ بن جاتی ہیں کہ کسی شعر کو خیالات میں کاٹ چھانٹ کیے بغیر الگ کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

بطور نظم نگار اکبر کا مقابلہ صرف دو شاعروں سے ہو سکتا ہے، وہ نظیر اور اقبال ہیں۔ نظیر کے ہاں تنوع اکبر سے زیادہ ہے مگر فن سے بڑی لاپروائی برتی گئی ہے۔ اقبال میں تنوع کم ہے لیکن فن نظم نگاری کا بڑا خیال رکھا گیا ہے۔ اکبر کے ہاں تنوع بھی موجود ہے اور فن کے مطالبات کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ ان وجوہ کی بنا پر جدید شاعری میں اکبر کو ایسا منفرد مقام حاصل ہے جو اقبال کے سوا اور کسی کے حصے میں نہیں آیا۔

حواشی

۱۔ اکبر الہ آبادی، از طالب الہ آبادی، صفحہ ۳۸۔
۲۔ علی گڑھ میگزین، اکبر نمبر، ص ۶۲۔
۳۔ غیر مدون اور غیر مطبوعہ کلام کے لیے ملاحظہ ہو ضمیمہ ۴۔
۴۔ خمخانہ جاوید، جلد اول، لالہ سری رام، طبع اول ۱۹۰۸ع، مطبع نو لکشور لاہور، صفحہ ۳۸۲۔
۵۔ گل رعنا، از عبدالحی، مطبع معارف اعظم گڑھ، بار سوم ۱۳۶۴ھ، صفحہ ۴۸۷۔
۶۔ اکبر الہ آبادی، از طالب الہ آبادی، صفحہ ۳۹۔
۷۔ تاریخ ادب اردو، از رام بابو سکسینہ، مترجمہ محمد عسکری، لکھنؤ ۱۹۵۲ع، صفحہ ۴۳۰۔
۸۔ جدید اردو شاعری، از عبدالقادر سروری، طبع سوم، لاہور ۱۹۴۵ع، صفحہ ۱۶۸۔
۹۔ مراۃ الشعرا، از یحییٰ تنہا، جلد دوم، لاہور ۱۹۵۰ع، صفحہ ۵۹۔
۱۰۔ مشاطہ سخن، از صفدر مرزا پوری، گیلانی پریس لاہور ۱۹۲۸ع، ص ۵۶۔ ۵۷۔
۱۱۔ بزم اکبر، از قمرالدین بدایونی، صفحہ ۳۲۔
۱۲۔ سخن شعراء، عبدالغفور نساخ، صفحہ ۵۴۸، طبع اول۔
۱۳۔ انتخاب وحید، مرتبہ سید علی حسنین زیبا، انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی ۱۹۳۹ع صفحہ ۱۔
۱۴۔ ایضاً، صفحہ ۷۔
۱۵۔ وحید نے وصیت نامے میں اپنا پورا نام وحید الدین محمد وحید لکھا ہے (انتخاب وحید، صفحہ ۱۔)

۱۶- اکبر الہ آبادی' از طالب' صفحہ ۴۱- ۴۲-

۱۷- انتخاب وحید' علی حسنین زیبا' صفحہ ۱۱-

۱۸- مشاطہ سخن' صفدر مرزا پوری' صفحہ ۵۷-

۱۹- اودھ اخبار' ۹ مئی ۱۸۹۲ع بحوالہ علی حسنین زیبا از انتخاب وحید' صفحہ ۱۲- ۱۳-

۲۰- سفینہ غزل' سید محمد عباس' تاج کمپنی لمیٹڈ' صفحہ ۴۰۳ (۱۹۵۸ع)-

۲۱- تاریخ ادب اردو' رام بابو سکسینہ' صفحہ ۱۹۶-

۲۲- انتخاب وحید' مرتبہ علی حسنین زیبا' صفحہ ۱۱-

۲۳- تاریخ ادب اردو' رام بابو سکسینہ' صفحہ ۲۴۳-

۲۴- خمخانہ جاوید' ج اول لالہ سری رام' صفحہ ۱۰-

۲۵- انتخاب وحید' علی حسنین زیبا' صفحہ ۱-

نوٹ: مندرجہ بالا ماخذ میں ہجری سنین درج ہیں جنہیں عیسوی میں تبدیل کیا گیا ہے (م- ز)-

۲۶- انتخاب وحید' علی حسنین زیبا' صفحہ ۱۳-

۲۷- اکبر الہ آبادی' طالب الہ آبادی' صفحہ ۳۹-

۲۸- سخن شعرا' عبدالغفور نساخ' صفحہ ۶۶-

۲۹- مشاطہ سخن' صفدر مرزا پوری' صفحہ ۵۶- ۵۷-

۳۰- یہ شعر کلیات اکبر میں اصلاح شدہ شکل میں موجود ہے-

۳۱- اکبر الہ آبادی' از طالب الہ آبادی' صفحہ ۳۶-

۳۲- رسالہ "اردو" کراچی' جنوری ۱۹۵۴ع' مضمون "اردو غزل"-

۳۳- ایضاً-

۳۴- جدید اردو شاعری' عبدالقادر سروری' صفحہ ۱۶۸- ۱۶۹-

۳۵- فرہنگ انند راج' جلد ۴' صفحہ ۳۲۵۹' نیز نوراللغات' ص ۶۷۳-

۳۶- قطعات و رباعیات' مرتبہ بھیا احسان الحق' مطبوعہ بزم اکبر کراچی (۱۹۵۲ع)

۳۷- علی گڑھ میگزین' اکبر نمبر' ص ۱۱- ۱۲-

۳۸- المعجم' مصنفہ شمس قیس رازی' اور تذکرۃ الشعراء مصنفہ دولت شاہ سمرقندی میں یہ واقعہ مختلف افراد کے نام سے منسوب ہے- بعد کے تمام مصنفین نے ان دونوں سے نقل کر کے اسے کچھ سے کچھ بنا دیا ہے-

۳۹- تنقید شعر العجم' از حافظ محمود شیرانی- صفحہ

۴۰- کاشف الحقائق' از امداد امام اثر- صفحہ

۴۱- نگار' لکھنؤ' اصناف سخن نمبر' مضمون: "اردو نظم کا تاریخی اور فنی ارتقا" از سید احتشام حسین-

۴۲- ماخذ میں یہ لفظ موجود نہیں-

۴۳- اردو زبان کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام' از مولوی عبدالحق- ص

۴۴- علی گڑھ میگزین' اکبر نمبر' انتخاب منظومات از شبیہ الحسن نونہروی-
۴۵- اکبر الہ آبادی' مصنف طالب الہ آبادی' صفحات ۷۸-۷۹-
۴۶- اردو شاعری پر ایک نظر' از کلیم الدین احمد- ج ۲ صفحہ ۸۸ نیشنل بک فاؤنڈیشن' اسلام آباد-
۴۷- بحرالفصاحت' از نجم الغنی' صفحہ ۹۲-
۴۸- اس دربار کے متعلق ولفرڈ سکاون بلنٹ نے ایک دلچسپ واقعہ اپنی ڈائری میں نقل کیا ہے- وہ لکھتے ہیں کہ دربار میں سب لوگ اپنی نشستوں پر بیٹھ چکے تھے- صرف ڈائس پر کرزن کی کرسی خالی تھی- اس پر اچانک کہیں سے ایک خونخوار کتا آ کر بیٹھ گیا جسے بڑی مشکل سے نکالا گیا-
۴۹- گنج پنہاں (اکبر الہ آبادی) مرتبہ محمد حسنین جونپوری' لاہور ۱۹۴۱ء-
۵۰- خطوط مشاہیر' مرتبہ عبدالماجد دریابادی- صفحہ تاریخ
۵۱- نیشنل میوزیم کراچی میں موجود اکبر کا قلمی خط نمبر این ایم ۱۸/ ۸۷' ۱۹۵۸ء-
۵۲- ایضاً' نمبر این ایم ۶۱/ ۸۷' ۱۹۵۸ء-
۵۳- کیا ڈھونڈو؟
۵۴- بھرتی کا اور فضول مصرع ہے-
۵۵- "گاندھی نامہ" مطبوعہ کتابستان الہ آباد-
۵۶- "اکبر نامہ" عبدالماجد دریابادی' صفحہ ۱۸۷-
۵۷- "اکبر نامہ" عبدالماجد دریابادی' صفحہ ۱۲۹-
۵۸- اکبر اور ریبرن- ص ۱-
۵۹- سوغات' کراچی (جدید نظم نمبر ۷۰۸)' صفحہ ۹۱-
۶۰- کلیات اسماعیل' مرتبہ محمد اسلم سیفی' صفحہ ۳۴۳ تا ۳۴۵-
۶۱- سوغات' کراچی' جدید نظم نمبر' مضمون از خلیل الرحمان اعظمی-

باب ششم

نثرنگاری

دنیا کی بہت سی دوسری زبانوں کی طرح اردو میں بھی کئی ایسے مصنفین پیدا ہوئے جو نظم اور نثر دونوں میدانوں میں اہم تحریریں بطور یادگار چھوڑ گئے۔ وجہی، غالب، حالی اور شبلی ایسے ہی مصنفین تھے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ اکبر کی نثر مقدار میں ان کی شاعری سے کم نہیں ہے، وہ نثرنگار کے طور پر بہت کم مشہور ہیں۔

اکبر کے نثری کاوشیں کئی اصناف پر محیط ہیں۔ ان کے خطوط کے متعدد مجموعے چھپ چکے ہیں۔ ان سے کہیں زیادہ ان کے غیر مطبوعہ خطوط اب بھی موجود ہیں۔ ان کے ہلکے پھلکے اور ادبی مضامین سے بھی اوسط درجے کی ضخامت کا ایک مجموعہ ترتیب پا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں ان کی حیثیت ایک اچھے مترجم کی بھی ہے۔ انہوں نے دو کتابیں انگریزی سے اردو میں منتقل کی ہیں۔ مزید یہ کہ انہوں نے اردو ہندی زبانوں کے نزاع پر ایک کتابچہ لکھا تھا۔ اس کے علاوہ ان کی بعض تنقیدی تحریریں بھی ہیں جو وقتاً فوقتاً مختلف مجموعوں میں دیباچوں کے طور پر چھپتی رہی ہیں۔ اس کے باوجود رام بابو سکسینہ نے لکھا ہے:

"اکبر کوئی بڑے نثار نہ تھے، لہٰذا ان کی کوئی نثر کی چیز سوائے ان کے خطوط اور "اودھ پنچ" کے مضامین کے جو پڑھنے کے قابل ہیں، موجود نہیں ہے۔"(۱)

ظاہر ہے کہ سکسینہ ان کے تراجم اور متفرق تحریروں سے واقف نہیں ہیں۔ یہی کیفیت دیگر نقادوں کی ہے۔ ذیل میں اکبر کے نثری کاموں کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

مکاتیب

اکبر کے مکاتیب کا جائزہ لینے سے قبل اردو مکاتیب کی روایت کا نہایت مختصر خاکہ پیش کیا جاتا ہے:

اردو میں سب سے پہلے ہمارے سامنے غالب(۲) کے زندۂ جاوید مکاتیب آتے ہیں جو ان

کی شخصیت کا بھرپور اظہار ہونے کے علاوہ تاریخی ماخذ کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں اور ادبی خصوصیات کا بھی ایک خزینہ ہیں۔ غالب کے بعد(۳) اردو میں خطوط نگاری کا رواج عام ہو گیا۔ سرسید احمد خاں، محمد حسین آزاد، حالی، شبلی، محسن الملک، وقار الملک، نذیر احمد وغیرہم کے خطوط نے اردو مکاتیب کے سرمائے میں بہت اضافہ کیا۔ ان تمام مکتوب نگاروں میں اکبر الہ آبادی کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ اکبر کے خطوط تعداد میں سب سے زیادہ ہیں، بلکہ بعد میں بھی شاید ہی اردو ادب کی کسی اہم شخصیت نے اتنے خطوط لکھے ہوں۔

اکبر کے بے شمار خط ضائع ہو چکے ہیں اور اس بات کا اعتراف اکثر مکتوب الیہم نے کیا ہے۔ "مکاتیب اکبر" کے ناشر محبوب علی لکھتے ہیں:

"ہمارے مکرم دوست مولانا مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی کے نام جو مراسلات مرحوم نے بھیجے تھے، ان میں سے جو محفوظ رہ سکے ان کا یہ مجموعہ ہے.... مرزا صاحب موصوف کو خدمت اکبر میں مراسم مودت پیدا کرنے کا موقع غالباً سنہ ...(۴) کے لگ بھگ ملا ہو گا اور اسی وقت سے مودت ناموں کا سلسلہ چھڑ گیا ہو گا۔ مگر افسوس کہ مرزا صاحب انہیں کماحقہ دستبرد فنا سے نہ بچا سکے۔ بلکہ جیسا خود فرماتے ہیں، ابتداء آپ کا ہاتھ بھی اس اتلاف میں شریک کار رہا: ع

آپ کی ذات سے دنیا کو یہ امید نہ تھی

یعنی آپ اور خطوط کی طرح جواب لکھ چکنے کے بعد ان ادب نواز خطوں کو بھی پھاڑ کے ردی کی ٹوکری میں ڈال دیتے تھے۔ پھر احباب کی فرمائش واصرار سے خطوں کا خیال تحفظ پیدا ہوا (خوشا نصیب)۔ ایک صندوق ان کے نام وقف ہوا۔ اس میں احباب و اعزہ کے تمام خطوط بے ترتیبی سے رکھ دیے جاتے تھے۔ کچھ دنوں بعد یہ صندوق گنجینہ زر و جواہر سے چشمک زنی کرنے لگا لیکن چشم زمانہ کو یہ بات نہ بھائی۔ ۱۹۱۴ع کی تباہ کن بارش آئی۔ مکان اور اسباب خانہ داری کے ساتھ اسے بھی برباد کر گئی۔ منہدم مکان سے جو کچھ نکالے نکل سکا اور بعد سیلاب چند سال تک کی خانہ بدوشی میں جو کچھ بچائے بچ سکا، وہ اس مجموعے میں ہدیہ نظر ہے۔"(۵)

"مکتوبات اکبر" کے مرتب مرزا سلطان احمد لکھتے ہیں:

"مجھے اس بات کا از حد افسوس ہے کہ میں حضرت اکبر کے جملہ خط محفوظ نہ

رکھ سکا- جس قدر مل سکے' وہ نذر قارئین ہیں- ممکن ہے کچھ اور بھی ہوں- خدا کرے وہ بھی مل جائیں تو اس مجموعے کے ساتھ ان کو بھی منسلک کر سکوں- سنا گیا ہے کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال بھی آرزو رکھتے ہیں کہ حضرت اکبر کے جو خطوط ان کے نام ہیں' ان کا ایک انتخاب(۶) مع مقدمہ کے شائع کیا جائے-"(۷)

خواجہ حسن نظامی' شاد اور اکبر کے مجموعہ مکاتیب کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"۱۹۱۶ء کا ایک ہی خط ہونا اور پھر ۱۹۱۸ء سے لے کر حضرت اکبر کی وفات تک کوئی خط نہ ہونا ظاہر کرتا ہے کہ مجھے حیدر آباد سے حضرت اکبر کے سب خط نہیں ملے.... کیونکہ مجھے اچھی طرح سے معلوم ہے کہ حضرت اکبر کا مہاراجہ بہادر سے وفات تک تعلق قائم رہا تھا بلکہ آخر وقت میں تعلقات زیادہ بڑھ گئے تھے-"(۸)

"رقعات اکبر" کے دیباچے میں سر عبدالقادر لکھتے ہیں:

"مجھ سے اور سید اکبر مرحوم سے برسوں خط و کتابت رہی اور ان کے بہت سے خط میں نے حفاظت سے رکھے تھے مگر اس وقت تلاش سے ان میں سے چند دستیاب ہوئے ہیں- وہ میں نے ہمایوں صاحب(۹) کے حوالے کر دیے ہیں کہ وہ انہیں اپنے مجموعے میں شامل کر لیں- اگر مجموعے کی طبع ثانی کی نوبت آئی تو میں اور خطوط بھی ڈھونڈھ رکھوں گا-(۱۰) امید کہ ہمایوں صاحب کی یہ کوشش ادبی حلقوں میں نہایت پسندیدگی کی نظر سے دیکھی جائے گی-"(۱۱)

عبدالماجد دریا بادی "خطوط مشاہیر" میں لکھتے ہیں:

"مجھے شرف نیاز ۱۹۱۲ء میں حاصل ہوا- مہینہ غالباً مارچ تھا یا شائد اپریل ہو- میں بی- اے کا امتحان دینے کے لیے لکھنؤ سے الہ آباد گیا ہوا تھا (لکھنؤ اس وقت یونیورسٹی سے محروم تھا اور ڈگری کے امتحانوں کے لیے الہ آباد جانا ہوتا تھا)- وہیں حضرت اکبر کی خدمت میں پہلی بار حاضری دی- مرحوم کا سن ۶۶ سال کا تھا- شہرت کا آفتاب عروج کو پہنچا ہوا تھا اور میں اپنی عمر کے بیسویں سال میں- سلسلہ مراسلت ایک سال بعد ۱۹۱۳ء سے شروع ہوا اور آخر سال تک برابر قائم رہا- کچھ خطوط ضائع بھی ہوئے ہوں گے- تقریباً دو سو محفوظ رہ گئے-"(۱۲)

خواجہ حسن نظامی نے لکھا ہے:

"ان (اکبری خطوط) کا مجموعہ علیحدہ اور مستقل کتاب کی حیثیت میں شائع ہو گا' کیونکہ جناب ممدوح کے تقریباً پانچ سو خطوط میرے پاس جمع ہیں جن میں ہر خط "کلیات اکبر" کی ایک نظم کا ہم پلہ ہے۔"(۱۳)

مگر ان میں سے بہت کم خطوط "اتالیق خطوط نویسی" اور "خطوط اکبر" میں شائع ہوئے۔ اسی طرح علامہ اقبال کے نام اکبر کے جو خطوط تھے ان میں چند ایک ہی علامہ اقبال کی مرتبہ ایک نصابی کتاب (۱۴) میں جگہ پا سکے۔

اس تمام تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ اکبر کے سبھی مکتوب الیہم نے ان کے خطوط کو شروع شروع میں سنبھال کر نہ رکھا۔ بعد میں بھی تمام خطوط محفوظ نہ رہ سکے۔ کچھ لوگوں نے خطوط سنبھال کر رکھے مگر ان کی اشاعت کی نوبت نہ آسکی۔ ان شواہد کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ اکبر کے جو مکاتیب مختلف وجوہ کی بنا پر ضائع ہو گئے ہیں وہ تعداد میں مطبوعہ خطوط سے کم نہیں ہوں گے۔

اکبر کے مطبوعہ مکاتیب کی تفصیل یہ ہے:

"مکتوبات اکبر" ان کے خطوط کا پہلا مجموعہ ہے جو شائع ہوا۔(۱۵) یہ مجموعہ مرزا سلطان احمد نے شائع کیا اور مرغوب ایجنسی لاہور سے طبع ہوا۔ سنہ اشاعت موجود نہیں ہے لیکن دیباچے کے ایک جملے سے شبہ ہوتا ہے کہ وفات اکبر کے فوراً ہی بعد شائع ہوا ہو گا۔ اس لحاظ سے ۱۹۲۱ء کے آخر یا ۱۹۲۲ء کے اوائل میں طبع ہوا۔ اس میں جو خطوط چھپے ہیں وہ ۲ دسمبر ۱۹۰۵ء سے شروع ہوتے ہیں۔ آخری خط ۲۴ جنوری ۱۹۲۱ء کا ہے۔ ان سب خطوط کے مخاطب مرزا سلطان احمد ہیں۔ "مکاتیب اکبر" کے نام سے دو مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ ایک مجموعہ "مکاتیب اکبر" کے نام سے ۱۹۲۲ء میں دائرۂ ادبیہ لکھنؤ نے شائع کیا۔ یہ مکاتیب لکھنؤ کے مشہور شاعر مرزا ہادی عزیز لکھنوی کے نام لکھے گئے ہیں۔ یہ سلسلہ مکاتیب ۱۹۰۹ء سے شروع ہوا ہے اور ۲۸ اگست ۱۹۲۱ء تک جاری رہا ہے۔ "مکاتیب اکبر" کے نام سے دوسرا مجموعہ عبدالماجد دریابادی نے ۱۹۲۳ء میں اقبال پرنٹنگ ورکس دہلی سے شائع کیا ہے۔ اسے مرتب نے "مکاتیب اکبر حصہ دوم" کا نام دیا ہے۔ اس میں پہلا خط ۱۹۱۳ء کا لکھا ہوا ہے جبکہ آخری خط مورخہ ۲۲ جولائی ۱۹۲۱ء ہے۔

عبدالماجد دریابادی نے ۱۹۴۴ء میں خطوط کا ایک اور مجموعہ شایع کیا جس میں شبلی' اکبر اور محمد علی جوہر کے خطوط ہیں۔ اس مجموعے کو انہوں نے "خطوط مشاہیر" کا نام دیا ہے۔ اس کے ناشر تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور ہیں۔ اس میں اکبر کے بیشتر خطوط وہی ہیں جو اس

سے پہلے "مکاتیب اکبر" مرتبہ عبدالماجد دریابادی میں چھپ چکے ہیں۔

"رقعات اکبر" کے نام سے ایک اور مجموعہ مکاتیب محمد نصیر ہمایوں نے مرتب کر کے قومی کتب خانہ لاہور سے شایع کیا ہے۔ طبع اول پر سنہ اشاعت درج نہیں۔ مگر تحسین سروری لکھتے ہیں:

"رقعات اکبر" کا وہ مجموعہ بھی میں نے دیکھا ہے جو محمد نصیر ہمایوں کی ترتیب اور سر شیخ عبدالقادر کی تمہید کے ساتھ لاہور سے شایع ہوا تھا۔ اس پر سنہ طباعت نہیں ہے لیکن میرا خیال ہے کہ یہ ۱۹۲۹ع میں چھپا تھا۔"(۱۶)

اس مجموعے کے خطوط مختلف لوگوں کے نام ہیں۔ مکتوب الیہم کے اسما ہیں :(۱) سید سلیمان ندوی (۲) حبیب الرحمٰن خان شروانی (۳) سید افتخار حسین (۴) مہاراجہ کشن پرشاد شاد (۵) منشی شرف الدین اور (۶) سر شیخ عبدالقادر۔

خواجہ حسن نظامی نے اکبر کے مکاتیب کے دو مجموعے ترتیب دیے۔ ان مجموعوں سے قبل انہوں نے "اتالیق خطوط نویسی" نامی کتاب میں لکھا تھا:

"حضرت اکبر الہ آبادی کے چند خطوط محض نمونہ ادب کے خیال سے اس مجموعے میں شامل کر دیے گئے ہیں ورنہ ان کا مجموعہ علیحدہ اور مستقل کتاب کی حیثیت میں شایع ہو گا۔"(۱۷)

نومبر ۱۹۲۹ع میں "اتالیق خطوط نویسی" کا جو ایڈیشن شایع ہوا ہے اس کے حاشیئے میں محولہ بالا اقتباس کے بعد یہ الفاظ لکھے گئے ہیں :"شائع ہو گیا۔"

یہ مجموعہ مکاتیب جس کے متعلق مندرجہ بالا سطور میں اطلاع دی گئی ہے، "خطوط اکبر" کے نام سے حسن نظامی نے مرتب کر کے شایع کیا ہے۔ اس میں اڑھائی سو خطوط شامل کیے گئے ہیں۔ حالانکہ "اتالیق خطوط نویسی" میں انہوں نے دعویٰ کیا تھا کہ میرے پاس ایک ہزار خطوط موجود ہیں۔(۱۸)

حسن نظامی نے ۱۹۵۱ع میں اکبر کے خطوط کا ایک اور مختصر مجموعہ شایع کیا جسے طویل عنوان دیا گیا یعنی "حضرت اکبر حسین اور مہاراجہ کشن پرشاد کی خط و کتابت"۔ یہ مجموعہ محبوب المطابع دہلی میں چھپا۔ اس میں مہاراجہ کشن پرشاد کے نام اکبر کے پچیس خطوط ہیں اور مہاراجہ کے نو خطوط اکبر کے نام۔ تحسین سروری نے "نگار" کراچی کے اکبر نمبر میں اکبر کے پچیس خطوط بنام مہاراجہ کشن پرشاد شائع کیے ہیں (۱۹) مگر اس میں تین خطوط کے سوا باقی خطوط وہی ہیں جو حسن نظامی کے مرتبہ مجموعے میں موجود ہیں۔

ان مجموعوں کے علاوہ اکبر کے متفرق خطوط بھی کئی جگہ شایع ہوئے ہیں۔ "اتالیق خطوط نویسی" مرتبہ خواجہ حسن نظامی تین حصوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے دوسرے حصے کو "نامی مسلمانوں کے خطوط" کا عنوان دیا گیا ہے۔ اس میں اقبال، شبلی، ابوالکلام آزاد اور اکبر الہ آبادی کے مکاتیب شامل کیے گئے ہیں۔ اکبر کے خطوط تعداد میں نو ہیں۔(۲۰)

"علی گڑھ میگزین" کے اکبر نمبر میں مختارالدین احمد نے اکبر کے چھتیس غیر مطبوعہ خطوط مفید حواشی کے ساتھ مرتب کر کے چھپوائے ہیں۔ یہ خطوط احسن مارہروی، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خاں، سر عبدالقادر، محشر لکھنوی، سید محمود، نیاز فتح پوری، نورالحسن نیر اور ملا واحدی کے نام ہیں۔

"نقوش" لاہور نے مشاہیر ادب کے خطوط کے دو نمبر شایع کیے ہیں۔ پہلے کا نام "مکاتیب نمبر" اور دوسرے کا نام "مکتوبات نمبر" ہے۔ ان دونوں نمبروں میں اکبر کے انیس غیر مطبوعہ خطوط شامل ہیں۔ سولہ خط "مکاتیب نمبر"(۲۱) میں ہیں اور تین خطوط "مکتوبات نمبر" میں (۲۲)۔ ان خطوط کے مکتوب الیہم مولوی بشیرالدین ایڈیٹر "البشیر" محمد دین فوق اور آرزو لکھنوی وغیرہ ہیں۔

رسالہ "نظام المشائخ" کراچی (۲۳) کے ایک شمارے میں خان بہادر نقی محمد خاں کے نام اکبر کے گیارہ مکاتیب شایع ہوئے ہیں۔ ان میں سے آخری خط ۱۲ اگست ۱۹۲۱ع کا لکھا ہوا ہے۔

ان کے علاوہ اکبر کے اکا دکا خطوط "مخزن"، "اردو"، "ہمدم"، "پیسہ اخبار"، "زمیندار" وغیرہ میں بھی کبھی کبھار شایع ہو جاتے تھے مگر عموماً چند سطروں پر مشتمل ہوتے تھے۔ حال ہی میں "قومی زبان" کراچی میں اکبر کے چند مکاتیب شایع ہوئے ہیں۔(۲۴) اس سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اکبر کے مکاتیب اتنے زیادہ ہیں کہ ان کا شمار دشوار ہے۔

مندرجہ بالا تفصیل اکبر کے مطبوعہ مکاتیب کی تھی مگر اکبر کے غیر مطبوعہ رقعات بھی تعداد میں ان سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ نیشنل میوزیم کراچی میں مکاتیب اکبر کا جو ذخیرہ ہے، وہ تعداد اور اہمیت ہر دو اعتبار سے مطبوعہ خطوط سے بڑھ کر ہے۔ یہ خطوط اکبر کے پوتے سید محمد مسلم رضوی کے پاس موجود تھے۔ اب نیشنل میوزیم کراچی میں محفوظ ہیں۔ ان کے علاوہ مسلم رضوی کے پاس ابھی کچھ اور خطوط بھی موجود ہیں۔ ان غیر مطبوعہ خطوط کی کچھ تفصیل ذیل میں پیش کی جاتی ہے :

ان میں سے بیشتر خطوط عشرت حسین کے نام ہیں۔ چند ایک خطوط عشرت کے فرزند

سید محمد عقیل اور عشرت کی بیگم وغیرہ کے نام بھی لکھے گئے ہیں۔ ان مکاتیب کی کل تعداد انیس سو اکتالیس ہے۔ تقریباً آدھے پوسٹ کارڈ ہیں جن میں سے بعض تو محض ایک دو سطری ہیں مگر بعض خطوط خاصے طویل ہیں جو دل لگا کر لکھے گئے ہیں اور چار صفحات سے دس صفحات تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں انگریزی زبان میں لکھے ہوئے خطوط کی تعداد تقریباً سوا دو سو ہے۔ اکبر اپنے فرزند سید عشرت حسین کو انگریزی میں اس لیے خط لکھتے تھے کہ اسے اس زبان میں مہارت حاصل ہو جائے۔ اکبر کی انگریزی اس لحاظ سے یقیناً قابل تعریف ہے کہ انہوں نے یہ قطعی طور پر ذاتی کوشش سے سیکھی مگر اسے بہت اچھی انگریزی قرار دینا مشکل ہے۔

مکاتیب کا یہ ذخیرہ کئی اسباب کی بنا پر بے حد اہم ہے۔ ان خطوط کا آغاز ۱۸۹۵ء سے ہوتا ہے حالانکہ اکبر کے مطبوعہ مکاتیب (سوائے دو تین خطوط کے) ۱۹۰۵ء سے قبل کے نہیں ہیں۔ اس سبب سے ان کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔

یہ خطوط ان کے فرزند کے نام ہیں اس لئے ان میں بہت سی ایسی باتیں لکھی گئی ہیں جو دوستوں کے خطوں میں بھی نہیں ہو سکتیں۔ سید عشرت حسین کو جو خطوط ان کے قیام انگلستان کے دوران میں لکھے گئے ہیں ان سے اکبر کی تمام قلبی اور ذہنی کیفیتیں آشکار ہوتی ہیں۔ ان خطوں میں اکبر کی ملازمتوں، تبادلوں اور مختلف لوگوں سے ملاقاتوں کے حالات موجود ہیں۔ اس لحاظ سے یہ اکبر کی سوانح کے لیے نیا مواد فراہم کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں گھریلو جھگڑے اور اختلافات خصوصاً پہلی بیوی سے جو بیٹے ہوئے ان کے ساتھ تنازعوں کا ذکر اور اس قسم کے دوسرے خاندانی حالات ان میں موجود ہیں۔

ان خطوط میں اپنی شاعری پر بھی اکثر جگہ اظہار خیال کیا ہے۔ بعض نظموں میں وضاحتیں ہیں، بعض فنی نکات بیان کیے گئے ہیں اور اکثر جگہ اپنا تازہ کلام دیا گیا ہے۔ اس سے ان کے کلام کو زمانی ترتیب دینے میں محققین کے لیے آسانیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔

غرض غیر مطبوعہ خطوط کا یہ نایاب اور عظیم ذخیرہ یقیناً اس قابل ہے کہ کوئی ادارہ اس کے ایک ایک خط کو شائع کرنے کا منصوبہ بنائے اور اس طرح اس عظیم شاعر کے ان مکاتیب کو تلف ہونے سے بچا لے۔(۲۵)

مکاتیب اکبر کی اہمیت کیا ہے؟ اس سوال کا جواب دینے سے قبل مکاتیب کے فن کے بارے میں نہایت اختصار کے ساتھ چند باتیں درج کی جائیں گی اور ان کی بنیاد پر اکبر کے خطوں کی اہمیت و حیثیت کا تعین کیا جائے گا۔

خط و کتابت کا شوق دنیا کے انسانوں کو قدیم زمانے سے ہے۔ اس کی ابتدا غالباً محض ضرورتاً" ہوئی ہو گی۔ یعنی کوئی نہایت ضروری بات کسی تک پہنچانی ہوئی اور مکتوب نگار کسی وجہ سے خود جانے سے قاصر ہوا تو اس نے لکھ کر یا لکھوا کر کوئی پیغام بھجوا دیا۔ لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ خط نگاری رسم الخط کی ایجاد کے بعد ہی ممکن ہو سکتی ہے۔ اس لیے امکان یہ ہے کہ مصر میں اس کا آغاز ہوا ہو گا۔ یہ بات بھی عیاں ہے کہ خط لکھنے اور پہنچانے کے لیے ہفت خواں طے کرنے پڑتے ہوں گے۔ سیاہی اور کاغذ (یا کسی موزوں متبادل چیز) کی فراہمی کا مسئلہ' اس کے بعد قابل اعتماد نامہ بر کا مسئلہ (کیونکہ شروع میں بادشاہوں کے خفیہ پیغامات کے لیے خطوط استعمال ہوتے ہوں گے) اور پھر ان سے زیادہ راستوں کی دشواریاں' سفر کی دقتیں وغیرہ وغیرہ۔ بہرحال دنیا کی تمدنی ترقی کے ساتھ ساتھ یہ دقتیں آہستہ آہستہ دور ہوتی گئیں اور خط نہایت کثیر تعداد میں لکھے جانے لگے۔

عالم اسلام میں خط نگاری کی روایت اتنی ہی پرانی ہے جتنا کہ خود اسلام۔ مختلف بادشاہوں کے نام رسولؐ خدا کے تبلیغی خطوط مشہور عالم ہیں۔ حضرت ابوبکر کے خطوط عمال کے نام مشہور ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں ابوالفضل کے خطوں کا ایک خاص' دقیق اور پر شکوہ انداز ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر کے خطوط اس کے انتظام سلطنت اور مزاج پر روشنی ڈالتے ہیں۔

اردو میں رجب علی بیگ سرور' غالب' سرسید' حالی' شبلی اور واجد علی اختر وغیرہ اکبر سے پہلے مکتوب نگاری کو فن کاری کا درجہ دے چکے تھے۔ خطوط میں انشا پردازی سے لے کر لطیف جذبات کی عکاسی تک بہت کچھ شامل ہو چکا تھا۔ اکبر الہ آبادی نے خطوط نویسی کبھی بحیثیت فن اختیار نہیں کی۔ ان کے خطوط خالصتاً نجی ہیں۔ بیشتر افراد کنبہ کے نام لکھے گئے ہیں' کچھ دوستوں کے نام ہیں اور چند ایک مشہور ادبی شخصیتوں کو لکھے گئے ہیں لیکن یہ شخصیتیں بھی وہ ہیں جنہیں وہ ذاتی طور پر جانتے تھے' انہیں بے تکلف دوستوں میں نہ سہی' تاہم عام دوستوں میں شمار کیا جانا چاہیے۔ اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ انہوں نے خطوط اشاعت کے لیے نہیں لکھے۔

سب سے پہلے ایک صاحب شرف الدین رامپوری کو اکبر کے مکاتیب کی اشاعت کا خیال آیا۔ انہوں نے اکبر کو اجازت کے لیے لکھا اور ان کے مکتوب الیہم سے مکاتیب کی فراہمی کے لیے سلسلہ جنبانی شروع کی۔

اکبر کا رد عمل بھی وہی تھا جو غالب کا تھا۔(۲۶) لکھتے ہیں :

"شرف الدین احمد خاں صاحب مجھ کو بھی برابر لکھ رہے ہیں کہ آپ کے مزاج اور شان کے خلاف کوئی امر نہ ہو گا- میں نے لکھا: برادر! شان و مزاج کی بات نہیں- سوشل مصلحت' پولیٹکل نزاکت' لٹریری صحت—— ان باتوں کا خیال ہے- پرائیویٹ تحریر میں زیادہ خیال نہیں رہتا- میں نہیں سمجھا کہ خطوط کے چھپنے سے کیا فائدہ؟ میں اہل زبان تو ہوں نہیں اور اس وقت زبان خود معرض تغیر میں ہے-"(۲۷)

"پرائیویٹ خطوں کے لکھنے میں یہ خیال نہیں رہتا کہ پبلک کے سامنے پیش ہوں گے- اس نازک زمانے میں اندیشہ ہوتا ہے کہ شاید کوئی بات کسی کو ناپسند ہو- اشاعت کرنے والے کو اس کا خیال نہ ہو- رامپور کے ایک عنایت فرما مدت سے اس فکر میں ہیں- بڑے بڑے لوگوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا آپ کے خط دے دوں؟ میں نے یہی شبہ ظاہر کیا-"(۲۸)

"وقت پر آشوب ہے- بدگمانیوں کا زور ہے- خطوط اس خیال سے کبھی نہیں لکھے گئے تھے کہ وہ شائع ہوں گے- مجھ سے اکثر صاحبوں نے اجازت چاہی لیکن میں نے تامل کیا- پرائیویٹ خطوط کو جب تک دیکھ نہ لوں' اجازت طبع کیوں کر دے سکتا ہوں-"(۲۹)

یہ خطوط اکبر کے آخری چند برسوں کے ہیں- اس وقت تک انہیں خطوط کی اشاعت کا خیال نہیں آیا تھا- اس کے بعد ان کی صحت نے بالکل جواب دے دیا- وہ اس قابل ہی نہ رہے کہ دل لگا کر خط لکھ سکیں- ان کے خطوط سال بہ سال مختصر ہوتے گئے اور بالاخر چند سطروں تک محدود ہو کر رہ گئے- اس وجہ سے یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ ان کے خطوط کبھی اشاعت کے خیال کو مدنظر رکھ کر نہیں لکھے گئے- اس رائے کو مزید تقویت اس بات سے پہنچتی ہے کہ اکبر کے مکاتیب میں کاغذ اور روشنائی کے استعمال سے لے کر انداز تحریر تک بڑی لاپروائی ملتی ہے- مختار الدین احمد نے لکھا ہے:

"اکبر کے جتنے خطوط ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے نظر سے گزرے' ان میں یہ بات دیکھنے میں آئی کہ خط نویسی کے متعلقات سے ان کی دلچسپی صفر کی حد تک ہے- خطوں کے لکھنے کا کوئی مخصوص انداز نہیں ہے بلکہ جو کاغذ بھی ہاتھ آ گیا اسی پر اٹھا کر خط لکھ دیا- کبھی کبھی تو ردی پر خط لکھ دیا کرتے تھے....(۳۰) بعض خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر وہ نیزے کے قلم سے لکھے گئے ہیں تو وہ

معلوم نہیں کب کے بنے ہوئے ہیں اور خط اگر لوہے کی نب سے لکھا گیا ہے تو
نب کے بدلنے کے اہتمام کا فقدان ہے اور روشنائی ان سارے خطوں کی سیاہ
ہے لیکن نظم و ضبط یہاں بھی مفقود ہے۔ کوئی نہایت پھیکی ہے، کوئی اس قدر
گاڑھی کہ اکبر کا قلم رک رک کر چلا ہے۔"(۳۱)

یہ کسی ایسے مکتوب نگار ہی کا رویہ ہو سکتا ہے جسے مکتوبات کی اشاعت سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ خط نگاری کے فن پر لکھنے والے اکثر نقادوں کا خیال ہے کہ اشاعت کے خیال سے لکھے ہوئے مکاتیب میں وہ خصائص نہیں آسکتے جو کسی بھی اچھے خط کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ ٹیلر نے لکھا ہے:

"A good letter is one written without a thought of Publication, as soon as the vision of general public or of the circle of waiting critics rises to from a background to ones corresspondence, simplicity and ease must vanish."(32)

سادگی اور بے ساختگی مکاتیب اکبر کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ یہ خطوط نہ تو دل لگا کر لکھے گئے ہیں نہ ہی اشاعت کا خیال اکبر کے ذہن کے کسی کونے میں موجود تھا اس لیے وہ جو کچھ لکھنا چاہتے تھے لکھ ڈالتے تھے۔ اور اگر ان میں کسی ذہنی تحفظ کو دخل تھا تو محض اس قدر کہ اکبر کی تربیت ایک خاص فضا اور ماحول میں ہوئی تھی۔ اسے سادہ لفظوں میں قدیم تہذیبی ماحول کہا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس قدیم شائستہ ماحول کا خاصہ یہ تھا کہ اگر کسی کے خلاف کچھ لکھا جاتا تو ایسے شائستہ لہجے میں کہ اسے برا معلوم نہ ہو۔ اس لہجے سے گزر کر دیکھیے تو اکبر کے خطوط کی بے ساختگی متوجہ کیے بغیر نہ رہے گی، بلکہ اکثر اوقات خطوط کا ظاہری لب و لہجہ ان کے اشعار سے بہت حد تک الگ تھلگ نظر آتا ہے۔ ان کے کلام میں لفظی تناسبات اور مصرعوں کی ساخت کا خاص خیال رکھا گیا۔ موضوعات میں نفرت و حقارت تو نہیں، تاہم ایک شدت ضرور نظر آتی ہے۔ نئی تہذیب کے افراد کو بعض اوقات سخت سست کہہ گزرتے ہیں مگر خطوط میں اکبر کی جو شخصیت ہمیں دکھائی دیتی ہے وہ ایک مرنجاں مرنج صفت، دنیا بیزار اور متلاشی مرگ شخص کی ہے۔ انہیں کسی پر غصہ آتا بھی ہے تو دوسرے ہی لمحے کوئی توجیہ کر کے اسے تھوک دیتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ

ہے کہ جتنے خطوط ہمیں مل سکے ہیں' وہ ان کی زندگی کے آخری چند برسوں کے ہیں' جب زیست کی آگ مدھم پڑ چکی تھی اور بجھنے کے قریب تھی' اس لیے ہمیں متعجب نہیں ہونا چاہیے کہ مکاتیب کا اکبر طنز نگار اکبر سے مکمل طور پر ہم آہنگ نہیں ہے۔

اکبر کے خطوط سے چند ایسے جملے درج ذیل ہیں جو ان کی زندگی سے بیزاری' تمنائے مرگ اور شدائد برداری کے رجحانات کے آئینہ دار ہیں:

"زندگی ہے (جس کا میں زیادہ شائق نہیں ہوں) تو کبھی ملنا ہو گا۔"(۳۳)

"توانائی نہیں ہے۔ احباب کا شدید تقاضا مجبور کرتا ہے ورنہ چاہتا ہوں کہ مفقود الخبر رہوں۔"(۳۴)

"اگرچہ میں مشتاق زندگی نہیں رہا لیکن تکلیف سے بہرحال پناہ مانگتا ہوں"(۳۵)

تبخیر بہت ہوتی ہے۔ ضعف ہے' دل مایوس ہے کچھ مدد نہیں ملتی۔ ایک قدرتی مشین ہے چلی جاتی ہے۔

اب میری زندگی میں نہیں نور انبساط
یہ شمع جل رہی ہے مگر ہے بجھی ہوئی"(۳۶)

" میری طبیعت کا حال آپ کیا پوچھتے ہیں۔ عمر ۷۵' آلام ایسے' عوارض کا یہ حال کہ ۱۸ گھنٹے باوقات مختلف تکلیف دہ احساس بوجہ ضعف اعصاب کے ہوا کرتا ہے اور سمجھتا ہوں کہ نزع قریب ہے۔"(۳۷)

"سوسائٹی کا تعلق خواہ مخواہ مجبور کرتا ہے۔ اگر تندرست ہوتا تو جنگلوں اور پہاڑوں میں بھاگ جاتا۔"(۳۸)

"ہر روز پانچ دس مرتبہ ایک شعلہ حسرت سینے میں مشتعل ہو کر دل کو جلاتا اور مجھ کو تڑپاتا ہے۔ خودکشی ناجائز اور زندگانی بے حلاوت۔"(۳۹)

"آپ خیریت پوچھتے ہیں' اتنا نہیں کہ اپنے مصائب و ترددات بیان کروں' آپ سے مدد لوں۔ پاؤں کے نیچے آگ ہے اور آگے اندھیرا۔ کھڑا رہوں تو پاؤں جلتا ہے' آگے بڑھوں تو معلوم نہیں کہاں جا پڑوں؟"(۴۰)

"ناتوانی اور افسردگی کی حد نہیں' صرف فردائے آخرت پیش نظر ہے۔

دیکھ کر حضرت اکبر کو خدا یاد آیا
یہ مصائب کا ہجوم ایسے کمالات کے ساتھ" (۴۱)

"دل یہی چاہتا ہے کہ پاشکستہ، چشم بستہ بیٹھ رہوں، سانس سے مجبوری ہے۔" (۴۲)

"مزاج پرسی کا ممنون ہوں، اپنا حال کیا لکھوں :

میں تو سمجھتا ہوں کہ بس اب مرا
لوگ یہ کہتے ہیں ابھی دیر ہے" (۴۳)

"خدا آپ کو تندرست کر دے۔ بہت سی امیدیں آپ سے وابستہ ہیں۔ میں تو رات دن ہر گھنٹے پر پانچ سات منٹ تکلیف میں مبتلا رہتا ہوں۔" (۴۴)

"طبیعت روز بروز زندگی کی طرف سے بے تعلق ہوتی جاتی ہے۔ ہر روز دو چار گھنٹے امید زندگی فردا سے الگ ہو جاتا ہوں۔" (۴۵)

"خانہ ویرانی، بے سامانی، بے کسی، الاقارب کالعقارب۔ اس پر امراض لاحقہ ایسے کہ قریباً حالت نزع میں ہوں۔ ضعف کی حد نہیں عمراتنی ہو چکی کہ ہر نفس کو آخر سمجھتا ہوں۔" (۴۶)

یہ تمام بیزاری، افسردگی اور پریشانی نتیجہ ہے ان بے شمار امراض مستقل و اتفاقیہ کا جو اکبر کو اکثر لاحق رہتی تھیں۔ ان کے مکاتیب کے تمام مجموعوں سے اگر ان کے تمام امراض کی ایک فہرست بنائی جائے تو تعجب ہوتا ہے کہ وہ زندہ کیونکر تھے اور اس کے باوجود اکثر مکتوب الیہم سے خط و کتابت کا سلسلہ بھی جوں توں کر کے جاری رکھے ہوئے تھے جو موت تک جاری رہا۔ آل احمد سرور نے اکبر کے خطوں کے بارے میں لکھا ہے :

"شبلی کے خطوں سے میری نظر میں ان کی عزت بہت زیادہ ہو گئی اور اکبر کچھ گر گئے۔ حیرت ہے کہ اکبر جیسا شاعر، جو اشعار میں ایسی شوخ اور چنچل شخصیت رکھتا ہے، خطوں میں کیوں اس قدر کمزور، مصلحت بیں، جز رس اور چڑچڑا نظر آتا ہے۔ یہ نہیں کہ یہ خط اکبر کے نہ ہوں۔ ان میں جا بجا جو جھلکیاں ہیں.... وہ اکبر کے سوا کسی کی نہیں ہو سکتیں۔ مگر ملازمت نے اکبر کو اتنا ڈرپوک بنا دیا تھا کہ وہ ادھر وار کرتے تھے، ادھر معافی مانگتے تھے۔ وار کرنا فطرت کی طرف تھا اور معافی مانگنا انہوں نے اپنا شعار بنا لیا تھا۔" (۴۷)

اس میں آل احمد سرور صاحب یہ فراموش کر گئے کہ شبلی کے خطوط جوانی کے زمانے

کے ہیں (۴۸) اور اس دور نشاط کے جب ان کی آنکھیں جلوۂ جمال سے مسحور تھیں جبکہ اکبر کے خطوط ایک مریض سترے بہترے شخص کے ہیں جن کا نوجوان بیٹا اور عمر بھر کی رفیقہ بیوی اسی زمانے میں رخصت ہوئے تھے۔ ان حالات میں اکبر سے ہمدردی پیدا ہوتی ہے' وہ نظر سے گرتے نہیں۔(۴۹)اس کے باوجود سرور ہی کے لفظوں میں اگرچہ "آلام و افکار کے بادلوں میں" شعر و فن کی بجلیاں ہیں مگر ان کے نزدیک یہ "چمک دمک بہت کم دکھائی دیتی ہے۔"(۵۰) اگرچہ ان حالات میں چمک دمک کا دکھائی دے جانا بھی غنیمت ہوتا مگر اکبر کے خطوں میں شوخ نگاری کی بجلیاں اتنی مدہم نہیں جتنا کہ سرور صاحب ہمیں یقین دلانا چاہتے ہیں۔

اکبر کے خطوط میں شوخی' ذکاوت' طنز وغیرہ کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ بعض جملے اس قدر موثر ہیں کہ وہ بے تکلف اعلیٰ درجے کی نثر کے زمرے میں شامل کیے جا سکتے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ مثالیں ذکاوت (۵۱) کی ہیں۔ رعایت لفظی اکبر کے مزاج میں اس قدر رچی بسی ہے کہ تکلف سے نہیں' آپ ہی آپ ایسے جملے ان کے قلم سے نکلتے ہیں جو لفظی رعایتوں سے معمور ہوتے ہیں :

چند مثالیں درج ذیل ہیں :

"جون نے جان چھوڑ دی تو جولائی میں شاید ملنا ہو۔"(۵۲)

"ستارہ صبح بند ہو گیا' آفتاب نکلا' یہ لطیفہ ذہن میں آیا کہ ابراہیم اس سے بھی مطمئن نہیں۔"(۵۳)

"میں کھاتا کیا ہوں' خوان احتیاط سے ریزہ چینی کرتا ہوں... لہٰذا کھانے کو تو ملتوی رکھیے۔"(۵۴)

"اختصار شب وصل کا آپ نے خوب خیال کیا۔ اس کے جواب میں یہ لطیفہ عرض کرتا ہوں کہ اگر میرا خط شب وصل سے بھی زیاد مختصر تھا تو یہ سبب کہ وصل ملاقات ہے اور المکتوب نصف الملاقات مشہور ہے' لہٰذا میرا خط نصف شب وصل تھا۔"(۵۵)

"پا بہ رکاب ہوں کیا پیارا محاورہ ہے۔ ابھی گھوڑے پر سوار ہوں گے' باگ اپنے ہاتھ میں ہو گی۔ لیکن اب تو شاید ٹکٹ بدست ہوں زیادہ صحیح ہو۔"(۵۶)

"اودھ اخبار میں شیعہ کانفرنس کے ساتھ آپ کا ذکر دیکھا۔ لکھنے والے نے لکھا ہے کہ شاعری کو اس کانگریسی اور کانفرنسی سانچے میں کیوں ڈھالتے ہو' جواب تو

یہی ہے کہ تم سے قافیہ ملاتے رہیں۔"(۵۷)

"ہمدم' میں چڑیا چڑے کا مضمون عرش دلکشی پر پر پرواز مار رہا ہے۔"(۵۸)

"یہ موسم اور برف کیسی' سادہ پانی ایذا دیتا ہے۔ سخن سازی سے قطع نظر منجن بازی کر رہا ہوں۔"(۵۹)

رعایت لفظی کے ذریعے مزاح پیدا کرنے کے علاوہ اعلی درجے کے مزاح کے نمونے بھی خاصی تعداد میں موجود ہیں :

"زیادہ پڑھ نہیں سکتا' کتابوں کے دریا اُمڈے ہیں۔ اور میں نے اب تک عقل سیکھ کر کیا کیا اور آئندہ کیا کروں گا۔"(۶۰)

"جنگ اور رنگروٹ اور چندے اور سخت گرانی کے سوا یہاں آج کل کچھ ذکر نہیں۔"(۶۱)

"جب آپ درویش پریس جاتے ہیں تب پولیس کیا لکھتی ہے۔ وہاں تو اکثر جانا ہوتا ہو گا۔ اور جب آپ کسی سے باتیں کرتے ہیں تو کیا ان کا بھی خلاصہ لکھا جاتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو عمدہ رسالہ زبان اردو کا مرتب ہو جائے گا۔"(۶۲)

"اپنی خیریت لکھئے' نظامی دوربیں کی خیریت لکھئے۔ آپ سمجھے وہی بچہ جس کی نظر آسمان پر رہتی ہے۔"(۶۳)

بطور شاعر اکبر بہت بڑے طنز نگار ہیں۔ خطوط بھی طنز کی مثالوں سے خالی نہیں ہیں :

"یونیورسٹی کا میں ایسا ہی خیرخواہ ہوں جیسا انگریزی عملداری کا۔ یونیورسٹی ہماری تکمیل نفس بلکہ تکمیل انسانیت کے لیے اتنی ہی ضروری ہے جس طرح انگریزی عملداری ہم کو مہذب انسان بنانے کے لیے ضروری تھی۔(۶۴) یونیورسٹی قوم کے لیے ضروری نہ ہوتی تو لندن سے صدا کیوں اٹھتی اور ہمارے رئیس اس کے لیے کیوں دوڑتے۔"

"ہماری سمجھ جو مشرقی لٹریچر اور ہمارا مذاق جو دیرینہ عادت پر مبنی ہے' معیار صحیح نہیں ہے۔ اس رنگ کو نیا خون خوب سمجھتا ہے۔ اس کو مزا بھی آئے گا' ہم تو قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں:

السلام اے بعد ما آئندگان رفتنی

برشما خوش باش ایں غم خانہ ناماندنی" (۶۵)

"سید صاحب کا بھی ارادہ تھا کہ علی گڑھ کالج' یونیورسٹی ہو جائے۔ وہ ارادہ اب

پورا ہو گا- میرے ذہن میں یہ چار مصرعے آئے تھے:

ابتدا کی جناب سید نے
جن کے کالج کا اتنا نام ہوا
انتہا یونیورسٹی پہ ہوئی
قوم کا کام اب تمام ہوا

لیکن میری شاعری کا ضعف تھا کہ اس نظم سے کام پورا ہونے کے معنی نہ پیدا ہوئے بلکہ ایک اور پہلو نکل آیا- نئی روشنی کی پبلک سے داد ملنے کی امید نہ رہی-"(۶۶)

"ادھر میں نے آپ سے یاس صاحب (۶۷) کا پتا پوچھا' ادھر نظارہ میرٹھ' میں ان کا ایک مضمون نظر سے گزرا' جس میں انہوں نے میرے چند اشعار لکھے ہیں اور بہت مبالغہ آمیز مدح کی ہے .... غالب کو میرے سامنے طفل مکتب کہنا کیا معنے رکھتا ہے؟ یاس صاحب کے سامنے غالباً طفل مکتب ہوں گے-"(۶۸)

"آپ کے قبلہ و کعبہ کے مضمون(۶۹) پر اخبار "مشرق" میں کسی صاحب نے بہت کچھ فضول لکھ ڈالا ہے- جی چاہتا ہے جواب لکھوں- میں نے تو ایک دفعہ لکھا تھا :جناب جامع مسجد دہلی مدظلہ—— یہ کیا؟ جناب من! بات یہ ہے کہ ہر شخص سے بلحاظ مرتبہ خطاب مناسب ہے- بالفعل جامع مسجد دہلی' آئندہ ترقی کیجئے گا تو کعبہ بھی لکھوں گا-"(۷۰)

اکبر کی شخصیت کے بہت سے پہلو ان خطوط سے روشنی میں آتے ہیں' بصورت دیگر وہ تاریکی میں رہ جاتے- ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتنے قناعت پسند' گوشہ نشین اور منکسر المزاج آدمی ہیں- وہ کسی کا دل دکھانا نہیں چاہتے- اگر کبھی کسی کو ایک بھی اختلافی جملہ لکھ دیتے ہیں تو دوسرے ہی خط میں معافی مانگتے ہیں- علاوہ ازیں ان کی ملکی سیاست' معاشرت اور تصوف سے دلچسپی کی کیفیات معلوم ہوتی ہیں- زیادہ مثالیں طوالت کا باعث ہوں گی- چند ایک پر اکتفا کیا جاتا ہے:

"میں آپ کی مدح میں مبالغہ نہ کروں گا..... یہی کہوں گا کہ آپ مجھ سے بہتر ہیں- اسی سبب سے آپ کا مشتاق رہتا ہوں کہ کچھ سیکھوں -"(۷۱)

"چند شعر مسودے سے نقل کرا کر بھیجتا ہوں- بے دریغ حذف و ترمیم کے بعد شائع فرمائیے یا ناپسند کر دیجئے- پھر کچھ اشعار بھیج دوں گا-"(۷۲)

"آپ نے محض قابلیت سے اعتبار پیدا کیا اور ترقی حاصل کی۔ کبھی آپ کو تماشا گروں کے اسٹیج پر نہیں دیکھا۔ میرا اصول یہی تھا اور ہے۔" (۷۳)

"سوسائٹی کا تعلق خاطر مجبور کرتا ہے۔ اگر تندرست ہوتا تو جنگلوں اور پہاڑوں میں بھاگ جاتا۔" (۷۴)

"اخلاقی حالت ملک روز بروز پستی کی طرف جا رہی ہے۔ دولت اور علم باطن کی کمی کا اقتضا ہی یہ ہے۔" (۷۵)

"آپ کے دوست "الہلال" کا زر ضمانت ضبط ہو گیا:

مغرب کی برق ٹوٹ پڑی اس غریب پر
دور فلک ہلال کو لایا صلیب پر" (۷۶)

"ہندوستان کا پالٹیکس بہت پیچیدہ اور مشکل اور خطرناک ہوتا جاتا ہے۔ اردو یونیورسٹی بھی اسی میں داخل ہے۔ ہندو کا ہوم رول اور ذوق ہندی بھی اسی میں داخل ہے۔" (۷۷)

"اردو پر آپ نے خوب لکھا.... لیکن ان مضامین سے کیا ہوتا ہے۔ پالیسی اور ہے، زمانے کی رفتار اور ہے۔ ہندوؤں کی یہ بے امتیازی دیکھ کر ایک بات تسکین دہ ضرور دل میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ ایسی قوم کو غلبہ نہیں ہو سکتا۔" (۷۸)

"ہند کی دنیائے اسلامیہ بالخصوص ایک شدید انقلاب میں آ گئی ہے۔ روکنا خلاف مصلحت بھی ہے اور بحالت موجودہ ناممکن بھی۔" (۷۹)

"کالج(۸۰) کے باب میں آپ نے پوچھا ہے۔ زمانے کی موجیں ہیں۔ دیکھتے رہیے۔ یکجائی میں کیا قوت تھی، افتراق سے کیا ضعف ہو گا!(۸۱) اللہ کے فضل کا امیدوار رہنا چاہیے۔" (۸۲)

اکبر کے خطوط میں کہیں کہیں غالب کے مکاتیب کی طرح جزئیات نگاری کے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ موسم، وقت اور ماحول کا ذکر کر کے بالکل واقعیت کا احساس دلا دیتے ہیں۔ شروع کے خطوں میں جزئیات نگاری کی طرف زیادہ میلان ہے۔ بعد کے خطوں میں یہ صرف اشاروں تک محدود ہو کر رہ گئی ہے:

"عشرت سلمہ کا عقد ۳۰ مارچ روز پنج شنبہ پریاواں ضلع پرتاب گڑھ میں ہو گا۔ موسم گرم، راہ دور اور دشوار گزار ہے۔ دریا عبور کرنا ہے... ۳۰ مارچ کی صبح کو

چند اعزہ و احباب عشرت میاں کے ساتھ جائیں گے۔ یکے اور ہاتھی کی سواری ہو گی۔ شاید کچھ پالکیاں بھی ملیں۔" (۸۳)

"چیت کے مہینے کا آغاز بلکہ عین موسم بہار ہو گا۔ کیسے کیسے وضع دار نوجوان ہمارے دوست رونق محفل ہوں گے۔ دل تو یہ چاہتا ہے کہ ایک شوخ، طرار، پرکالہ آتش یہ گاتی ہوئی سامنے آئے :

ہے جلوۂ تن سے در و دیوار بسنتی
پہنے ہے جو پوشاک مرا یار بسنتی

"اسرار حسن صاحب گھوڑے سے، میں اجلاس سے، مولوی برکت اللہ صاحب منبر سے گر پڑتے، لیکن اس کے انتظام میں بڑی دشواریاں ہیں۔" (۸۴)

"میں ۲۳ مارچ کی سہ پہر کو لکھنؤ پہنچا۔ ۲۸ نمبر امین آباد پارک بالا خانے پر مقیم ہوا اور فی الفور پیادہ پا آپ کے مکان پر پہنچا۔ مایوسی ہوئی جب سنا کہ آپ باندے گئے۔" (۸۵)

"الہ آباد میں تو قیامت کی گرمی ہے۔ کسی وقت دل میں خیال آیا تھا کہ ڈیرہ دون یا منصوری چلا جاؤں، لیکن یہ خیال آیا کہ جون ہی تک زیادہ مصیبت ہے۔ خیر کسی طرح گزر ہی جائیں گے۔" (۸۶)

"تین چار دن ہوئے میں نماز عشاء کو کھڑا ہوا تو کھڑا نہ رہ سکا۔ دماغ میں پریشانی اور اعضا میں سنسناہٹ محسوس ہوئی ... ایک بجے شب کے آنکھ لگ گئی۔ حزین و زار تو ہوں ہی، گرمی کی شدت طرہ۔ دوسرے دن پھر دورہ ہوا، تیسرے دن پھر مگر خفت کے ساتھ، لیکن گرمی اتنی شدید ہوئی کہ الاماں! کہتا تھا کہ فوراً ڈیرہ دون چلا جاؤں۔ کل آپ کا نامہ محبت پہنچا... آپ کے خط کے ساتھ ابر رحمت بھی پہنچا اور بارش نے سماں بدل دیا۔ وہ تکلیف خارجی گرمی کی جاتی رہی۔" (۸۷)

"یہاں بارش نہیں ہوئی۔ شدت کی گرمی سے بے حواس ہوں۔ آج سال کا سب سے زیادہ بڑا اور گرم دن ہے۔ ۲۴ تک جان بچ گئی تو قیاس ہو سکے گا کہ گرمیوں سے بچ گیا۔" (۸۸)

"میں دیکھتا ہوں کہ اوروں کا مہمان ہونے کی قابلیت مجھ میں نہیں ہے۔ ایک مکان ہو جس کو جاڑوں میں گرم اور گرمیوں میں سرد رکھ سکوں۔ صاف ہو، ہوا

دار ہو، آسمان نظر آتا ہو، خود اپنا انتظام ہو۔ کھانے میں نہ میں انتظار کھینچوں، نہ کوئی میرا انتظار کرے۔"(۸۹)

"وعدے کا ایفا ضرور تھا ورنہ خستہ ہو رہا ہوں۔ لکھنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ پانچ بجے صبح اٹھنا، حوائج سے فارغ ہونا اس موسم میں میرے لیے ایک عجیب بات ہے۔ عشرت کا بنگلہ جنگل میں ہے۔ چاروں طرف کھیت ہیں۔ شدید سردی تھی۔ میں قیام نہ کر سکا۔ سات بجے عشرت نے موٹر پر اسٹیشن پہنچایا۔ ہوا کا سامنا تھا۔ میں بھی کمل میں گٹھری بن گیا۔ دس بجے الہ آباد پہنچا۔ زندگی ہے تو بسنت میں اب ہوش آئے گا کہ میں کون ہوں، کہاں ہوں۔"(۹۰)

اکبر کے خطوط ایک اور سبب سے بھی خاص طور پر اہم ہیں۔ ان خطوط سے ان کے مطالعے کا سراغ ملتا ہے۔ اگرچہ مطالعے کے بارے میں صرف اشارے ہی ملتے ہیں، لیکن بسا اوقات ان اشاروں سے مزید نتائج خود بخود واضح ہو جاتے ہیں۔ وہ سرسری طور پر کسی مصنف، شاعر یا نئی چھپنے والی کتاب کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کر دیتے ہیں۔ دوست احباب کی تصانیف پر بہت نرم لفظوں میں رائے دیتے ہیں، بلکہ بسا اوقات استحقاق سے زیادہ مدح کرتے ہیں، حتیٰ کہ سید سلیمان ندوی، عبدالماجد دریابادی اور کشن پرشاد وغیرہ کی شاعری کی بے حد تحسین کرتے ہیں، مگر جب اظہار رائے کسی اہم لکھنے والے کے بارے میں ہو تو سنبھل کر لکھتے ہیں۔ خطوط میں تنقید کا وہ انداز ہو بھی نہیں سکتا جو تنقیدی کتابوں کا خاصہ ہے۔ مکتوب الیہ کو مرعوب کرنا ہو تو دوسری بات ہے۔ مکاتیب میں تو کسی بارے میں اپنا تاثر ہی بیان کیا جا سکتا ہے۔ کہیں کہیں ان کی پوری شخصیت کی نقاب کشائی کر دیتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ عمر کے آخری بیس اکیس برسوں میں اکبر سب سے زیادہ قرآن مجید کا مطالعہ کرتے تھے۔ تلاوت میں کبھی ناغہ نہیں ہوتا تھا۔(۹۱) خطوط میں انہوں نے اپنے اشعار کے ساتھ جا بجا کلام مجید کی آیات کے حوالے دیے ہیں۔ مثلاً سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں:

"کل جو نظم بھیجی ہے اس میں شعر اول کے مصرعہ ثانی پر نشان بنا کر حاشیئے پر یہ آیت لکھ دیجئے: "ان الذین امنوا وعملوا الصلحت سیجعل لھم الرحمن ودا—" ترجمہ بھی کر دیجئے گا اور اس مصرعے پر: "کاٹو نہ وقت اپنا طعنوں میں اور گلوں میں" نشان بنا کر حاشیئے پر یہ آیت لکھ دیجئے: لاتلمزوا انفسکم ولا تنابزوا

بالقاب بئس الاسم الفسوق بعد الایمان۔"(۹۲)

اسی طرح بعض اوقات ایسے جملے لکھ جاتے ہیں جن سے قرآن مجید سے ان کے گہرے شغف کا اظہار ہوتا ہے۔ مثلاً ایک خط میں حسن نظامی کو "اسرار خودی" کے سلسلے کی بحث کے بارے میں لکھتے ہیں:

"حضرت اقبال نے میرے نزدیک تمہید میں احتیاط نہیں کی اور ایک بڑا مجموعہ دلوں کا مغموم و مایوس ہو گا۔ لیکن اب وہ سنبھل کر مسئلہ وحدت وجود اور مسئلہ رہبانیت پر گفتگو کریں گے۔ میں آپ کو مناسب اور محفوظ جگہ میں نہ پاؤں گا اگر آپ قرآن مجید سے مسئلہ وحدت وجود کو ثابت کرنے کے لیے قلم اٹھائیں گے۔"(۹۳)

آخری جملہ کسی ایسے ہی شخص کے قلم سے صادر ہو سکتا ہے جو مطالب قرآن سے بخوبی واقف ہو۔ اس کے علاوہ ان کے خطوط کے مجموعوں بالخصوص "خطوط اکبر" مرتبہ حسن نظامی میں قرآن مجید کے حوالے بکثرت آتے ہیں۔ کلام مجید کے بعد یورپ کے فلسفیوں اور ان کی کتابوں کے متعلق تاثرات بھی موجود ہیں۔ عبدالماجد دریابادی کی رائے ہے:

"اکبر پڑھتے کم تھے' سوچتے زیادہ تھے۔ دوسروں کے خیالات جذب کم کرتے تھے' خود انہی کے خیالات ابلتے زیادہ رہتے تھے۔ فلسفہ خواں' فلسفہ داں کم تھے۔ دانش آموز' حکمت آفرین زیادہ تھے۔"(۹۴)

عبدالماجد کی اس رائے سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہ ہو گا کہ اکبر کا مطالعہ محدود تھا۔ غالباً ماجد نے ان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پر زور دینے کے لیے لکھا ہے کہ پڑھتے کم تھے' سوچتے زیادہ تھے۔ شاید وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ وہ جتنا پڑھتے تھے اس سے زیادہ سوچتے تھے۔ اکبر کے خطوط اس بات کا ثبوت ہیں کہ فلسفے کے متعلق بھی ان کا مطالعہ معمولی درجے کا نہیں تھا۔ ان کے خطوں میں اس قسم کے جملے عموماً دکھائی دیتے ہیں:

"آپ بتا سکتے ہیں کہ اس بحث کا کہ ایگو ہمارے موجودہ جسم کا کاز ہے یا افکٹ کیا قطعی فیصلہ ہوا ہے؟ میں خیال کرتا ہوں کہ کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہوا۔ سول کی انڈویجوالٹی اور اس کا پہلے سے موجود رہنا تسلیم نہیں کیا گیا۔ لیکن بلا انڈویجوالٹی کے مادہ حیات مانا گیا ہے اور اس بات میں اختلاف ہے کہ بعد مرگ انڈویجویل سول قائم ہے یا نہیں۔ اگر ذہن میں ہو تو اشارتاً لکھئے گا۔"(۹۵)

ظاہر ہے یہ جملے فلسفے کے وسیع مطالعے کے بغیر نہیں لکھے جا سکتے۔ علاوہ ازیں فلسفے کی

کتابوں کے بارے میں براہ راست بھی اظہار خیال ہوا ہے :

"سوء اتفاق یا حسن اتفاق سے ایک صاحب نے دقیق مباحث فلسفہ بنیاد یقین کی ایک کتاب دے دی ہے اور مجھ کو اس سے واقف ہونا ضرور ہو گیا ہے- اس کو دیکھ رہا ہوں- نصف سے زیادہ نہیں سمجھتا- دماغ کمزور ہو گیا اور مصنف کا طرز بیان بہت پیچیدہ ہے یا یہ سمجھنا چاہیے کہ اس نے جید علماء ہی کو اپنا مخاطب سمجھا ہے- بہرحال امید ہے کہ ایک مہینے میں اس کو ختم کردوں -"(۹۶)

"میں ناتوانی اور ناتندرستی سے بہت معذور ہوں ورنہ ریلیجن اینڈ ریالٹی کا ترجمہ کیا چاہتا ہوں جو بالکل فلسفہ تصوف ہے اور فاؤنڈیشن آف بیلیف کا خلاصہ- یہ بھی فلاسفی آف تھیالوجی ہے-"(۹۷)

فلسفیوں کے متعلق بھی اظہار رائے موجود ہے :

"میں خوش ہوا کہ آپ برکلے کا ترجمہ کر رہے ہیں- آپ کو خود انشاء اللہ بہت فائدہ پہنچے گا' بشرطیکہ آپ کو اس کی پروا ہو- میرا مطلب باطنی فائدے سے ہے- ہم تو — اور ہم کیا' قریباً وہ سب جن کو ہم نے جانا ہے.... برکلے کی تقریر کو صحیح و دل نشین پاتے ہیں' ہمارے تصوف کی کامل تائید ہے-"(۹۸)

"۱۹۱۳ء میں برگساں کا اکسپوزیشن شائع ہوا ہے- میرا دل تو اب نہیں لگتا' کہاں تک ذہن کو قلابازیاں کھلاؤں- افلاطون سے لے کر کانٹ' ہیگل اور کیلے تک سب کا عروج و زوال دیکھا- لفاظیاں اور خیال آرائیاں ہیں.... بہرحال کتاب دلچسپ ہے- آپ نے ملاحظہ فرمائی ہو گی-"(۹۹)

فلسفے اور فلسفیوں کے متعلق اس انداز سے اظہار خیال اس بات کو تسلیم کرانے میں مانع ہے کہ ان کا مطالعہ فلسفہ محدود تھا-

اکبر کی بنیادی حیثیت شاعر کی ہے مگر عجیب بات یہ ہے کہ وہ اردو شعرا کا بہت کم ذکر کرتے ہیں- ان کے خطوں کے مجموعوں میں جہاں کہیں اردو شعر نظر آتا ہے' تلاش سے انہی کے کلیات میں ملتا ہے- اکثر دوستوں کو اپنا تازہ کلام بھی بھیجتے رہتے تھے- موقع محل کے مطابق انہیں اپنے ہی شعر یاد آتے تھے- اس کا ایک سبب تو یہ ہو سکتا ہے کہ انہیں اردو شعرا کا بہت کم کلام یاد ہو- دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے جو زیادہ قرین قیاس ہے کہ جس قسم کے حالات کی طرف اچٹتے اشارے وہ خطوط میں کر جاتے تھے' ان کے اظہار کا بہترین ذریعہ ان کے اپنے اشعار ہی ہو سکتے تھے- ان کے خطوط میں اب تک مجھے صرف ایک

اقتباس ایسا دکھائی دیا ہے جس میں کچھ فارسی شعرا کے ساتھ اردو شاعروں کے اسما بھی گنوائے گئے ہیں۔ مرزا سلطان احمد ایک تذکرۂ شعرا مرتب کرنا چاہتے تھے' انہیں بدیں الفاظ مشورہ دیتے ہیں:

"انتخاب اشعار کا مسئلہ پیچیدہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ مجموعہ تذکرۂ شعرا نہ ہو بلکہ مجموعہ اشعار ہو۔ شاعر کا نام' پتے اور نام کے لیے ہو۔ اردو کے اشعار بھی داخل ہوں۔ زیادہ تر تصوف و اخلاق کیونکہ یہی چیز اس کو ممتاز کرے گی۔ فارسی میں صائب' حزیں' بیدل' خاقانی' عرفی وغیرہ وغیرہ کو لیجئے۔ اشعار بہت دقیق نہ ہوں یا کہیں کہیں توضیح کر دی جائے۔ اردو میں انیس' دبیر' آتش' ناسخ' حالی' غالب' شاد وغیرہ ہیں۔ میرے دیوان میں بھی غالباً آپ کو بہت اشعار مل جائیں۔"(۱۰۰)

چونکہ ایک محدود موضوع کے لیے انتخاب اشعار کا مشورہ دیا گیا ہے' اس لیے اس اقتباس سے یہ اندازہ کرنا درست نہ ہو گا کہ اکبر کا مطالعہ شعرائے اردو انہی ناموں تک محدود ہے۔ تاہم چونکہ ان کے مکاتیب اس سلسلے میں تقریباً خاموش ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ فارسی شعرا کے اسما اور اشعار سے بھرپور ہیں' اس لیے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ انہوں نے فارسی شاعری کا مطالعہ زیادہ دقت نظر کے ساتھ کیا تھا۔ ان کے خطوں میں سعدی' حافظ' مولانا روم' ظہیر فاریابی' نظامی' فردوسی' ابو طالب کلیم اور بیدل وغیرہ کے اشعار نثر کے ساتھ خوبصورت موتیوں کی طرح ٹانکے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ سب سے زیادہ اشعار اور مصرعے حافظ شیرازی کے ہیں۔ اس سے ضمناً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حافظ کے سلسلے میں جب حسن نظامی سے اقبال کی بحث چھڑی تو اکبر نے اقبال سے کیوں اختلاف کیا۔ اکبر کو کلام حافظ سے جذباتی لگاؤ معلوم ہوتا ہے۔ خطوں سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

"میرے پیارے خواجہ صاحب! اللہ تعالیٰ آپ کو طریقت پر قائم رکھے:

حلقہ پیر مغانم ز ازل در گوش است
برہمانیم کہ بودیم و ہماں خواہد بود

حافظ ہی کی زبان میں دلی مدعا ادا کرنے میں مزا آتا ہے۔ حافظ صاحب نعت میں فرماتے ہیں:

نگار من کہ بمکتب نہ رفت و خط ننوشت
بہ غمزہ مسئلہ آموز صد مدرس شد

کون ایسا ہے جو ان کو عاشق رسول اللہ نہ سمجھے اور اس طرز ادا کا شیفتہ نہ ہو جائے۔"(۱۰۱)

"سماع خانے کا حال آپ کے خط میں دیکھ کر انبساط ہوا:

ہست مجلس براں قرار کہ بود

ہست مطرب براں ترانہ ہنوز

حافظ کا شعریاد آیا۔ قریباً آب دیدہ ہو گیا۔ اقبال صاحب کو لکھ بھیجا کہ میں مخدومیت کا مستحق نہیں، لیکن چاہتا ہوں کہ آپ کی عظمت اور محبوبیت قائم رہے۔"(۱۰۲)

"آپ نے خوب لکھا مرزا یاس کی نسبت۔ بھلا دیکھیے تو جو شخص حافظ کو بد کہے اس کو کیا کہوں مگر مجبوری ہے۔"(۱۰۳)

"کل ایک صاحب نے میرے اس خیال پر بڑی شگفتگی ظاہر کی کہ اس وقت ہزاروں، لاکھوں مسلمانوں کو ہوٹل اور مغربی ارتباط نے شرابی بنایا ہے یا دیوان حافظ نے؟ انہوں نے فرمایا کہ دیوان حافظ والے تو عموماً ابرار اور متقین گزرے ہیں۔"(۱۰۴)

مطالعہ شعرا کے علاوہ اکبر کے خطوط سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ زبان اردو کے علمی مسائل بالخصوص بعض فنی اصطلاحات پر ان کی آرا خاصے کی چیز ہیں۔ قواعد زبان انہیں ازبر ہیں۔ تذکیر و تانیث کے مسائل، محاورات وغیرہ کی تحقیق اور تفحص سے انہیں بہت دلچسپی ہے۔ اس قسم کے علمی مسائل عبدالماجد دریابادی اور عزیز لکھنوی کے نام لکھے ہوئے خطوط میں زیادہ تر زیر بحث آئے ہیں۔ علمی مباحث کی طرف بعض اوقات تو صرف اشارہ کر دیتے ہیں، لیکن جب کبھی تفصیل سے لکھتے ہیں تو خط کئی کئی صفحوں کو محیط ہو جاتا ہے۔ ان کے طویل ترین مکاتیب وہی ہیں جن میں علمی مباحث شامل ہیں۔

علمی مباحث سے متعلق بعض اقتباسات اختصار سے پیش کیے جاتے ہیں:

"جہاں کانکریٹ آئیڈیاز نہیں ہیں وہاں ایک زبان کے ایک لفظ کے مقابلے میں دوسری زبان میں کوئی لفظ پانا جو بلحاظ تمام شیڈس آف مینگ کے بالکل مطابق ہو، بہت مشکل ہے۔ اس کے وجوہ آپ پر ظاہر ہیں۔ مجھ کو خیال آتا ہے کہ ہملٹن نے (جو بلحاظ صفات زبان کے بہت ممتاز سنا جاتا ہے اور اب تو داخل دفتر ہو گیا ہے) افسوس ظاہر کیا ہے کہ انگریزی میں یونانی الفاظ فلسفہ کا پورا مفہوم ادا کرنے کو الفاظ نہیں ملتے۔ جب یہ صورت ہے تو غیر ذمہ دار لوگوں کے مشورے پر عمل کرنے میں آپ کا تامل حق بجانب ہے۔"(۱۰۵)

"منشی امیر احمد صاحب مینائی نے ایک دفعہ مجھ سے بذریعہ تحریر سوال کیا تھا (۱۸۸۸ء) کہ محاورے اور اصطلاح میں کیا فرق ہے۔ میں نے عرض کیا کہ محاورے نے جس طرح ترکیب پائی ہے' اسی ترکیب کی پابندی بولنے میں ضروری ہے' لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ خواہ مخواہ اس محاورے کا استعمال کیا جائے۔ یہ جائز ہے کہ اس مفہوم کو اور الفاظ میں ادا کریں۔ لیکن اصطلاح کی پابندی ضرور ہے جو شخص اس علم یا فن میں بحث کرے وہ اپنے مفہوم کو اسی اصطلاح میں بیان کرے۔"(۱۰۶)

"آپ نے خط میں جو مضمون متعلق الفاظ سابقہ و لاحقہ وغیرہ کے لکھا ہے وہ نہایت صحیح ہے۔ آپ نہ صرف مرادف المعانی الفاظ ڈھونڈتے ہیں بلکہ ایک عمدہ سسٹم الفاظ کا اردو میں قائم کیا چاہتے ہیں اور اسی بات نے آپ کے کام کو بہت مشکل کر دیا ہے ہیپی نس (۱۰۷)' مزری (۱۰۸) کا ترجمہ دکھ سکھ' بہت اچھا ہے لیکن یہ الفاظ اس انجمن (۱۰۹) میں بے وقعت ہیں۔"(۱۱۰)

Abstract ideas کا ترجمہ لوگوں نے خیالات مترنمہ کر رکھا ہے... پرسٹیج کے لیے ایک لفظ 'وقار' رات میرے ذہن میں آیا۔ لیکن صرف اردو بول چال میں یہ لفظ اس آئڈیا کے قریب ہے... 'حظ' کا ٹھیک اپوزٹ ٹرم مجھ کو سوائے 'حرمان' کے کوئی نہیں ملتا لیکن حرمان میں پین کا آئڈیا صریحی نہیں ہے۔(۱۱۱) صفحہ ۲۱۲ میں ایک غلطی معلوم ہوئی : اجنہ بجائے جنات۔ اجنہ جمع جنین ہے۔"(۱۱۲)

"امن کو مونث بولتا ہوں۔ قیاس ہے کہ میم مفتوح ہو مگر سنا ہے مکسور۔(۱۱۳)"

"تنبا کو کی بحث میں کلیم کے قلمی دیوان میں ایک شعر خوب مل گیا ہے :

بزم عشرت روشنائی از کجا پیدا کند
آتشی می رفت و جالش دود تنبا کو گرفت"(۱۱۴)

"اصلاح سخن کو ملاحظہ فرما کر دو چار دن میں واپس فرمایئے... حضرت نامہ نگار کے نزدیک تمام الفاظ فارسی مثل شنبہ عنبر وغیرہ کا املا غلط ہے... تنباکو پر رفارم کیا گیا ہے۔ شمبہ' دمبہ بھی جائز ہے۔ دمبے میں تو دم کی رعایت بھی ہے۔ شعر مرا بمدرسہ کہ برد کا حال ہے۔(۱۱۵)"

"تنباکو "غیاث" میں بھی موجود ہے اور تمام کتب فارسی میں یہی املا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ ایجاد اہل لکھنؤ میں تانیث ہے اور میری زبان پر بھی یہی

ہے۔"(۱۱۶)

"ہاں صاحب! آپ 'ارمانوں' اور 'افسانوں' کو قافیہ کریں گے؟ میں خیال کرتا ہوں کہ ایطائے خفی ہے۔ 'ارمان' اور 'افسانہ' میں واو نون جمع لگا دیا ہے۔ اسی طرح 'ایوان' اور 'ویران' میں واو نون جمع لگا دیا۔ خود اپنے ہی شعر مجھ کو نظر آئے۔ خارج کیا چاہتا ہوں"(۱۱۷)

ان مکاتیب سے اکبر الہ آبادی کے اپنے ہم عصر مشاہیر سے تعلقات معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ بعض شعرا و ادبا کے بارے میں ان کی آرا کا علم ہوتا ہے۔ ان کے مکتوب الیہم میں سر عبدالقادر' علامہ اقبال' سید سلیمان ندوی' عبدالماجد دریابادی' خواجہ حسن نظامی' عزیز لکھنوی' سر سید احمد خاں' حبیب الرحمٰن خاں شروانی اور سر کشن پرشاد جیسی مقتدر ہستیاں شامل ہیں۔ یقین ہے کہ ان کے خطوط بعض دیگر مشاہیر کے نام بھی ہوں گے جو اب تک ہمارے علم میں نہیں آ سکے۔ اس کے علاوہ اپنے بہت سے مشہور ہم عصروں کا ذکر ان کے مکاتیب میں آتا ہے جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان لوگوں سے اکبر کے کس قدر گہرے مراسم تھے۔ راجہ صاحب محمود آباد' مولانا محمد علی جوہر' مولانا شوکت علی' حکیم اجمل خاں' محسن الملک' مولانا شبلی نعمانی' مولانا ظفر علی خاں' موتی لال نہرو' عبدالحلیم شرر' ثاقب لکھنوی' صفی لکھنوی' یاس یگانہ چنگیزی' نوح ناروی' جوش ملیح آبادی' نظم طباطبائی اور ایسے دوسرے بہت سے مشاہیر کا ذکر ان کے خطوں میں موجود ہے۔ ان کے بارے میں مختلف آرا کا اظہار کیا گیا ہے۔ شبلی اور نظم طباطبائی کے علم و فضل کے وہ بہت قائل ہیں۔ علی برادران کی مخلصانہ مساعی کے قدردان ہیں۔ راجہ صاحب محمود آباد کے خلوص کے قائل ہیں۔ حکیم اجمل خاں سے ان کے تعلقات بہت گہرے تھے اور ان کا محبت سے ذکر کرتے ہیں۔ اکبر اپنی تمام تر مشرقیت اور وضع داری کے باوجود جب کبھی کسی شخصیت کے کسی پہلو کو ناپسند کرتے ہیں تو اظہار کرنے میں دریغ نہیں کرتے۔ اس سلسلے میں چند دلچسپ مثالیں درج ذیل ہیں:

"سید سلیمان صاحب درباریان ہارون رشید میں سے ہیں' ان کے مذاق کا کیا پوچھنا۔ خواجہ صاحب کا رنگ اور ہے' لیکن ہسٹری ان کو مفید نہیں ہو سکتی۔"(۱۱۸)

"نیو ایرا میں ایک آرٹیکل خواجہ صاحب کے خلاف چھپا تھا اور اقبال صاحب کا ایک مضمون تصوف کے خلاف۔ اقبال صاحب کی طبیعت نے عجیب تنگ اور

بے سود راہ اختیار کی ہے :ع

دیدنی ہے جہان رنگا رنگ"(۱۱۹)

"افسوس ہے کہ اب خواجہ صاحب کے ساتھ پورے طور پر نہیں چل سکتا۔ تفصیل اس کی بروقت (۱۲۰) ملاقات سنئے۔"(۱۲۱)

"ادھر میں نے آپ سے یاس (۱۲۲) کا پتا پوچھا' ادھر "نظارۂ میرٹھ" میں ان کا ایک مضمون نظر سے گزرا' جس میں انہوں نے میرے چند اشعار لکھے ہیں اور بہت مبالغہ آمیز مدح کی ہے... لیکن میں نہیں سمجھتا کہ ایسی مدح جس سے لوگوں میں بددلی پھیلے کیونکر... لائق تعریف متصور ہو۔ غالب کو میرے سامنے طفل مکتب کہنا کیا معنے رکھتا ہے۔ یاس صاحب کے سامنے غالباً طفل مکتب ہوں گے' لیکن میرے سامنے وہ استاد ہیں... میں اندیشہ ناک ہوں کہ ناواقف حضرات یہ سمجھیں گے کہ میرے اشارے سے ایسا لکھا جاتا ہے یا فی الواقع میرا ایسا خیال ہے' حاشا وکلا۔ غالب تو غالب ہی تھے' اس وقت بھی چند حضرات کے سامنے میں بالکل بے علم و مبتدی ہوں۔"(۱۲۳)

"ظفر علی خاں صاحب سے ملئے تو میرا سلام شوق کہئے۔ وہ پر جوش مسلمان ہیں' لیکن موم کی ناک بھی ہیں۔"(۱۲۴)

"مولانا شبلی کہاں ہیں؟ پارٹی بندی کی بڑی بخ لگ گئی ہے ورنہ دلکش ہیں۔"(۱۲۵)

"مکاتیب اکبر" کی اہمیت ایک اور سبب سے بہت زیادہ ہے۔ اکبر کے اشعار کے متعلق یہ خطوط گونا گوں معلومات کا خزانہ ہیں۔ بعض جگہ اشعار کا پس منظر معلوم ہوتا ہے۔ کہیں علامتوں کی وضاحت کرتے ہیں' کہیں اشعار کے رائج شدہ غلط مفاہیم کی تردید کرتے ہیں۔ مگر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اکبر کے آخری بیس برس کے اشعار کے سنین کا تعین ہو سکتا ہے۔ اس کی اہمیت اس لیے اور بڑھ جاتی ہے کہ "کلیات اکبر" کے چاروں حصے نہایت بے ترتیب چھپے ہیں' جن میں نہ اصناف کی ترتیب ہے اور نہ سنین کی۔ شاعر کے کلام کی تاریخی ترتیب کی اہمیت سب پر عیاں ہے۔ اکبر کے "مکاتیب اس سلسلے میں بہت مد ثابت ہو سکتے ہیں۔ ان سے یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ "کلیات اکبر" کے مختلف حصے پہلی مرتبہ کب طبع ہوئے اور اکبر کی زندگی میں ان کے کتنے ایڈیشن چھپ چکے تھے۔ یہاں چند ایسی مثالیں درج کی جاتی ہیں جن سے ان کے بعض اشعار کے پس منظر پر روشنی پڑتی ہے :

"ایڈیٹروں سے ناک میں دم ہے- بلقانیوں کے ظلم کے خیال سے کہیں میری زبان سے نکل گیا تھا: "بحمد اللہ کہ اب خون شہیداں رنگ لایا ہے"- یہ اس وقت کہا تھا جب صرف سرویا اور آسٹریا کی بحث تھی- دوسرا شعر صاف تھا:

بہت کی سختیاں بلقانیوں نے بے گناہوں پر
بالآخر چرخ ان کے سر کو زیر سنگ لایا ہے

ایڈیٹر نے یہ اشعار اس وقت چھاپے جب اعلان جنگ منجانب برٹش ہو گیا- ان پر اعتراض ہوا ہے-"(۱۲۶)

"کاپی کلیات رجسٹری کر کے بھیج دی ہے- یہ ترتیب عشرت سلمہ کی ہے... ایک مدت دراز کے خیالات کا مجموعہ ہے- جس وقت جو ترنگ آئی' موزوں ہو گئی اور سوم و دوم و اول تو کچھ لحاظ زمانے کا رکھا گیا ہے- ظرافت اور اشعار متفرق بالکل مخلوط ہیں- بعض جگہ ظرافت' جو بظاہر نہایت شوخ اور شدید رندانہ ہے' درحقیقت ایک پولٹیکل خیال کا اظہار ہے- لبرٹی اور سلف گورنمنٹ کو کمر قرار دیا' اعلیٰ عہدوں کو وصل سمجھا اور مسلم پالسی کو عاشق- اور کہہ دیا:

حاضر کو نہ حجت کی نہ غائب کی تلاش
کیوں وصل میں جستجو کمر کی وہ کرے" (۱۲۷)

"بی اکرم صاحبہ نے میری کل نظمیں نہیں دیکھیں- کم سے کم تین نظموں کی نقلیں ان کے پاس پہنچنی چاہیں- انشاء اللہ امروز و فردا میں بھیج دوں گا- آپ "تہذیب نسواں" میں اشاعت کے لیے بھیج دیجیے:

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں

پوچھتی ہیں کہ یہ بیبیاں کہاں نظر آئیں؟ غیر قوم کی ہوں گی- مولوی بشیرالدین صاحب ایڈیٹر "البشیر" سے پوچھیں' وہی بمبئی گئے تھے- کسی جلسے میں عورتوں کے اعضا ظاہر ہوئے' شوخیاں ظاہر ہوئیں- اسی مضمون کو دیکھ کر میں نے یہ قطعہ کہا تھا- مولانا شبلی دکن میں تھے' انہوں نے بے حد داد دی اور سارے ملک نے داد دی-"(۱۲۸)

غرض اکبر کے مکاتیب مختلف النوع خصوصیات کی بنا پر اردو ادب میں خصوصی اہمیت رکھتے ہیں- ان کے خطوط نہ طویل علمی بحثوں سے معمور ہیں اور نہ ہی لمبی لمبی خود کلامیوں پر مبنی ہیں- وہ نہایت اختصار کے ساتھ مکتوب الیہ تک اپنی بات پہنچانے کا فریضہ انجام دیتے ہیں- ان کے جملے مختصر' سیدھے سادے' صاف' واضح اور ہر قسم کی بناوٹ سے پاک

ہیں- بلکہ بعض جگہ تو جملوں کے نامکمل ہونے کا احساس ہوتا ہے- یہ مکاتیب صحیح معنوں میں مکاتیب ہیں' جو مکتوب الیہم کی شخصیات کو سامنے رکھ کر لکھے گئے ہیں- ان میں یہ انداز اپنانے سے گریز کیا گیا ہے کہ صرف القاب میں مکتوب الیہ کو مخاطب کر کے پھر اسے بھول گئے اور لمبے لمبے مضمون لکھنے شروع کر دیے- ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں :

"اکبر الہ آبادی کے خطوط دلچسپ بھی ہیں اور مختصر بھی- اختصار کی خشکی ظرافت سے اور اکثر موقعوں پر اپنے ہی اشعار سے دور کر جاتے ہیں-"(۱۲۹)

غرض یہ خطوط غالب کے مکاتیب جتنے اہم نہ سہی- پھر بھی اکبر کی **شخصیت**' تعلقات' کلام کے پس منظر اور نثر کے روشن اسلوب کی وجوہ سے ان کی اہمیت ہمیشہ برقرار رہے گی-

مضامین

مکاتیب کے علاوہ ان کی طبع زاد نثر کے نمونے مضامین کی شکل میں ملتے ہیں- اکبر کی ادبی زندگی کا آغاز بطور شاعر ہوا- اس کی تفصیل باب چہارم میں آچکی ہے- نثر نگاری کی طرف ان کی توجہ بہت بعد کو ہوئی- اب تک ان کی نثر پر جتنا مواد ہاتھ آیا ہے' اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ "اودھ پنچ" کے اجرا سے قبل انہوں نے نثر نہیں لکھی تھی- انہیں نثر نگاری کا شوق "اودھ پنچ" کے اجرا سے ہوا- "اودھ پنچ" کا اجرا جنوری ۱۸۷۷ء میں لکھنؤ سے منشی سجاد حسین کی ادارت میں ہوا-(۱۳۰) اکبر اس کے اجرا کے ساتھ ہی اس میں مضامین اور متفرق تحریریں چھپوانے لگے تھے- شروع کے چند برسوں میں انہوں نے بہت سے مضامین تحریر کئے' مگر جب ۱۸۸۰ء میں وہ سرکاری ملازمت میں آ گئے تو مضامین کم تعداد میں لکھے اس کے باوجود "اودھ پنچ" کے دور اول کے آخر تک ان کے مضامین چھپتے رہے-

مجھے "اودھ پنچ" کی فائلوں' علی گڑھ میگزین کے اکبر نمبر اور "انتخاب پنچ" مرتبہ رضی کاظمی سے اکبر کے تقریباً چالیس مضامین حاصل ہوئے- یہ مضامین اس قابل ہیں کہ ایک مجموعے کی شکل میں شائع ہوں-

"اودھ پنچ" کے مضامین اکبر کے متعلق طالب الہ آبادی لکھتے ہیں :

"کلام اکبر کے دوش بدوش ظریفانہ مضامین کا سلسلہ بھی 'اودھ پنچ' لکھنؤ کے دور اول میں جاری رہا... اکبر اس وقیع پرچے کے لیے برابر مضامین بھیجتے رہتے تھے- میری تحقیق بتاتی ہے کہ اکبر نے ۱۸۷۴ء سے ۱۸۸۰ء تک الف- ح- الہ آبادی کے نام سے مضامین لکھے ہیں-"(۱۳۱)

یہ رائے محل نظر ہے۔ "اودھ پنچ" کا اجرا ۱۸۷۷ء میں ہوا۔ اس سے پہلے اکبر نے نثر میں کچھ نہیں لکھا۔ یہ بات بھی غلط ہے کہ یہ سلسلہ ۱۸۸۰ء میں منقطع ہو گیا۔ ہمارے پاس ان کے متعدد ایسے مضامین موجود ہیں جو اس کے بہت سال بعد تک لکھے گئے ہیں۔ اب تک ۱۹۰۸ء تک کا ایک مضمون دریافت ہو چکا ہے جو "اودھ پنچ" جلد سی و دوم نمبر ۱۴ اپریل ۱۹۰۸ء میں "بنی آدم اور بنی بوزنہ" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ یہ بھی آخری مضمون نہ ہو اور یہ سلسلہ بعد تک بھی جاری رہا ہو۔ طالب کی رائے میں ایک اور غلطی بھی ہے۔ ان کے مندرجہ بالا اقتباس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ اکبر کے جملہ مضامین الف۔ ح۔ الہ آبادی کے نام سے شائع ہوئے۔ یہ رائے صحیح نہیں ہے۔ وہ یقیناً بیشتر مضامین الف۔ ح۔ کے نام سے لکھتے تھے، مگر اس میں جزوی تبدیلیاں ہوتی رہتی تھیں۔ کبھی الف ح الہ آبادی، کبھی الف ح از الہ آباد، کبھی الف ح از لکھنؤ، کبھی الف ح مغربی مذاق مشرقی وغیرہم۔

ان مضامین "اودھ پنچ" کے علاوہ بعض دیگر رسائل میں بھی ان کی نثری تحریریں چھپی ہیں۔ اگرچہ بہت کم نہایت مختصر، تاہم اس لحاظ سے قابل قدر ہیں کہ یہ اکبر کی تحریریں ہیں۔ انہیں کسی صنف میں شمار کرنا چاہیں تو تنقید کہہ لیجئے۔ زیادہ بہتر لفظ تقریظ رہے گا۔ ان تحریروں کی فہرست یہ ہے:

(۱) سروردیہ بیگم (کلکتہ) کی تصنیف "آئینہ عبرت" پر تبصرہ، مخزن، لاہور۔

(۲) مولوی وجاہت حسین کے مجموعہ کلام "نظم وجاہت" پر تبصرہ — مطبوعہ مخزن، لاہور، مارچ ۱۹۱۴ء۔

(۳) مرزا ہادی عزیز لکھنوی کے مجموعہ کلام "گل کدہ" پر تبصرہ — مطبوعہ مخزن، لاہور، مارچ ۱۹۱۹ء۔

(۴) جوش ملیح آبادی کے اولین مجموعہ نظم و نثر "روح ادب" کا دیباچہ، اشاعت اول کتب خانہ تاج، محمد علی روڈ بمبئی، (۱۹۲۰ء)۔

تلاش سے اس طرح کی بعض اور متفرق تحریریں بھی دستیاب ہو سکیں گی۔ بہرحال یہ کل مضامین بنیادی طور پر دو طرح کے ہیں، ایک ہلکے پھلکے انشائیے اور دوسرے تنقیدی مضامین۔ انہیں تبصرے یا تقریظیں بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان مضامین کی خصوصیات کا جائزہ الگ الگ لینا ہو گا۔

ہلکے پھلکے انشائیے تعداد میں زیادہ ہیں۔ مگر یہ خیال کرنا صحیح نہیں کہ ان کے

موضوعات بھی جذباتی یا رومانی ہوں گے۔ نہایت اہم اور سنجیدہ مسائل' جن میں سیاست بھی ہے اور معاشرت بھی' ان مضامین کا موضوع ہیں۔ سیاسی موضوعات میں انگریزوں کی حکمت عملی کی مخالفت کی گئی ہے۔ ہندوستان کے لوگوں کے بیرونی جنگوں میں جھونکے جانے پر تنقید کی گئی ہے۔ سلطنت عثمانیہ ترکی کی حمایت کی گئی ہے۔ انگریزوں کی اسلام دشمنی کی طرف اشارے کیے گئے ہیں۔ معاشرتی موضوعات میں بددیانت اور رشوت خور لوگوں پر اعتراضات' قدامت پرستی پر تعریض' نئی تہذیب کی مذمت' پردے کی حمایت وغیرہ شامل ہیں۔ بعض مضامین میں فلسفیانہ انداز بھی اختیار کیا گیا ہے۔

یہ مضامین مطالعہ اکبر کے سلسلے میں اس لیے اہم ہیں کہ ان کا نقطۂ نظر ان کے ذریعے بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔ اگرچہ انہوں نے بہت تفصیل کے ساتھ اپنی شاعری میں تمام نظریات بیان کر دیے ہیں' مگر شاعری ایسا ذریعہ اظہار ہے کہ بعض اوقات غلط توجیہات کا امکان باقی رہتا ہے۔ نثر میں اس کا امکان کم سے کم ہوتا ہے۔ اکبر کے ان نثری مضامین سے ان نظریات پر مہر تصدیق ثبت ہو جاتی ہے جو ان کی شاعری کے ذریعے ہمارے سامنے آتے ہیں۔

ان مضامین کا اسلوب ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اردو نثر میں جو انقلاب فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کے ذریعے آ چکا تھا' اسے غالب کی نثر نے اور قوت بخشی۔ سر سید احمد خاں' شبلی' حالی اور نذیر احمد کی نثر نے اردو زبان کو ابلاغ و اظہار کے بے شمار راستے سجھائے۔ کوئی موضوع ہو اردو زبان کی دسترس سے باہر نہ رہا۔ "اودھ پنچ" کے مصنفین اسلوب نثر کے اعتبار سے قدرے قدامت پسند تھے۔ غالباً لکھنؤ کا علاقہ نثر میں قدامت پسند ہی رہا تھا جہاں میر امن کے مقابلے میں رجب علی بیگ سرور پیدا ہوئے تھے۔

اکبر کی نثر کے مختلف رنگ ہیں۔ کہیں قدیم انداز میں قافیہ پیمائی' لفظی رعایتیں اور ہم وزن نثری ٹکڑے' کہیں بے قافیہ رواں اور سیدھی سادی نثر۔ تاہم اس نثر کا مجموعی تاثر یہ ہے کہ نہ تو حالی کی نثر جیسی سادہ ہے اور نہ سرور وغیرہ کی طرح دقیق۔ "اودھ پنچ" کے دوسرے مصنفین مثلاً منشی سجاد حسین' نواب سید محمد آزاد' پنڈت تربھون ناتھ ہجر' احمد علی شوق قدوائی' مچھو بیگ ستم ظریف' منشی جوالا پرشاد برق اور عبدالغفور شہباز وغیرہ کا انداز نثر بھی اسی قسم کا ہے۔ اگرچہ ان کے اسالیب میں کچھ نہ کچھ انفرادیت ملتی ہے جو لازماً ہر لکھنے والے کے ہاں موجود ہوتی ہے' مگر ان میں فرق بہت کم ہے۔ اکبر کے مضامین میں لفظی تناسبات کثرت سے آتے ہیں۔ ہر طرح کا مزاح ان میں موجود ہے۔ لطیف و کثیف جو آج

کے قاری کے لیے کہیں تازگی لیے ہوئے ہے اور کہیں بار ہے۔ ان مضامین میں سے چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں' جن سے یہ تمام خصوصیات واضح ہو جائیں گی۔

''ہٹو بچو' سنبھل بیٹھو' جگہ دو ـــــ ہم آتے ہیں۔''

''توبہ ارے میاں! خدا کے لیے کچھ کہو گے بھی' آخر ہو کون؟''

''بتا ہی دیں۔ ہم ہیں خیال ولد دماغ ولد نیچر ولد قل ھو اللہ احد اللہ الصمد... الی آخرہ۔''

''واہ وا' واہ وا! یہ تو آپ نے اپنے نام کے ساتھ اپنا نسب نامہ بھی پڑھ سنایا۔ یہ تو فرمائیے یہاں نہ کوئی کمیٹی' نہ سوسائٹی' نہ لیکچر' نہ آرٹیکل' نہ چندہ' نہ لائبریری۔ آپ زور شور سے جو تشریف لائے ہیں اس کا کیا باعث؟''

آہاہاہا! اس کا باعث کچھ نہ پوچھیے:

چمنستان کی گئی نشوونما پھرتی ہے
رت بدلتی ہے کوئی دن میں ہوا پھرتی ہے

''... جناب یہ سب سہی مگر کچھ بات اور بھی ہے... ہزار رنگ بدلے' کبھی آپ نہاں خانہ دماغ سے نہ نکلے۔ اب کیا تھا کہ آپ نے اس دھوم دھام سے پر پرواز کھولے ہیں۔''

''سچ بتا دوں۔''

''مناسب تو یہی ہے''

''بھئی سچ تو یہ ہے اللہ سیکرٹری آف اسٹیٹ کو بغیر کہے اول درجے کا صدر اعلیٰ کر دے... ایکٹ پابندی اخبارات کی ترمیم کی کس عمدگی سے رائے دی ہے کہ جی پھڑک گیا۔ سچ پوچھئے تو ہم کو جلا دیا۔ میرے حق میں تو مسیحائی کی۔ سقف دماغ میں سوکھے مکڑ کی طرح ہزار جال پھیلاتا تھا مگر ایک مگس مضمون ہاتھ نہ آتی تھی۔ اب تو وہ خرمگس میں پھساؤں کہ ہزار قحط پڑے' میرے راتب میں خلل نہ پڑے۔''

''اگر یہ ہے تو اپنی سرکار ابد قرار کی شان میں ایک رباعی دعائیہ کہنا ضرور ہے۔''

''بہت خوب اے حضت! یہ تو خود ہمارا فرض ہے۔ خزانہ مضمون ہاتھ آیا ہے تو ادائے ٹیکس واجبات سے ہے۔ اچھا سنئے:

قیصر ہند کو اللہ سلامت رکھے
دشمنوں کو ہدف تیر ملامت رکھے

حاسدوں کو غم و حسرت کی نشانی کر دے
پنچ کو عشرت و راحت کی علامت رکھے"

"اے سبحان اللہ! خوب ارشاد کیا ہے۔ مجرد کے واسطے علامت کس قدر موزوں ہے۔"
"آداب جھاڑتا ہوں، بندگیاں اچھالتا ہوں۔"
"کیا خوب! آداب نہ ہوا دولتیاں ہوئیں۔"
"جی یہ توسن طبع کی رعایت ہے۔"
"اچھا یہ بندگیاں اچھالنا چہ معنی دارد۔"
"جی یہ بادۂ مضمون کی مناسبت ہے"
"کلیل میں تو آپ ہی ہیں۔ بھلا جواب دینے میں کب رکیے گا۔ خیر اب زمانہ سابق کی کچھ برائی اور اس عہد کی کچھ تعریف فرمائیے۔"
"سچ بات کہنے میں کیا عذر ہے۔ وہ بھی لیجئے:

ہوتے تھے آگے ہند میں مجنون بادشاہ
کرتے تھے بے خطا بھی بہت خون بادشاہ
اے پنچ میرا عہد عجب عہد امن ہے
یعنی ہے اس زمانے میں قانون بادشاہ

بچے پر...؟"
"ہاں ہاں! بس آگے نہ بڑھئے گا۔ صرف شعر کہلا لیجئے۔"
"یوں ہے تو خیر۔"
"خیر کیسی؟ خون جگر کھا کر نظم کروں۔ آپ ایک خیر میں خاتمہ بالخیر کیے دیتے ہیں۔ اے حضت تعریف کیجئے۔"
"اچھی زبردستی کی تعریف ہے۔ اچھا صاحب واہ وا! ماشاء اللہ!"
"تسلیم جاری کرتا ہوں"— "یہ کیا؟"— "قانون کی رعایت۔"
"اس رعایت نے آپ کو مجنوں بنا کر دو قافیوں کا زبردستی خون کرایا ہے۔"
"اچھا افواج ہند کو سرکار نے یورپ بھیج کر جو عزت افزائی کی، اس کی نسبت بھی کچھ ارشاد ہو۔"
"یہ تو آپ نے میرے دل کی بات کہی۔ اچھا سنئے۔"

انگلش کی مدد سے مالٹا تک
ہندی لشکر جو بڑھ گئے ہیں
کہتے ہیں یہ ہنس کے ہند والے
کالے گوروں پہ چڑھ گئے ہیں

"بہت خوب! سبحان اللہ!"

"آداب فیر کرتا ہوں" (رعایت ظاہر ہے)۔

"اب شہر کلکتہ کی نسبت بھی کچھ ارشاد ہو جائے۔"

"ضرور! ضرور! وہ تو ہمارا دارالسلطنت ہی ہے۔ الہ آباد رکھے! سنئے:

نائب سلطان عالم کی وہاں درگاہ ہے
حاکمان دادگر کا خیمہ و خرگاہ ہے
تاجروں کا کیوں نہ ہو اطراف یورپ سے ورود
جانتے ہیں سب کہ کلکتہ بھی بندرگاہ ہے

"اے سبحان اللہ" ـــ "تسلیم کدواتا ہوں" ـــ "یہ کیا؟"

"بندرگاہ کی رعایت۔"

اس اقتباس میں اکبر کے مضامین کی اکثر خوبیاں سمٹ آئی ہیں۔ ""تسلیم کدواتا ہوں"" "آداب فیر کرتا ہوں" ناپسندیدہ لفظی رعایتیں سہی مگر ان میں سے اکثر جملے طنز و مزاح کی اچھی مثالیں ہیں۔ انگریزوں کے اس پرچار پر کہ مسلمان بادشاہ جنونی ہوتے تھے اور ان کے دور میں بڑا کشت و خون ہوتا تھا، جبکہ انگریزی عہد قانون و امن کا عہد ہے، لطیف طنز کی گئی ہے۔ لفظی رعایتوں کی بعض اچھی مثالیں بھی اس اقتباس میں موجود ہیں۔ سارا مضمون مکالماتی انداز میں لکھا گیا ہے۔ جابجا اشعار سے دلچسپی میں اضافہ کیا گیا ہے۔

اب ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:

"بھائی پائنیر' صاحب کبھی کبھی طعنہ زن ہوتے ہیں کہ ٹرکی کی سلطنت' سلاطین یورپ کے عدم اتفاق سے بچی جاتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ کرۂ ارض کواکب کی کشش باہمی سے بچا جاتا ہے ورنہ اس کا پتا بھی نہ لگتا۔ دور کیوں جاؤ' ہندو مسلمان کے کشیدہ تعلقات 'پائنیر' کی گرہ کو اور مضبوط کرتے ہیں۔ دنیا یوں ہی چلتی ہے۔ ٹرکی کی کیا خصوصیت' 'پائنیر' کا ایک نامہ نگار لکھتا ہے کہ ٹرکی سلطنت کو ضرور زائل کر دینا چاہیے۔ جب تک ایسا نہ ہو گا مسلمانوں کی بے چینی نہ

جائے گی- میں کہتا ہوں کہ اس کی کوشش ۱۴۵۳ء سے ہو رہی ہے- آپ دعا کیے جائیے- رہی مسلمانوں کی بے چینی' وہ کبھی کبھی آپ کی حماقت سے ہو جاتی ہے' ورنہ برٹش گورنمنٹ کے اصول کو سب دل سے پسند کرتے ہیں اور خوش ہیں- "انسٹیٹیوٹ گزٹ" لکھتا ہے کہ یونان پر ٹرکی کی فتح یابی کچھ محل مسرت نہیں- میں بالکل اتفاق کرتا ہوں' لیکن وجوہ رنج مکمل ارشاد ہوں تاکہ مجلس ماتم برپا کی جائے-"

اس مضمون سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انگریزی حکومت ترکی کی عثمانی سلطنت کو مٹانے کے لیے انگریز صحافیوں کے ذریعے کس قسم کا پروپیگنڈا کروا رہی تھی- ہندو مسلمانوں کے کشیدہ تعلقات اور مسلمانوں کا انگریزوں کی مذکورہ پالیسی پر رد عمل سب اس اقتباس سے واضح ہے- اس مضمون کا اسلوب نہایت سیدھا سادہ' قافیہ بندی اور لفظی رعایتوں سے پاک ہے- "اودھ پنچ" کے حلقے میں یہ اسلوب "جدت" کا علمبردار ہے-

ایک اور اہم مضمون "بجز اونٹ کے سب سواریاں موقوف" کے عنوان سے ہے- اس میں اکبر نے ان قدامت پرست مسلمانوں کا مذاق اڑایا ہے جو نئی ایجادات سے بدکتے ہیں- اس مضمون سے بعض نقادوں (جن کا ذکر باب سوم میں آ چکا ہے) کا یہ خیال باطل ثابت ہوتا ہے کہ اکبر قدامت پسند اور ہر نئی ایجاد کے مخالف تھے- اس مضمون کا انداز بیان بھی سلیس اور صاف ہے- اگرچہ یہ مضمون اپنے تسلسل کی بنا پر اس قابل ہے کہ تمام کا تمام نقل کیا جائے مگر خوف طوالت کے باعث صرف کچھ اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں:

"ایک مولوی صاحب کو خیال پیدا ہوا کہ مسلمانوں کی ترقی صرف اس سبب سے رک گئی ہے کہ انہوں نے اونٹ کی سواری روک دی ہے اور بائیسکل اور فٹن اور ریل کو اختیار کر لیا ہے- مولوی صاحب نے بہت سے مسلمانوں کو جمع کر کے اپنا خیال ظاہر کیا اور فرمایا کہ ہمارا ارادہ ہے کہ باضابطہ طور پر خدا سے دعا مانگیں کہ گورنمنٹ سوائے اونٹ کے سب سواریاں ہندوستان میں بند کر دے... لیکن ایسے مسلمان بھی کم نہ تھے جن کو ریل' فٹن اور بائیسکل اور دیگر سواریوں سے برابر کام لینا ہوتا تھا- انہوں نے مولوی صاحب سے بحث شروع کی- مولوی صاحب نے فرمایا: "اونٹ کیا مقدس جانور ہے- دیکھو خدا نے قرآن میں اسی کا ذکر فرمایا ہے: انظر الی الابل کیف خلقت..." انہوں نے کہا: "قبلہ و کعبہ! ہم آپ کا ادب کرتے ہیں' لیکن یہ آپ نے ایسا بے ٹھکانے خیال کیا ہے کہ ہم کو

بجز اس کے کہ آپ کی خفت عقل پر ہنسیں، کچھ چارہ نہیں۔" مولوی صاحب نے فرمایا کہ تم لوگ راندۂ درگاہ ہو۔ انہوں نے جواب دیا کہ حضرت! ہم تو کچھ اس کی حقارت نہیں دیکھتے۔ مناسب مواقع پر اب بھی برابر اس کا استعمال ہے... لیکن آپ جو ہماری روزانہ زندگی اور اس کی ضروریات پورا کرنے میں اونٹ کو داخل کرتے ہیں، یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟ ریل میں پندرہ دن کی راہ ایک دن میں طے ہوتی ہے۔ فٹن پر کتنی خوبی اور شان سے اور تیزی سے راہ طے ہوتی ہے۔ بھلا اونٹ پر بلحاظ معاشرت موجودہ کون اپنی کمر توڑنے کو چڑھے گا۔ اگر آپ ایسی دعا کیجئے گا تو خدا بھی آپ کو نہایت متعصب یا احمق سمجھے گا۔"

تنقیدی نثر مقدار میں انشائیوں سے بھی قلیل ہے۔ اس میں کچھ تبصرے (جنہیں تقریظیں کہنا زیادہ مناسب ہے) اور کچھ مضامین، جو "اودھ پنچ" میں اٹھائی جانے والی بحثوں کے سلسلے میں لکھے گئے ہیں، قابل ذکر ہیں۔ اکبر اچھے نثر نگار اور بڑے شاعر ہیں اس لیے ان میں تنقیدی بصیرت کا ہونا ضروری ہے، تاہم یہ ضروری نہیں کہ ایسی بصیرت رکھنے والا شخص شرح و بسط سے اپنے خیالات کا اظہار بھی کرے۔ اکبر نے تنقیدی تحریریں توجہ سے نہیں لکھیں۔ یہ بہت کم اور مختصر ہیں۔ ان کے تبصرے بالخصوص کسی کتاب کا سرسری تعارف ہوتے ہیں۔ زیادہ تر تعریف و توصیف ہی کرتے ہیں مگر کبھی کبھی خامیوں کی طرف بھی اشارہ کر جاتے ہیں۔ ان کی تنقید تاثراتی قسم کی ہے۔ تجزیہ صرف کہیں کہیں ہے۔ "اودھ پنچ" کے سلسلہ مضامین میں کچھ اچھی نظریاتی باتیں بھی کہی گئی ہیں۔ مثالیں یہ ہیں:

"اودھ پنچ" میں داغ کے مندرجہ ذیل شعر پر بحث چھڑ گئی:

آنسو نہ پئے جائیں گے اے ناصح ناداں
ہیرے کی کنی جان کے کھائی نہیں جاتی

اس پر کسی نے اعتراض کیا کہ دونوں مصرعے مربوط نہیں ہیں۔ اکبر نے اس کی تائید میں مضمون لکھا۔ پھر کسی نے اختلاف کیا۔ اس اختلاف کے جواب میں اکبر نے "داغ اور ہیرا" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جس کے اہم حصے یہ ہیں:

"حضرت داغ کے استاد ہونے میں شک نہیں۔ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ہم لوگ اپنے شعرائے اہل کمال کی قدر نہیں کرتے یا ان کا ادب اور ان کی عزت نہیں کرتے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ کسی استاد کے کلام پر اعتراض کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ معترض کے نزدیک وہ استاد نہ رہا۔ کون ایسا استاد گزرا ہے جس کے

کسی ایک شعر پر بھی اعتراض نہ ہوا ہو۔ لیکن اس سے کیا اس کی استادی جاتی رہی؟ ہرگز نہیں۔ یاد رکھنا چاہیے کہ اشعار پر اعتراض کر دینا بہت سہل ہے، خصوصاً جبکہ صحت الفاظ و ترکیب نحوی کو چھوڑ کر بہ لحاظ معنی و مفہوم کے شعر پر نظر کی جائے۔"

پس ہم حضرت داغ کا اس حیثیت سے کہ وہ ہمارے ملک و زبان کے ایک نامور اور ذہین شاعر ہیں، نہایت ادب کرتے ہیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت نے اپنی استادی کو مدت سے ملتوی کر رکھا ہے۔ حسن زبان اور حسن خیال دونوں کے امتزاج سے عمدہ شعر پیدا ہوتے ہیں۔ انہوں نے حسن زبان کی دھن میں حسن خیال سے بہت کچھ قطع نظر کی ہے اور حسن زبان کو اس قدر روندا ہے کہ غالباً زبان ہی رہ گئی، حسن جاتا رہا... یاد رکھنا چاہیے کہ اگرچہ ردیفوں کا چمکنا اور نہایت بے تکلف طور پر ان سے معانی کا پیدا ہونا اور ان کا بامحاورہ ہونا مقبولیت شعر میں نہایت درجے کو موثر ہے، لیکن درحقیقت ردیفوں ہی کو چمکا کر داد لینا اور اسی پر قناعت کرنا اور زبان ہی کے ٹکڑوں پر بسر اوقات کرنا دلیل اس بات کی ہے کہ شاعر عمدہ خیالات اور بلند مضامین پیدا کرنے سے عاجز ہے۔ وہ دلوں کو بے چین نہیں کر سکتا، ان کو لٹریری تعجب میں محو کیا چاہتا ہے۔ وہ چمن نہیں کھلا سکتا، آتشبازی چھوڑتا ہے... یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ہم صرف حسن خیال یا خیالات مفیدہ کے طرف دار ہیں، ہرگز نہیں۔ شاعری کالج یا مدرسے کا سبق نہیں ہے۔ دنیا آنکھوں کے سامنے ہو، نازک اور بے چین دل پہلو میں ہو، لطیف اور رنگین خیالات ہوں، طرز بیان دلکش ہو، یہ باتیں شاعری کی ہیں۔ ہمارے مولانا حالی صاحب بھی کسی زمانے میں اچھے شاعر تھے، لیکن حضرت نے اب حسن خیال کی دھن میں حسن زبان سے قطع نظر کی ہے اور حسن خیال کو اس قدر روندا ہے کہ حسن جاتا رہا اور خیال ہی خیال رہ گیا ہے۔"

یہ مضمون نظریاتی تنقید کی اچھی مثال ہے۔ اگرچہ یہ ۱۸۹۸ء کے "اودھ پنچ" میں شائع ہوا تھا، اس اعتبار سے اسے تحریر میں آئے پون صدی ہو چکی ہے اور یہ وہ زمانہ ہے جب شبلی کی تنقیدات ابھی وجود میں نہیں آئی تھیں، تاہم اس میں جو نظریہ پیش کیا گیا ہے، یعنی اچھا شعر حسن خیال اور حسن زبان کے امتزاج سے پیدا ہوتا ہے، آج بھی اتنا ہی نیا ہے جتنا کہ ایک صدی پہلے تھا۔

ان مضامین کے علاوہ اکبر نے نثر کا ایک رسالہ بھی لکھا تھا جس کا ذکر کسی نے آج تک نہیں کیا- اس رسالے کے متعلق انہوں نے عبدالماجد دریابادی کے نام دو خطوں میں کچھ باتیں تحریر کی ہیں- وہ دونوں اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں :

"اردو پر آپ نے خوب لکھا- محسن الملک صاحب کے ایما سے میں نے بھی ایک بڑا مضمون لکھا تھا- ایک واقف کار مسلمان کی رائے سے چھپا تھا- چونکہ میں اس وقت مرزا پور میں سیشن جج تھا اور سرانٹنی میکڈانل کی گورنمنٹ حامی ہندی تھی، اس سبب سے میرا نام نہیں ظاہر کیا گیا- وہ مضمون قابل دید ہے- علی گڑھ میں کہیں ہو گا-" (۱۳۲)

"محسن الملک کی فرمائش سے میں نے سرانٹنی میکڈانل کے زمانے میں بلا اظہار نام اردو، ہندی پر ایک مضمون لکھا تھا- انہوں نے پمفلٹ چھپوایا تھا : "ایک مسلمان واقف کار کی رائے"- یاد نہیں کہ کون سنہ تھا- شاید ۹۸ع یا ۹۹ع ہو-" (۱۳۳)

ان دو اقتباسات سے جو معلومات اس کتابچے کے بارے میں حاصل ہوتی ہیں، افسوس ان پر کچھ اضافہ نہیں ہو سکتا- پاکستان کی کسی لائبریری سے یہ کتابچہ نہ مل سکا- اکبر کے پوتے سید مسلم رضوی کے پاس ان کے باقی ماندہ کاغذات ہیں، ان میں بھی یہ موجود نہیں- ممکن ہے ہندوستان کی کسی لائبریری میں ہو، مگر ہندوستان کے ساتھ پاکستان کے موجودہ تعلقات کی روشنی میں اس کا ہندوستان سے ڈھونڈھ نکالنا ممکن نہیں- شاید آئندہ جب کبھی حالات معمول پر آئیں تو یہ کتابچہ منظر عام پر آسکے-

تراجم

نثر میں اکبر کی ایک اور حیثیت بھی ہے اور وہ ہے مترجم کی- انہوں نے ایک ہی مصنف کی دو کتابوں کا اردو ترجمہ کیا ہے- مصنف کا نام ولفرڈ سکاون بلنٹ ہے- بلنٹ نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں جن میں سے اکبر نے "فیوچر آف اسلام" کو ترجمے کے لیے منتخب کیا ہے- بلنٹ انگلستان کے ایک جاگیردار گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اور اسلام اور دنیائے اسلام سے اسے خصوصی دلچسپی تھی- وہ جمال الدین افغانی کے دوستوں میں سے تھا- افغانی جب انگلستان گئے تو ان کا قیام بلنٹ کے ہاں رہا- بلنٹ جب ۱۸۸۲ع میں ہندوستان آیا تو اکبر نے کلکتے میں اس سے ملاقات کی اور کتاب کے ترجمے کی اجازت حاصل کی-

اکبر الہ آبادی کا یہ ترجمہ "فیوچر آف اسلام" یا "مسلمانوں کی حالت آئندہ" کے نام سے ۱۸۸۴ء میں شائع ہوا۔ دیباچے کا سنہ تحریر ۲۵ مارچ ۱۸۸۴ء ہے۔ جس زمانے میں اکبر نے یہ ترجمہ کیا ہے، ان دنوں وہ علی گڑھ میں منصف کے عہدے پر فائز تھے۔ اردو ترجمہ ۱۸/۸ x ۲۲ سائز کے ۱۵۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ ترجمہ اب بالکل نایاب ہو چکا ہے۔ حسن اتفاق سے اس کی ایک جلد پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔ علاوہ ازیں انگریزی کی اصل کتاب بھی دستیاب ہو گئی ہے۔ اس لیے اس ترجمے کی قدر و قیمت کے تعین میں آسانی رہے گی۔

اکبر نے کتاب کے شروع میں ایک دیباچہ لکھا ہے جس سے ترجمے کا مقصد ظاہر ہوتا ہے اور کتاب کے متعلق بعض دوسری معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ چونکہ یہ ترجمہ نایاب ہو چکا ہے اس لیے اس کے دیباچے کو دلچسپی اور حصول معلومات کی خاطر نقل کیا جاتا ہے:

تمہید

اپنے برادران اسلامیہ کے سامنے کتاب 'فیوچر آف اسلام' کا ترجمہ پیش کرنے میں مجھ کو کچھ زیادہ تمہید کی ضرورت نہیں ہے۔ مصنف نے جو خیالات ظاہر کیے ہیں، عام اس سے کہ وہ ہمارے حسب مراد ہوں یا نہ ہوں یا ان کی صحت تمام تر لائق تسلیم ہو یا نہ ہو، ایسے نہ تھے کہ مجھ کو مسلمانوں کی اطلاع کے لیے اس ترجمے کا شوق نہ پیدا ہوتا۔ زمانے کی رفتار نے مسلمانوں کے دلوں کی ایک غیر معمولی حالت کر دی ہے۔ ایسے وقت میں مجھ کو امید ہے کہ میں نے اپنا وقت ضائع نہیں کیا اگر سوچنے والی طبیعتوں کے دائرۂ خیال کو وسیع کرنے کے لیے کچھ محنت اٹھائی اور اسلام کی مجموعی پولیٹیکل اور مذہبی حالت کی نسبت انگلستان کے ایک عالی رتبہ اور ذی علم شخص کی رائے سے ان کو مطلع کیا۔

مصنف نے یہ کتاب صرف اپنے ہم ملکوں اور بالخصوص پارلیمنٹ انگلستان کو اسلام کے حالات پر توجہ دلانے کے لیے تصنیف کی تھی۔ ان کا یہ مقصود نہ تھا کہ یہ کتاب ہندوستان میں شائع ہو یا اس کا ترجمہ کیا جائے۔ مسٹر حمید اللہ سلمہ اللہ نے ایک جلد کتاب انگلستان سے اپنے پدر عالی مرتبہ مولوی سمیع اللہ خاں صاحب کے ملاحظے کو بھیج دی تھی۔ مولوی صاحب ممدوح کی اجازت سے میں نے اس کتاب کو پڑھا اور اس کے مضامین نے اس کے ترجمے پر مجھ کو مجبور کیا۔ ہنوز ترجمہ ختم نہ ہوا تھا کہ مسٹر بلنٹ خود ہندوستان میں تشریف لائے اور بمقام کلکتہ مجھ کو ان سے ملنے کی عزت حاصل ہوئی۔ انہوں نے ایک دوسرا دیباچہ بطور ضمیمہ دیباچہ اول کے تحریر فرما کر مجھ کو دیا، جس کا ترجمہ میں اس کتاب

کے ساتھ شامل کرتا ہوں۔ سلطنت ٹرکی کے قائم رہنے کی نسبت مصنف کو جو مایوسی تھی، یہ دیباچہ اس مایوسی کو ضعیف کرتا ہے۔ مصنف نے مجھ سے یہ بھی فرمایا کہ سلطنت ٹرکی کی نسبت بعض اطلاعیں ان کو خود علمائے مصر و عرب سے حاصل ہوئی ہیں اور وہ ان کی صحت کے ذمہ دار نہیں ہیں...

جہاں تک ممکن تھا، میں نے لفظی ترجمہ کیا ہے اور مصنف کے سلسلہ خیالات کو ذرا بھی برہم نہیں ہونے دیا۔ فقروں کی ترکیب کی پیچیدگی دور کی ہے، معانی کو کامل اور روشن کرنے کے لیے ایک لفظ کے ترجمے میں حسب ضرورت دو دو اور تین تین لفظ لکھ دیے ہیں۔ لیکن خیالات پیچیدہ کا سہل کرنا میرا کام نہ تھا۔ بااین ہمہ ناظرین کتاب سے امید ہے کہ میری بے بضاعتی اور کم فرصتی کے لحاظ سے وہ مجھ کو معذور رکھیں گے، اگر اس ترجمے میں کچھ غلطیاں پائی جائیں۔ چھاپے اور کتابت کی غلطی تو ایک ضروری چیز ہے۔" (۱۳۴)

اردو زبان میں غیر ملکی زبانوں سے بہت سی کتابیں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ ترجمہ ایک مشکل فن ہے اور ہر اچھے ترجمے میں دو خصوصیات ہونی چاہئیں: (الف) وہ اصل کے زیادہ سے زیادہ قریب ہو اور مصنف کے خیالات ہی کا نہیں، اس کے اسلوب کا پرتو بھی اس پر برابر پڑتا ہو۔ (ب) جس زبان میں ترجمہ کیا جا رہا ہو اس کا مزاج اور محاورہ برقرار رہے اور محض لفظی ترجمہ ہو کر نہ رہ جائے۔ ان دونوں پابندیوں کے ساتھ ترجمہ کرنا صرف کسی ایسے شخص کا کام ہو سکتا ہے جسے دونوں زبانوں پر قدرت حاصل ہو۔

اکبر کا ترجمہ ان شرائط پر کہاں تک پورا اترتا ہے؟ اس پر رائے زنی سے پہلے دو اقتباسات کا مقابلہ اصل عبارت سے کیا جاتا ہے۔ پہلے انگریزی اور اس کے بعد اردو ترجمہ دیکھیے:

"These Essays, written for the fortnightly Review in the summer and autumn of 1881, were intended at first sketches only of a maturer work which the author hoped, before giving finally to the public, to complete at leisure and develop in a form Worthy of critical acceptance and of great subject he had chosen. Events, however, have marched faster than he at all anticipated and it has become a matter of importance with him that the idea they were designed to illustrate, should be given immediate

and full publicity. The French by their invasion of Tunis, have precipitated the Mohammedan movement in North-Africa; Egypt has roused herself for a great effort of National and religious reforms; and on all sides Islam is seen to be convulsed by political portents of ever growing intensity."(135)

"مصنف کو امید تھی کہ قبل شائع کرنے ان مضامین کے اپنے اوقات فرصت میں ایک ایسی تصنیف کرے گا جو بلحاظ اپنی ترتیب اور تکمیل کے نکتہ چینوں کی مقبولی کے لائق اور اس عالی شان بحث کے شایان ہو جس کو اس نے منتخب کیا تھا۔ چنانچہ یہ مضامین اخبار "فورٹ نا ئٹلی ریویو" کے لیے صرف اس تصنیف کے ابتدائی مسودات کے طور پر ۱۸۸۱ء موسم تابستان و خزاں میں لکھے گئے تھے۔ لیکن وقوع واقعات نے ایسی تیز رفتاری کی جس کا اس کو پیشتر سے کچھ بھی خیال نہ تھا اور مصنف کے لیے یہ امر ضروری ہو گیا کہ جن خیالات کا ان مضامین سے اظہار مقصود ہے' ان خیالات کو فی الفور پوری شہرت دے دے۔ اہل فرانس نے ٹیونس پر حملہ کر کے شمالی افریقہ میں مسلمانوں کی حرکت و شورش پیدا کرنے میں جلدی کر دی۔ مصر نے قومی اور مذہبی اصلاح میں ایک بڑی کوشش کے لیے برا نگیختگی پیدا کی ہے اور ہر طرف اسلام پولٹیکل بدفالیوں سے' جن کی شدت اور سختی بڑھتی ہی چلی جاتی ہے' تہ و بالا اور پیچ و تاب میں نظر آتا ہے۔"(۱۳۶)

دوسرا اقتباس:

We, in India, as I have said in our grand careless way, leave all these things to chance. India, nevertheless, still holds the first rank in the Haj, and all things considered, is now the most important land where the Mohammedan faith is found.In the day of its greatness the Moghal Empire was second to no state in Islam, and though its political power is in abeyance, the religion itself is by no means in decay. India has probably a closer connection at the present moment with Mecca than any other

country, and it is looked upon by many there as the Musalman land of future. Indeed it may safely be affirmed that the course of events in India will determine more than any thing else the destiny of Mohammedanism in the immediate future of this and the next generation. (137)

"ہم لوگوں نے ہندوستان میں نہایت لاپروائی سے ان تمام باتوں کو اتفاقات پر چھوڑ دیا ہے- لیکن تاہم اب تک حج میں ہندوستان کا اول درجہ ہے اور بلحاظ جمیع حالات کے سرزمین ہند ایک اعظم ترین مقامات سے ہے' جہاں دین محمدی موجود ہے- اپنی عظمت و شوکت کے زمانے میں شہنشاہی مغلیہ کسی سلطنت اسلامیہ سے دوسرے درجے پر نہ تھی اور اگرچہ پولٹیکل قوت معرض التوا میں ہے لیکن مذہب کو یہاں کسی قسم کا انحطاط نہیں ہے- غالبًا اس وقت ہندوستان کو بہ نسبت اور کسی ملک کے مکہ سے قریب تر تعلق ہے اور وہاں سے اکثر لوگ مکہ کو بطور آیندہ سرزمین اسلام کے دیکھ رہے ہیں- اور بلاشبہ بھروسے کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ بہ نسبت اور کسی امر کے زیادہ تر ہندوستان ہی کی صورت معاملات پر تصفیہ اس کا منحصر ہو گا کہ عین مابعد نسل موجودہ اور نسل آئندہ کے اسلام کی قسمت میں کیا ہے-" (۱۳۸)

ان دونوں اقتباسات کے مطالعے اور انگریزی متن کے ساتھ مقابلے سے چند بدیہی نتیجے نکلتے ہیں- ایک یہ کہ ترجمہ اصل سے بہت قریب ہے- اس قدر قریب کہ ایک آدھ فالتو لفظ کے سوا مترجم نے کسی لفظ کو ترجمہ کیے بغیر نہیں چھوڑا- ان دونوں اقتباسات میں صرف ایک ٹکڑے یعنی As I have said کا ترجمہ نہیں کیا گیا- اس کے سوا کوئی لفظ رہ نہیں گیا- دوسری بات یہ ہے کہ مصنف کے اسلوب کو مترجم نے پوری طرح برقرار رکھا ہے- اس کے طویل جملوں اور وقف کی علامتوں کو اسی طرح رہنے دیا ہے- تیسری بات یہ ہے کہ ایک آدھ مترادف لفظ کے اضافے کے سوا مترجم نے عبارت میں کوئی اضافہ نہیں کیا- مترادفات کی صورت یہ اختیار کی ہے کہ مثلاً Precipitated کا ترجمہ حرکت و شورش کیا ہے- Intensity کا ترجمہ شدت اور سختی کیا ہے- Greatness کے لیے عظمت و شوکت کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں- اگرچہ بہتر یہی تھا کہ کوئی ایک موزوں لفظ اختیار کیا

جاتا، مگر مترجم کی دقتوں کا اندازہ صرف اسی صورت میں کیا جا سکتا ہے اگر خود ترجمہ کرنے کی کوشش کی جائے۔ ان تین مثالوں میں بالخصوص دو ایسی ہیں کہ ان کے لیے کوئی موزوں لفظ تلاش کرنا بہت مشکل ہے۔ پھر یہ بھی خیال رہے کہ ترجمہ سو سال سے زیادہ عرصہ پہلے کیا گیا ہے، جب اردو میں بہت کم اچھے تراجم موجود تھے۔ اس ترجمے کے مطالعے سے صرف ایک خواہش پیدا ہوتی ہے کہ جہاں لفظ سے لفظ ملانے میں اکبر نے اتنی محنت کی ہے، وہاں تھوڑی سی اور کاوش کر کے اسے زیادہ رواں بنایا جا سکتا تھا۔

اکبر نے بلنٹ کی کچھ اور تحریروں کو بھی اردو میں منتقل کیا ہے۔ طالب الہ آبادی لکھتے ہیں:

"اکبر صاحب کی نثر میں پانچ کتابیں موجود ہیں۔ "فیوچر آف اسلام" (اور) مضامین متعلقہ ہند کے چار حصے... تین حصص یعنی اول، دوم اور چہارم میرے قبضے میں ہیں۔ تیسرا حصہ سخت جستجو کے باوجود ابھی تک دستیاب نہیں ہوا۔ یہ سب رسائل چالیس چالیس، پچاس پچاس صفحات کے ہیں اور ولفرڈ اسکاون بلنٹ اور لیڈی بلنٹ کے ایڈریس جو ان کو مختلف مقامات پر دیے گئے، مضامین اور تقاریر جو انہوں نے ہندوستان کے (؟) مختلف موقعوں پر کیں۔ جوابات، اعتراضات اور رد اعتراضات کا مجموعہ ہیں جسے اکبر صاحب نے تراجم اور تالیف کی مدد سے کافی محنت کے بعد منطقی ترتیب سے جمع کر دیا ہے۔ حصہ اول و چہارم خصوصیت سے دیکھنے کے قابل ہے۔"

نادم سیتا پوری اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

"میرے پاس اس کتاب کا صرف حصہ اول ہی ہے حالانکہ تمہید سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے علاوہ اس کے تین حصے اور بھی ہیں۔"(۱۳۹) اس مضمون میں انہوں نے حصہ اول کے بارے میں یہ معلومات بھی درج کی ہیں اس کے ٹائٹل پر یہ عبارت ہے: "سلسلہ مضامین متعلقہ ہند مسٹر ولفرڈ بلنٹ کی اسپیچیں در باب تعلیم مذہبی اور وہ ایڈریس جو مسلمانان ہند کی جانب سے ان کو دیے گئے۔"(۱۴۰)

یہ حصہ چالیس صفحات پر مشتمل ہے۔ ستمبر ۱۸۸۶ء میں سید المطابع میرٹھ سے چھپا۔ کتاب کے سرورق پر ۱۵ ستمبر ۱۸۸۶ء کی تاریخ پڑی ہوئی ہے۔ اس حصے میں صرف ترجمے ہی نہیں ہیں، بعض اردو اخبارات سے کارروائی اور تقاریر کے خلاصے بھی نقل کر دیے گئے ہیں۔(۱۴۱)

اکبر کی نثر مقدار میں ان کی شاعری سے کسی طرح کم نہیں، جیسا کہ تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے۔ ان کے مکاتیب کے مستقل مجموعے تعداد میں چھ ہیں۔ اس کے علاوہ غیر مدون مکاتیب جو مختلف رسائل اور اخبارات میں بکھرے پڑے ہیں، ان کی تعداد بھی سینکڑوں تک پہنچتی ہے۔ غیر مطبوعہ مکاتیب اتنے زیادہ ہیں کہ ان سے کئی مجموعے مرتب ہو سکتے ہیں۔ ان تمام مکاتیب کو دیکھتے ہوئے یہ دعویٰ غلط نہیں ہو گا کہ اکبر نے اپنے دوستوں، عزیزوں اور بزرگوں وغیرہ کو جتنے مکاتیب لکھے ہیں، اتنے اردو کے کسی اور نامور شاعر یا ادیب نے نہیں لکھے۔ اگرچہ اکبر کے مکاتیب عموماً مختصر ہوتے ہیں، لیکن کوئی خاص وجہ ہو تو طویل خط بھی لکھتے ہیں۔ بیشتر مکتوبات اگرچہ روزمرہ ضرورتوں کے بیان تک محدود ہیں، تاہم بعض خطوں میں ایسی خصوصیات موجود ہیں کہ انہیں نہایت عمدہ ادبی نمونے قرار دیا جا سکتا ہے۔ صحت زبان اور پختگی اسلوب میں ان مکاتیب کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ خطوط کے علاوہ اکبر نے بہت سے مضامین بھی لکھے ہیں جن میں سے اکثر "اودھ پنچ" میں شائع ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ "زمانہ" "معارف" "پیسہ اخبار" "مخزن" وغیرہ میں بھی کبھی کبھار مضمون لکھتے تھے۔ "اودھ پنچ" کی مکمل فائلیں اگر دستیاب ہو جائیں تو مزید مضامین مل سکیں گے۔ مجھے جس قدر پرچے مل سکے ہیں ان سے چالیس مزاحیہ مضامین حاصل ہوئے ہیں۔ دیگر پرچوں سے چند تنقیدی مضامین ملے ہیں۔ مزاحیہ مضامین "اودھ پنچ" کے نثر نگاروں کے طرز میں ہیں، مگر ان میں اس قدر تصنع نہیں جو اس کے بعض دوسرے مضمون نگاروں کے ہاں ملتا ہے، تاہم لفظی تناسبات اور قافیے کے استعمال سے یہ بھی "کلیتاً" خالی نہیں۔ بہرحال اردو میں مزاح نگاری کی تاریخ میں انہیں اولیت کا درجہ حاصل ہے، اس لیے یہ نہایت قابل قدر ہیں۔ اکبر بطور مترجم بھی نظرانداز کیے جانے کے قابل نہیں۔ انہوں نے بلنٹ کی دو کتابوں یعنی "اسلام کی حالت آئندہ" اور "مضامین متعلقہ ہند" کے ترجمے کیے جو اس لحاظ سے منفرد ہیں کہ لفظی ترجمے ہونے کے باوصف اردو زبان کے مزاج سے دور نہیں ہٹے۔ نثر کی اس مقدار اور معیار کے پیش نظر اکبر الہ آبادی کا شمار بھی غالب، حالی، شبلی اور اقبال کی صف میں ہونا چاہیے جو یک فنے نہیں ہیں، بلکہ نثر اور شاعری دونوں میدانوں میں کامیاب ہیں۔

حواشی

۱- تاریخ ادب اردو، مترجم مرزا محمد عسکری، صفحہ ۴۳۳-۳۷۵
۲- غالب سے قبل بھی بعض اردو، مکاتیب لکھے گئے، مثلاً رجب علی بیگ سرور کے خطوط، مگر وہ چنداں اہم نہیں اور قدیم انداز کے ہیں-
۳- غالب کے معاصرین میں مفتی صدرالدین آزردہ، غلام غوث بے خبر اور واجد علی شاہ اختر (نواب اودھ) کے خطوط کے مجموعے بھی چھپ چکے ہیں مگر وہ غیر اہم ہیں-
۴- دیباچہ نگار سنہ کا اندراج کرنا بھول گئے ہیں (م- ز)-
۵- "مکاتیب اکبر" مطبوعہ دائرۂ ادبیہ لکھنؤ، ۱۹۲۲ع (طبع اول)، صفحہ ۱۱،۱۲
۶- یہ مجموعہ آج تک نہیں چھپ سکا-
۷- "مکتوبات اکبر" مطبوعہ مرغوب ایجنسی لاہور، طبع اول (س-ن)، صفحہ ۴-
۸- "حضرت اکبر حسین اور مہاراجہ کشن پرشاد کی خط و کتابت" مرتبہ خواجہ حسن نظامی، صفحہ ۱۳-
۹- مجموعے کے مرتب محمد نصیرالدین ہمایوں-
۱۰- طبع ثانی کی نوبت تو آئی مگر اس وقت تک سر عبدالقادر چل بسے تھے- (م-ز)-
۱۱- "رقعات اکبر" مرتبہ محمد نصیر ہمایوں، طبع اول (س-ن)، صفحہ ۴-
۱۲- خطوط مشاہیر، مرتبہ عبدالماجد دریابادی، طبع اول، نومبر ۱۹۴۴ع، صفحہ ۳۸-
۱۳- بحوالہ "مکاتیب اکبر"، لکھنؤ، صفحہ ۹-
۱۴- اردو کورس ساتویں جماعت کے لیے، مرتبہ ڈاکٹر سر محمد اقبال و حکیم احمد شجاع (۱۹۲۴ع)-
۱۵- اس سے پہلے شرف الدین نے اکبر سے ان کے مکاتیب کا مجموعہ شائع کرنے کی اجازت مانگی تھی مگر اکبر نے ٹال دیا تھا- ملاحظہ ہو "مکاتیب اکبر" بنام عزیز لکھنوی، صفحہ ۱۹۱-
۱۶- نگار پاکستان، کراچی، اکبر الہ آبادی نمبر، ۱۹۶۹ع، مرتبہ فرمان فتح پوری، صفحہ ۱۳۲-
۱۷- اتالیق خطوط نویسی، اشاعت چہارم، نومبر ۱۹۲۹ع، صفحہ ۴۳-۴۴-
۱۸- اتالیق خطوط نویسی، صفحہ ۴۶-
۱۹- نیشنل میوزیم کراچی سے مجھے مہاراجہ کشن پرشاد کے سولہ خطوط اکبر کے نام ملے ہیں- اگر ان نو خطوں میں ان سولہ غیر مطبوعہ خطوط کو جمع کیا جائے تو مہاراجہ کشن پرشاد کے خطوط کی تعداد بھی اکبر کے خطوط کے برابر یعنی پچیس ہو جاتی ہے- گویا مہاراجہ کے خطوط اور ان سب خطوط کے جواب اکبر کی جانب سے اکٹھے ہو جاتے ہیں- مہاراجہ کشن پرشاد کے خطوط نفیس اور دبیز کاغذ پر قلم سے بہت خوبصورت خط میں لکھے گئے ہیں-
۲۰- نگار (پاکستان)، کراچی، اکبر الہ آبادی نمبر، ۱۹۶۹ع، صفحہ ۱۳۲-

۲۱- نقوش، لاہور، مکاتیب نمبر، شمارہ ٦٦ - ٦٥، نومبر ۱۹۵۷ء-
۲۲- نقوش، لاہور، مکتوبات نمبر، شمارہ ۱۰۹، اپریل، مئی ۱۹٦۸ء-
۲۳- نظام المشائخ، کراچی، جلد ۸٦، شمارہ ۱، جنوری ۱۹۵۲ء-
۲۴- قومی زبان، کراچی-
۲۵- ملاحظہ ہو ضمیمہ ۳- اس میں بعض غیر مطبوعہ خطوط درج کیے گئے ہیں-
۲٦- غالب نے ۱۸۵۸ء میں منشی ہر گوپال تفتہ اور شونرائن آرام کے تقاضے پر کم و بیش یہی جواب لکھا تھا-
۲۷- مکاتیب اکبر بنام مرزا ہادی عزیز، لکھنؤ ۱۹۲۲ء، صفحہ ۱۷۸-
۲۸- مکتوبات اکبر بنام مرزا ہادی عزیز، لکھنؤ ۱۹۲۲ء، صفحہ ۱۸۰-
۲۹- مکتوبات اکبر بنام مرزا سلطان احمد، لاہور، صفحہ ٦٦-
۳۰- اکبر کے مکاتیب سے اس کی تصدیق ہوتی ہے:
(الف) یہ مضمون آپ کو بھیجنا تھا، ردی پر لکھ دیا (خطوط مشاہیر)-
(ب) میں غلطی سے یہ خط ردی کاغذ پر لکھ گیا، معاف فرمائیے گا-
(مکتوبات اکبر، صفحہ ۴۱)-
۳۱- علی گڑھ میگزین، اکبر نمبر-- خطوط اکبر، صفحہ ۷-

32- Letters of Great writers: Edited Rev. Hedley V.Tayler, London (First Edi.- N.D.)

۳۳- رقعات اکبر، صفحہ ۱۵ (بنام سید سلیمان ندوی)-
۳۴- ایضاً، صفحہ ۲۸-
۳۵- رقعات اکبر، صفحہ ۵۸ (بنام سید افتخار حسین)-
۳٦- ایضاً، صفحہ ۵۹-
۳۷- ایضاً، صفحہ ٦۸-
۳۸- رقعات اکبر، صفحہ ۹۴ (بنام کشن پرشاد شاد)-
۳۹- رقعات اکبر، صفحہ ۱۲۲(بنام شرف الدین رامپوری)-
۴۰- ایضاً، صفحہ ۱۲۷-
۴۱- مکاتیب اکبر، صفحہ ۱۹۹ (بنام عزیز لکھنؤی)-
۴۲- ایضاً، صفحہ ۲۰۳-
۴۳- ایضاً، صفحہ ۲۱۱-
۴۴- خطوط اکبر، صفحہ ۱۵٦ (بنام خواجہ حسن نظامی)-
۴۵- خطوط اکبر، صفحہ ۱۷۲-
۴٦- خطوط مشاہیر، صفحہ ۲۱۰ (بنام عبدالماجد دریابادی)-
۴۷- تنقیدی اشارے، از آل احمد سرور، تیسرا ایڈیشن، ۱۹۵۵ء (لکھنؤ)، صفحہ ٦۷-

۴۸- ان خطوط کی تحریر کے زمانے میں شبلی ۴۰ سال کے تھے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے "مکاتیب شبلی کا تاریخی جائزہ"

۴۹- قصہ یہ ہے کہ سرور صاحب کے تنقیدی مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اکبر کو ناپسند کرتے ہیں (ملاحظہ ہو "اکبر کا المیہ" وغیرہ) یہ دراصل ان کی ناپسندیدگی کا تحت شعوری اظہار ہے۔

۵۰- تنقیدی اشارے، صفحہ ۶۷۔

۵۱- محمد حسین آزاد نے Wit کا ترجمہ ذکاوت کیا ہے (نیرنگ خیال)۔

۵۲- خطوط مشاہیر، صفحہ ۱۳۲۔

۵۳- رقعات اکبر، صفحہ ۲۹۔

۵۴- رقعات اکبر، صفحہ ۷۱۔

۵۵- رقعات اکبر، صفحہ ۷۹۔

۵۶- خطوط اکبر (بنام حسن نظامی)، صفحہ ۳۵۔

۵۷- ایضاً، صفحہ ۵۴۔

۵۸- ایضاً، صفحہ ۷۱۔

۵۹- ایضاً، صفحہ ۱۵۔

۶۰- خطوط مشاہیر، صفحہ ۸۸۔

۶۱- خطوط مشاہیر، صفحہ ۱۳۶۔

۶۲- خطوط اکبر (بنام حسن نظامی)، صفحہ ۴۶۔

۶۳- ایضاً، صفحہ ۹۴۔

۶۴- یہ کپلنگ کے مشہور عالم الفاظ کی طرف اشارہ ہے کہ ہم غیر متمدن اقوام کو مہذب بنانے کے لیے ان پر حکومت کرتے ہیں۔ اور یہ حکومت دراصل بوجھ ہے جو ہم تہذیب کی خاطر برداشت کیے ہوئے ہیں۔ اکبر نے ایک شعر میں بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے:

بار احساں جسے کہتے ہیں وہ ہے کوہ جفا
کاش نادم ہوں یہ احسان جتانے والے

۶۵- مکاتیب اکبر (بنام عزیز لکھنوی)، صفحہ ۶۵۔

۶۶- ایضاً، صفحہ ۶۶۔

۶۷- مرزا یاس یگانہ چنگیزی۔

۶۸- مکاتیب اکبر صفحہ ۱۳۸۔

۶۹- خواجہ حسن نظامی نے لکھا تھا کہ کسی شخص کو قبلہ و کعبہ لکھنا برا معلوم ہوتا ہے۔ اس پر کسی نے اعتراض کیا جس پر اکبر نے یہ لطیفہ وضع کیا۔

۷۰- خطوط اکبر (بنام خواجہ حسن نظامی)، صفحہ ۵۴۔

۷۱- رقعات اکبر (خط بنام سید سلیمان ندوی)، ۶۱۔

۷۲- رقعات اکبر (ایضاً)، صفحہ ۲۴-
۷۳- رقعات اکبر (خط بنام سید افتخار حسین)، صفحہ ۶۷-
۷۴- رقعات اکبر (خط بنام کشن پرشاد)، صفحہ ۹۴-
۷۵- مکاتیب اکبر (بنام مرزا ہادی عزیز لکھنوی)، صفحہ ۶۹-
۷۶- مکاتیب اکبر (عبدالماجد دریابادی)، صفحہ ۱۱-
۷۷- خطوط مشاہیر، صفحہ ۱۲۱-
۷۸- خطوط مشاہیر، صفحہ ۱۳۷-
۷۹- مکاتیب اکبر (بنام عزیز لکھنوی) صفحہ ۱۸۵-
۸۰- مراد شیعہ کالج لکھنؤ جو علی گڑھ کالج کے مقابلے میں شیعہ حضرات نے قائم کیا تھا۔
۸۱- ان جملوں کا مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں میں پہلے ہی یکجائی نہیں ہے۔ اس لیے اگر شیعہ کالج کے الگ ہونے سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں میں افتراق پیدا ہو گا وہ غلطی پر ہیں۔ جب یکجائی موجود نہیں تو افتراق کا سوال ہی کیا ہے۔ مقصد دونوں فرقوں کا یکجائی نہیں، انگریزوں سے تعلقات بہتر بنانا ہے۔ اکبر نے ایک قطعے میں بھی انہی خیالات کا اظہار کیا ہے:

بنائے کالج شیعہ الگ ہوئی بھی تو کیا
وہی ہے منزل مقصود گو ہے راہ جدا
برائے دولت و آنر ہے ایک ہی مرکز
نہیں ہے اب بھی طریق حصول جاہ جدا
وہ شیخ کی تھی ترقی یہ مجتہد کا عروج
نئے طریق کے ہیں خوب دو گواہ جدا
شب وصال کے نغمے الگ چھڑے دو سمت
جنہیں ہے ہجر وہ کر لیں گے اپنی آہ جدا

۸۲- مکاتیب اکبر (بنام عزیز لکھنوی)، صفحہ ۱۱۰-
۸۳- رقعات اکبر، صفحہ ۴۷-
۸۴- اکبر کے شب روز، مرتبہ محمد رحیم دہلوی، مکتبہ رضیہ کراچی (س-ن)، صفحہ ۷۸-۷۹-
۸۵- مکاتیب اکبر (بنام عبدالماجد دریابادی)، صفحہ ۵۲-
۸۶- رقعات اکبر، صفحہ ۵۶-
۸۷- رقعات اکبر، صفحہ ۵۹-
۸۸- خطوط اکبر، صفحہ ۱۴-
۸۹- خطوط اکبر، صفحہ ۳۰- ۳۱-
۹۰- خطوط اکبر، صفحہ ۸۱-

۹۱- خواجہ حسن نظامی نے مرض الموت میں ان کا ایک واقعہ یوں بیان کیا ہے:
"زندگی کی آخری رات کو ہوش آیا تو اٹھ بیٹھے اور فرمایا کہ عینک لاؤ- قرآن شریف لاؤ- میں پڑھوں گا- کہا گیا رات ہے، صبح تلاوت فرمایئے گا... ارشاد ہوا کہ اب تک میری کوئی نماز تہجد سمیت قضا نہیں ہوئی ہے، نہ تلاوت کو ناغہ کیا ہے-" (زمانہ : ستمبر ۱۹۲۱ء)-

۹۲- رقعات اکبر، صفحہ ۲۷-

۹۳- خطوط اکبر، (بنام حسن نظامی)، صفحہ ۲۳-

۹۴- خطوط مشاہیر، صفحہ ۳۹-

۹۵- خطوط مشاہیر، صفحہ ۶۲-

۹۶- ایضاً، صفحہ ۸۸-

۹۷- ایضاً، صفحہ ۱۰۸-

۹۸- ایضاً، صفحہ ۱۲۱-

۹۹- ایضاً، صفحہ ۱۳۹- ۱۴۰-

۱۰۰- مکتوبات اکبر (بنام مرزا سلطان احمد) صفحہ ، ۴۱- ۴۲-

۱۰۱- خطوط اکبر (بنام خواجہ حسن نظامی)، صفحہ ۱۰۶-

۱۰۲- خطوط مشاہیر، صفحہ ۱۲۷-

۱۰۳- خطوط اکبر (بنام خواجہ حسن نظامی)، صفحہ ۲۲-

۱۰۴- خطوط اکبر (بنام خواجہ حسن نظامی)، صفحہ ۴۶-

۱۰۵- خطوط مشاہیر، صفحہ ۴۲-

۱۰۶- خطوط مشاہیر، صفحہ ۴۳-

107- Happiness

108- Mysry

۱۰۹- مراد ہے مولانا ابوالکلام آزاد اور ان کے ہم خیالوں سے جن کے ہاں قواعد اور عربیت پر زیادہ زور تھا-

۱۱۰- خطوط مشاہیر، صفحہ ۵۴-

۱۱۱- ایضاً، صفحہ ۵۵-

۱۱۲- ایضاً، صفحہ ۸۹-

۱۱۳- مکاتیب اکبر (مرتبہ عزیز لکھنوی)، صفحہ ۴۸-

۱۱۴- ایضاً، صفحہ ۴۹-

۱۱۵- مکاتیب اکبر (مرتبہ عزیز لکھنوی)، صفحہ ۴۹-

۱۱۶- ایضاً، صفحہ ۵۰-

۱۱۷- ایضاً، صفحہ ۷۱-

۱۱۸- خطوط مشاہیر، صفحہ ۱۱۶-

۱۱۹- ایضاً' صفحہ ۱۳۶-
۱۲۰- افسوس اس کی تفصیل قارئین کو معلوم نہیں ہو سکی-
۱۲۱- مکاتیب اکبر (حصہ دوم)' عبدالماجد دریابادی' صفحہ ۱۰۴-
۱۲۲- میرزا واجد حسین یاس یگانہ چنگیزی-
۱۲۳- مکاتیب اکبر (بنام عزیز لکھنوی)' صفحہ ۱۳۸-
۱۲۴- مکاتیب اکبر (بنام عبدالماجد دریابادی)' صفحہ ۶۶-
۱۲۵- اکبر کے شب و روز' صفحہ ۱۵۸-
۱۲۶- رقعات اکبر' مرتبہ محمد نصیر ہمایوں' صفحہ ۹۳-
۱۲۷- رقعات اکبر' مرتبہ محمد نصیر ہمایوں' صفحہ ۱۴۰ (بنام سر عبدالقادر)-
۱۲۸- خطوط اکبر (بنام خواجہ حسن نظامی)' صفحہ ۱۲۰-
۱۲۹- نقوش' لاہور' مکاتیب نمبر' صفحہ ۳۱-
۱۳۰- تاریخ ادب اردو' رام بابو سکسینہ (اردو ترجمہ)' صفحہ ۱۰۲-
۱۳۱- اکبر الہ آبادی' از طالب آبادی' صفحہ ۴۷-
۱۳۲- مکاتیب اکبر (بنام عبدالماجد دریابادی)' صفحہ ۶۶-
۱۳۳- ایضاً' صفحہ ۶۸- لیکن اکبر مرزا پور میں ۱۳ اپریل ۱۹۰۰ء سے ۲۸ اکتوبر ۱۹۰۰ء تک سیشن جج رہے اس لیے مضمون ۱۹۰۰ء میں لکھا گیا-
۱۳۴- فیوچر آف اسلام' از اکبر الہ آبادی' مطبع جماعت تجارت متفقہ اسلام میرٹھ' صفحات ۳' ۴' ۵-

135- The Future of Islam : Wilfrid Scawen Blunt : London (1882) p.v

۱۳۶- فیوچر آف اسلام (اردو ترجمہ)' صفحہ ۷-

137- The Future of Islam : Blunt, page 32.

۱۳۸- فیوچر آف اسلام (اردو ترجمہ)' صفحہ ۲۵-
۱۳۹/۱۴۰- مضمون "اکبر الہ آبادی کی دو غیر معروف کتابیں" مطبوعہ ہماری زبان' علی گڑھ (۲۲ دسمبر ۱۹۶۱ء)
۱۴۱- ۱۹۷۳ء میں نادم سیتاپوری سے کراچی میں ملاقات ہوئی تو انہوں نے فرمایا کہ یہ کتاب ان کے پاس بھارت میں تھی- کراچی میں نہیں ہے-

ضمیمے

ضمیمہ ا

عدالتی فیصلے

اکبر الہ آبادی نے ۱۸۸۰ء میں جوڈیشل سروس کا آغاز کیا' سب سے پہلے وہ مرزا پور میں منصف درجہ سوم مقرر ہوئے۔ بعد میں سب جج' ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج اور جج عدالت خفیفہ وغیرہ کے عہدوں پر کام کیا۔ اس عرصے میں انھوں نے ہزاروں مقدمات کے فیصلے لکھے۔ قومی عجائب خانہ کراچی سے مجھے اکبر کا ایک دلچسپ عدالتی فیصلہ دستیاب ہوا ہے جو فل سکیپ کے چھ صفحات پر مشتمل ہے۔ (دستاویز کا نمبر این۔ ایم۔ ۲۰۰ء ۱۹۵۸ء ہے)۔

ذیل میں یہ نایاب اور دلچسپ فیصلہ درج کیا جاتا ہے:

"عدالت مطالبات خفیفہ الہ آباد

باجلاس خان بہادر، سید اکبر حسین صاحب جج بہادر

محمد خان مدعی: بابو بھگوان داس وکیل

احمد جان خان وغیرہ مدعا علیہم: مولوی سید محمد مہدی وکیل

تجویز عدالت:

اس مقدمے میں مدعی سو روپے ہرجہ کا دعوئی کرتا ہے۔ اس کو یہ شکایت ہے کہ مدعا علیہم کے مکان میں دو حوض ہیں اور وہ مدعی کی دیوار کے نیچے ہیں۔ ان حوضوں کے پانی سے مدعی کی دیواروں کو صدمہ پہنچا۔ مدعا علیہم کا جواب ہے کہ انھوں نے کوئی فعل بیجا نہیں کیا اور حوض بہت دن کے ہیں۔ اس سال بارش بہت زیادہ ہوئی۔ بہت سے مکانوں کو ضرر پہنچا۔ ازاں جملہ مدعی کے مکان کو بھی۔

حسب درخواست مدعی میں نے موقع کا ملاحظہ کیا۔ بعد اس کے شہادت قلمبند کی اور فریقین کی بحثیں سنیں اور جو نظیریں پیش کی گئیں وہ پڑھیں اور مقدمے کی حالات پر ہر پہلو سے غور کیا۔ مقدمہ بے شک کسی قدر مشکل اور غیر معمولی ہے' لیکن جو رائے میں نے قائم کی ہے اس کی صحت میں مجھ کو کچھ پس و پیش نہیں ہے۔

امور تنقیح طلب یہ ہیں:

(۱) آیا مدعا علیہم کے کسی فعل یا ترک فعل بیجا سے مدعی کو کچھ ضرر پہنچا اور مدعی مستحق ہرجہ ہے یا نہیں؟

(۲) کس قدر ہرجے کا مدعی مستحق ہے؟

فیصلہ امور تنقیح طلب:

یہ مسلمہ مسئلہ قانون کا ہے کہ ہر شخص اپنی چیز کو کام میں لا سکتا ہے، لیکن نہ اس طرح کہ بیجا طور پر دوسرے کی چیز کو ضرر پہنچاوے۔ مدعا علیہم کے مورث نے مدعی کی دیوار کے نیچے دو حوض بنائے۔ وہ حوض تو پکے بنے اور ان کے کنارے بھی پکے بنائے گئے لیکن مدعی کی دیوار کچی تھی۔ جس جگہ حوض کا کنارہ مدعی کی دیوار سے ملا، وہاں ایک جوف باریک قائم ہو گیا۔ اگر دوسروں کے حق کا خیال دل میں موجود ہو تو یہ بات بخوبی سمجھ میں آ سکتی ہے کہ اگر حوض میں کبھی پانی لبالب بھرا تو ایک کنارہ پانی کی چادر کا مدعی کی دیوار سے ملحق ہو گا اور جوف میں پانی جذب ہو گا۔ پانی ایک ایسا رقیق سیال ہے کہ بہت مشکل سے اس کے ذرات کا نفوذ رک سکتا ہے، اور پھر کچی دیوار میں جو بہت ہی مسامدار ہے۔ اگر اس وقت احتیاط کی جاتی اور کم سے کم ایک بالشت دیوار مدعی کو مدعا علیہم اس حوض کے ساتھ پختہ کر دیتے تو یہ خطرہ جاتا رہتا۔ یہ سچ ہے کہ اس حوض کو بنے ہوئے مدت گزر گئی۔ سولہ برس ہوئے یا بیس برس —— رجب حسین خان ایک شوقین نواب زادے نے مچھلیاں پالنے کو بنایا تھا، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ مدعی کے دعوے میں حد سماعت عارض ہو گئی - مدعی حوض کھدوا پانے کا دعویٰ نہیں کرتا۔ شاید ابتداء وہ ایسا دعویٰ کرتا تو جواب دیا جاتا کہ ہم مالک ہیں، ہماری زمین ہے، ہم اپنی زمین پر جس طرح چاہتے ہیں تعمیر و تصرف کرتے ہیں، تمہارا کیا ہرج ہے؟ تم کو کیا نقصان پہنچتا ہے؟ تم کو تو جب بنائے دعویٰ پیدا ہو گی جب کوئی نقصان پہنچے۔

غالبًا یہ معقول جواب ہوتا۔ شاید اس بحث کا یہ نتیجہ ضرور ہوتا کہ مورث مدعا علیہم کی توجہ حفاظت حق مدعی کی طرف رجوع ہو جاتی اور آئندہ کے لیے احتیاط عمل میں آتی، لیکن ایسا نہ ہوا۔ مدعی بے فکر و بے پروا بیٹھا رہا۔ اب اس کو ضرر پہنچ گیا تو عدالت میں دوڑا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ یہ ضرر ایک دن کا نہیں ہے۔ آہستہ آہستہ ہر سال نیو میں پانی مرتا رہا اور اس سال کثرت بارش نے مدعی کی خام عمارت کو جڑ بنیاد سے ہلا دیا - دیواریں پھٹ گئیں - لیکن جب ضرر نمایاں اور محسوس ہوا، مدعی کو حق نالش پیدا ہو گیا۔ فرض کیا جائے کہ ہر سال کچھ نہ کچھ پانی دیوار مدعی میں جذب ہوتا تھا، تو کیا مدعا علیہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ

ہم زاید از بیس سال یا زاید از چودہ سال سے مدعی کو ضرر پہنچاتے چلے آتے ہیں' لہٰذا اب اس بات میں ہم کو حق آسائش حاصل ہو گیا- ہرگز یہ جواب نہیں پیدا ہو سکتا ہے- فعل بیجا و ضرر انگیز کے مقابلے میں ہر ساعت نئی بنائے دعویٰ پیدا ہوتی رہتی ہے کہا جاتا ہے کہ سابق میں ان حوضوں پر سرکی کا چھپر پڑا رہتا تھا- مدعا علیہم کا جواب ہے کہ سرکی کبھی نہیں رہی- تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شروع ہی سے مدعی کی دیوار سے بے پروائی رہی- حوض میں کوئی موری نہیں ہے- ہر سال وہ پانی سے بھر جاتا ہو گا- اتنا فرق ہے کہ جب زیادہ بارش ہوئی اور پانی کی چادر حوض کے کناروں تک پہنچی تو ایک طرف اس نے مدعی کی دیوار میں دامن مارا- چھو جانا اور بات ہے اور علی الاتصال دامن مارنا دوسری بات ہے- اس سال کثرت سے بارش ہوئی- رات دن جھڑی لگی رہی- گھنٹوں نہیں پہروں بلکہ دنوں تک شب و روز سلسلہ بارش رہا- حوض میں چادر آب لہراتی رہی اور مدعی کی دیوار بھیگتی رہی- پھر کیونکر کہا جائے کہ اس واقعے سے دیوار کو کچھ اثر نہیں پہنچا- یہ سچ ہے کہ اگر وہاں حوض نہ ہوتا تب بھی مدعی کی دیوار پر پانی کا اثر پہنچتا- لیکن مدعی کی دیوار پر پرچھتی پڑی ہے - بالائی حصہ تو یوں محفوظ ہوا- رہا حصہ زیریں' پس مینہ کا زمین پر پڑنا اور اس سے چھلک کا پیدا ہونا دوسری بات ہے اور وہ بھی ایسی حالت میں کہ ایک جوف قائم ہو چکا ہو جو پانی جذب کرنے کو ہر گھڑی دامن پھیلائے ہے- ایک بری مثال بے خبر اور بے پروا ہمسایوں کے لیے قائم ہو گی' جن کی نیک دلی اور عام ہمدردی کے بھروسے پر باشندوں نے اپنے مکانات کی پشت دیوار کو چھوڑ رکھا ہے' جس کو نہ وہ دیکھ سکتے ہیں اور نہ اکثر مواقع پر بلا اہتمام خاص پہنچ سکتے ہیں- اگر میں اس مقدمے میں یہ کہہ کر مدعی کے دعویٰ کو ڈسمس کردوں کہ مدعا علیہم کیا کریں- کیا انہوں نے مدعی کی دیواروں کو شق کر دیا ہے؟ کیا وہ تمام رات خواب و خور چھوڑ کر پیانہ ہاتھ میں لیے حوض کا پانی اونچا کرتے؟ بیشک یہ جواب ہو گا کہ حوض کا پانی اونچنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس میں ایک موری کر دی جاتی' پانی جمع ہی نہ ہونے پاتا- مجھ کو مدعا علیہم کے ساتھ یقیناً ہمدردی ہے- انہوں نے عمداً کوئی فعل نہیں کیا- جو بات ہوتی آئی تھی' وہی ہوتی آئی- ان کو کچھ خیال بھی نہ تھا- لیکن مجھ کو تعجب ہوتا ہے جب یہ دیکھتا ہوں کہ اس حوض کے لبریز رہنے اور چھلکتے رہنے سے بجز اس کے کہ شاید کسی کو وہ تماشا خوش آتا ہو اور کچھ مقصود فائدہ نہ تھا- مچھلیوں کا پالنے والا بھی مدت ہوئی دنیا سے رخصت ہو گیا اور سالہا سال ہوئے مچھلیاں بھی نہ رہیں- پس اگرچہ یہ صحیح ہے کہ مدعا علیہم کو کچھ خیال نہ تھا اور ان کا کچھ فائدہ حوض کو لبریز رکھنے سے نہ تھا' لیکن ہمسائے کی دیوار کو جو ضرر پہنچ جائے قانون اس کا ذمہ دار کس کو کرے گا؟ سوائے اس کے

کوئی معقول جواب نہیں ہو سکتا کہ حوض کے مالک و قابض کو۔ یہ کوئی فوجداری نالش متعلق قانون تعزیری نہیں ہے جس میں علم اور ارادے کی بحث کو اہمیت حاصل ہو۔ اگر یہ منظر اور یہ ترکیب تعمیر معمولی ہوتی تو بے شک کہا جاتا کہ تغیرات فطرت اور آفت آسمانی پر ذمہ داری ہے۔ مدعا علیم نیچرل سلسلہ واقعات کے خلاف کوئی پیش بنی نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں ' یہ ترکیب تعمیر اور اس کا اس طور سے قائم رہنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ شاید مدعی کی نیک بختی تھی یا بے وقوفی یا عدم واقفیت کہ وہ تعمیر حوض کے وقت خاموش رہا۔ پس بلحاظ ان حالات کے میں تجویز کرتا ہوں کہ مدعا علیم کے ترک فعل سے مدعی کو ضرر پہنچا اور وہ مستحق ہرجہ پانے کا ہے۔

اب رہا یہ کہ کس قدر ہرجہ؟ تو بلا تامل میری رائے ہوتی ہے کہ جس قدر ہرجہ مدعی مانگتا ہے' گو اس کا اندازہ صحیح ہو' لیکن کل کی ذمہ داری مدعا علیم پر نہیں ہے۔ چبوترے پر پانی جمع رکھنے کی شکایت ثابت نہیں ہوئی اور اس طرف جو ضرر پہنچا ہے' ممکن ہے کہ صرف کثرت بارش اور جھڑی اور ہوا اس کی ذمہ دار ہو۔ حوض کی طرف جو ضرر پہنچا ہے اس کے وجوہ میں بھی طوفانی موسم نے کچھ حصہ لیا ہو گا اور پھر مدعی نے بھی شدید غفلت کی کہ آخر وقت تک گھر میں دبکا رہا۔ اس وقت چونکا جب دیواریں پھٹ گئیں۔ اس وقت وہ اڑوسیوں پڑوسیوں کو لے کر مدعا علیم کے مکان پر پہنچا اور واویلا شروع کی۔ ایک معمار نے جس کا اظہار کرایا گیا ہے' مدعی کو یقین دلایا کہ صرف جنوبی جانب سے (یعنی حد بر حوض میں) دیواروں کو ضرر ضرور پہنچا ہے' لیکن اس وقت مدعا علیم کیا کر سکتے تھے۔ ایک مستعد اور باخبر مالک مکان تو غیر معمولی بارش اور زور شور کے طوفان باد وباران میں پختہ مکانات کے کمروں اور چھتوں کو بھی دیکھتا پھرتا ہے۔ پھر کچے مکانات اور پرانی دیواروں سے ایسی تند جھڑی میں ' جس نے صدہا مکانات بلا مدد کسی حوض کے گرا دیے' غافل ہو بیٹھنا خود مدعی کی شدید غفلت کی دلیل ہے۔

بلحاظ جمیع حالات میں حکم دیتا ہوں کہ مبلغ تیس روپے کی ڈگری بمعہ خرچہ رسدی بحق مدعی صادر ہو۔ باقی دعویٰ مع خرچہ رسدی ڈسمس ہو۔ فقط

۸ اکتوبر ۱۸۹۸ء

دستخط (بزبان انگریزی)

سید اکبر حسین

نقل نولیس (بزبان انگریزی)

آر۔ آر۔ شیخ

ضمیمہ ۲

جوڈیشل سروس

اکبر کی عدالتی ملازمت کے متعلق قومی عجائب خانہ کراچی سے مجھے ایک تفصیلی نقشہ دستیاب ہوا ہے جو عشرت خلف اکبر حسین کا بنایا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس میں اکبر کی عدالتی ملازمتوں کی جو تفصیلات مہیا کی گئی ہیں ان میں سنین کے ساتھ ساتھ مہینوں اور تاریخوں کا خصوصی التزام کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ جب کبھی اکبر نے رخصت لی اس کی مدت اور تاریخ کا بھی قطعیت کے ساتھ تعین کر دیا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عشرت حسین نے جب یہ نقشہ مرتب کیا، اس وقت ان کے سامنے اکبر کی سروس بک تھی۔ یہ نقشہ اس لیے اور بھی اہمیت رکھتا ہے کہ "حیات اکبر" مولفہ عشرت حسین میں ملازمتوں کی بعض تاریخیں اس نقشے سے مختلف ہیں۔ مگر چونکہ "حیات اکبر" میں بیشتر جگہوں پر محض سنین درج کیے گئے ہیں اور مہینوں اور تاریخوں کو ترک کر دیا گیا ہے، اس لیے اس نقشے کو صحیح تر سمجھنا چاہیے۔ ان وجوہ کی بنا پر یہ نقشہ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:

نقشہ ملازمت جوڈیشل سروس حضرت اکبر:

۲۶ نومبر ۱۸۸۰ء کو : مصنف درجہ سوم (قائم مقام) مرزا پور، تین ماہ کے لیے۔

۱۲ مارچ ۱۸۸۱ء کو : قائم مقام منصف درجہ سوم ہمیر پور، ۲۰ دن کے لیے۔

۱۳ اپریل ۱۸۸۱ء کو : قائم مقام منصف بجنور۔

۶ مئی ۱۸۸۱ء کو : مستقل منصف بجنور درجہ دوم مشاہرہ تین سو روپیہ

(۱۱ مئی ۱۸۸۱ء سے ۲۰ مئی ۱۸۸۱ء تک رخصت بلا تنخواہ)۔

۳ ستمبر ۱۸۸۱ء کو : خورجہ ضلع بلند شہر کو تبدیلی ہوئی۔

۲۷ نومبر ۱۸۸۲ء کو : علی گڑھ منصفی حوالی کو تبدیلی ہوئی۔

۲۲ ستمبر ۱۸۸۴ء کو : منصف درجہ اول مشاہرہ ۴۰۰ روپے، علی گڑھ۔

(۵ جنوری ۱۸۸۸ء سے ۲۹ جنوری ۱۸۸۸ء تک رخصت میڈیکل سرٹیفکیٹ پر)۔

۱۰ اپریل ۱۸۸۸ء کو : قائمقام سب جج درجہ سوم، غازی پور۔

۲۱ اگست ۱۸۸۸ء کو : مستقل سب جج درجہ سوم۔

۲ مئی ۱۸۸۹ء کو : کانپور تبدیلی ہوئی۔

(۲۰ اپریل ۱۸۹۰ء سے ۱۹ مئی ۱۸۹۰ء تک رخصت رعایتی)۔

۱۵ نومبر ۱۸۹۰ء کو : ترقی درجہ دوم کی سب ججی پر مشاہرہ...(کانپور)۔

۳ دسمبر سے ۱۸ دسمبر ۱۸۹۰ء تک انچارج ڈسٹرکٹ و سشن جج کانپور بشمول سب ججی۔

۴ مئی ۱۸۹۲ء کو : جج خفیفہ آگرہ (ترقی) قائمقام۔

۲۲ اگست ۱۸۹۲ء کو : انچارج ڈسٹرکٹ و سشن جج آگرہ بشمول ججی خفیفہ۔

۳۱ اگست ۱۸۹۲ء کو : کانپور کی سب ججی پر واپسی۔

۲۴ اکتوبر ۱۸۹۲ء کو : قائمقام جج عدالت خفیفہ الہ آباد (ترقی)۔

۱۷ مارچ ۱۸۹۴ء کو : مستقل جج عدالت خفیفہ آگرہ۔

۱۱ مئی ۱۸۹۴ء کو : قائمقام ڈسٹرکٹ و سشن جج جھانسی۔

۱۲ دسمبر ۱۸۹۴ء کو : قائمقام جج عدالت خفیفہ الہ آباد۔

۵ اپریل ۱۸۹۵ء کو : قائمقام ڈسٹرکٹ و سشن جج جونپور۔

۲۳ دسمبر ۱۸۹۵ء کو : جج عدالت خفیفہ آگرہ و سب ججی۔

(۱۸ جنوری سے ۱۹ مارچ ۱۸۹۶ء تک رخصت رعایتی)۔

۲۹ اپریل ۱۸۹۶ء کو : ڈسٹرکٹ و سشن جج گونڈہ۔

(۱۵ ستمبر سے ۱۶ نومبر ۱۸۹۶ء تک رخصت میڈیکل سرٹیفکیٹ)۔

۱۷ نومبر ۱۸۹۶ء کو : جج عدالت خفیفہ آگرہ۔

یکم اکتوبر ۱۸۹۷ء کو : جج عدالت خفیفہ۔

۲۱ مئی ۱۸۹۸ء کو : امتیاز ذاتی کے طور پر "خان بہادری" کا خطاب عطا ہوا۔

۱۳ مارچ ۱۸۹۹ء کو : قائمقام ڈسٹرکٹ و سشن جج بنارس۔

۱۹ اپریل ۱۸۹۹ء کو : جج عدالت خفیفہ الہ آباد۔

۴ مئی ۱۸۹۹ء کو : قائمقام ڈسٹرکٹ و سیشن جج مین پوری۔

۳۱ جولائی ۱۸۹۹ء کو : قائمقام ڈسٹرکٹ و سشن جج الہ آباد۔

۲۴ اکتوبر ۱۸۹۹ء کو : جج عدالت خفیہ الہ آباد۔

۱۳ اپریل ۱۹۰۰ء کو	:	قائمقام ڈسٹرکٹ و سشن جج مرزا پور-
۲۹ اکتوبر ۱۹۰۰ء کو	:	جج عدالت خفیفہ الہ آباد-
۵ مئی ۱۹۰۱ء کو	:	قائمقام ڈسٹرکٹ و سشن جج سہارن پور-

(۲ ستمبر ۱۹۰۱ء سے ۲۱ نومبر ۱۹۰۱ء تک رخصت رعایتی)-

۲۲ نومبر ۱۹۰۱ء کو	:	جج عدالت خفیفہ الہ آباد-
یکم مئی ۱۹۰۲ء کو	:	قائمقام ڈسٹرکٹ و سشن جج جونپور-
۸ اگست ۱۹۰۲ء کو	:	جج عدالت خفیفہ الہ آباد-
۳ دسمبر ۱۹۰۳ء کو	:	ریٹائر (پنشن)-

ضمیمہ ۳

غیر مطبوعہ نثر

اس کتاب کے آخری باب میں بتایا گیا ہے کہ قومی عجائب خانہ کراچی میں اکبر کے بہت سے غیر مطبوعہ مکاتیب موجود ہیں۔ اس کے علاوہ وہاں سے ایک مختصر سا ترجمہ بھی دستیاب ہوا ہے۔ ذیل میں ان کے چند اہم غیر مطبوعہ خطوط درج کیے جاتے ہیں۔ اکبر کی انگریزی نثر کے نمونے پہلی مرتبہ پیش کیے جا رہے ہیں محولہ بالا انگریزی سے ترجمہ بھی پیش خدمت ہے:

(خط ۱)
(خط بعد ملاحظہ چاک(۱))

الہ آباد

۲۱ فروری ۱۹۱۳ء

عزیز از جان! سلمہ اللہ تعالی

میں نے جو تجویز پیش کی یعنی حسن نظامی صاحب ... (۲) سے واپس آئیں تو دو ایک دن کو میں جونپور ہو آؤں۔ خواجہ صاحب بھی ساتھ ہوں۔ معلوم نہیں تم نے کس نگاہ سے دیکھا۔ جونپور میں ایک بزرگ شاہ عبدالعلیم صاحب رہتے ہیں۔ بہت معمر ہیں۔ بڑے اہل دل ہیں فارسی اردو کے عمدہ شاعر ہیں اور پورے صوفی ہیں۔ خواجہ صاحب (سے(۳)) ان سے ملنے کا خیال بھی ہے، لیکن یہ خیال غالباً اتنا قوی نہیں کہ بلا میری تحریک کے صرف اس لیے وہ جائیں۔ کاش نواب عبدالمجید صاحب بھی اس زمانے میں وہاں ہوں تو خوب ہے۔ یہ خط پرائیویٹ ہے اور یہ بات ابھی تمھی تک رہے گی اور رئیس دلھن تک۔ اس لیے لکھتا ہوں کہ میرا مدعا یہ ہے کہ تم لوگ حور بانو کو دیکھ لو۔ تمہاری پھو بھیاں وغیرہما اس کی بڑی تعریف کرتی ہیں۔ خیر ان کی رایوں کے قطع نظر میں بھی سمجھتا ہوں کہ لڑکی

بہت پاکیزہ صورت ہے۔ دہلی کی زبان ہے' شریف ہے' یعنی سیدانی ہے اور اس کے خاندان کی شرافت مسلم ہے۔ ہاں یہ بات ہے کہ پیرزادوں کا خاندان ہے جو پرانی قبر کے مجاور ہیں۔ اگرچہ اس سے بڑی آمدنی ہے' لیکن یہ امر کیا مانع ہو سکتا ہے اگر اور اعتبارات سے قابل انتخاب ہو۔ بہرکیف یہ موقع کہاں ملتا ہے کہ لڑکی پیش نظر ہو۔ پس اگر بعد دیکھنے کے اور آپس کی گفتگو کے رائے قرار پائے اور رئیس دلھن پسند کریں تو دل میں خیال قائم کر لیا جائے اور آئندہ برتاؤ میں یہ امر ملحوظ رہے ورنہ خاموشی کے ساتھ قطع نظر کی جائے۔ یہ دیکھتا ہوں کہ اس لڑکی کے کوئی نہیں ہے۔ نہ ماں' نہ بھائی' نہ بہن۔ خواجہ صاحب بذات خود تو لٹریری طاقت سے بہت نمود کے آدمی ہیں اور آمدنی بھی معقول ہے جو وراثتاً" لڑکی کو پہنچے گی۔ اور ہزارہا مرید ہیں اور بڑھتے جاتے ہیں۔ لیکن ان کی ذاتی نمود انہی تک ہے۔ میں اس کے متعلق زبانی گفتگو کروں گا۔ کہاں تک لکھوں۔ ابھی ہاشم کی شادی کا خیال کرنا بہت قبل از وقت ہے۔ خدا جانے کیا حالات پیش آئیں۔ لیکن ہمیشہ ایسے مواقع پیش نظر نہیں ہو سکتے۔ اس سے خیال آیا کہ اگر رائے مستحکم ہو تو کسی قدر اظہار خیال کر دیا جائے' یعنی یہ کہ آئندہ ایسا ممکن ہے۔ میں نے اب تک مطلق اس امر کی نسبت اظہار خیال نہیں کیا' بلکہ بوجوہ چند در چند بجز اس کے کہ تم لوگوں سے پوری بحث ہو' کوئی خیال قائم نہیں کر سکا۔

اکبر حسین

(خط ۲)

۱۹-۱۱-۳

ڈیر عشرتی!

اس وقت کچہری میں بیٹھا ہوں۔ پونے تین کا وقت ہے۔ کام تو ختم کر چکا ہوں' لیکن آج بار کی طرف سے بطور یادگار کے گروپ لیا جائے گا۔ جملہ وکلا اور برآوردہ افسرس ہوں گے اور صاحب جج ضلع نے بھی براہ مہربانی شرکت منظور فرمائی ہے۔ مسٹر ڈیگ فوٹو گرافر ہوں گے۔ چار بجے کا وقت مقرر ہے۔ شاید میں تم کو لکھ رہا ہوں کہ ان لوگوں کا ارادہ یہ بھی ہے کہ آئل پینٹ تصویر لے کر کمرۂ عدالت میں مستقل یادگار کے طور پر لگا دیں۔ رخصتی ایڈریس تو اس وقت دیا جائے گا جب میں آخری اجلاس کروں گا۔ تم کو تعجب ہو گا کہ ۱۶ نومبر(۴) تاریخ معینہ کو میں کیوں نہ ریٹائر ہو گیا۔ بیشک یہی ہونا چاہیے تھا۔

معمول یہی ہے ہے کہ پیشتر سے انتظام کر دیا جاتا ہے' لیکن ہائی کورٹ نے آخر وقت تک انتظام نہیں کیا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس وجہ سے انتظام نہیں کیا کہ میں گورنمنٹ سے توسیع کی خواہش کروں۔ لیکن سال گزشتہ میں لفٹیننٹ گورنر صاحب سے صاف طور پر کہہ چکا کہ آئندہ توسیع پر اصرار نہ کروں گا۔ لہٰذا میں نے مناسب نہ سمجھا کہ ان سے کچھ کہوں کیونکہ میرا ہی بیان سن کر انہوں نے حکم قطعی صادر کیا تھا۔ شکایت چشم کی حالت نے بھی جرات نہ دلائی' لہٰذا میں نے گورنمنٹ سے کچھ نہیں کہا۔ قید و پابندی مجھے دشوار ہے' بچ میرے لیے اب بار ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عین تاریخ پر انتظام کیا گیا۔ لہٰذا میرے سکیسر بابو مختار صاحب شاید آئندہ ماہ حال میں آ سکیں گے۔ مجھ کو اس وقت تک کام کرنے کا حکم ہے۔ خیر پندرہ بیس دن کی اور توسیع ہے۔ تین چار سو روپے خلاف امید مل گئے۔ ہاشمی کا زخم ہنوز مندمل نہیں ہوا۔ بے چارہ مجبور بستر پر پڑا ہے۔ کبھی کسی تکلیف سے روتا اور شکایت کرتا ہے۔ امید ہے کہ آمدہ ہفتے میں لکھ سکوں گا کہ اب اس کو تکلیف نہیں رہی۔ کروٹ نہ بدل سکنا آفت ہے اور وہ تو اچھل کود کا مشتاق ہے۔ پھر بھی خدا کا شکر ہے کہ اگلی سی حالت نہیں ہے' بہتر ہے۔ تمہارے مضمون "ساخت مذہب" کا مشتاق ہوں۔ ارے بھائی! بار کا امتحان کب دو گے؟ کوئی کہتا تھا کہ عشرت بی۔ اے معمولی طور پر ہو گئے۔ کیا یہ سچ ہے؟

(دستخط ندارد)

(خط ۳)

۵-۱۱-۳۰

عشرتی!

کل عید تھی۔ کیا کہوں تمہارے بغیر کیسی گزری۔ تمہارا فوٹو لگا ہوا تھا۔ جو آتا تھا۔ تمہارا ہی ذکر چھیڑتا تھا۔ تم کو فائنل دینا ہو تو جلد دو اور جب تک پاس نہ ہو برابر دیتے رہو۔ نہایت نامناسب ہے کہ اب تم وہاں زیادہ توقف کرو۔ تمہاری ماں سخت پریشان ہیں اور لوگ خدا جانے کیا کیا کہتے ہیں۔ پرنس آف ویلز آگرے میں دربار کریں گے اور ملکہ وکٹوریا کی تصویر کھولیں گے۔ سر آرتھر اسٹریچی نے براہ مہربانی مجھ کو بھی اس کمیٹی کا ممبر بنایا تھا۔ اس سبب سے میری طلبی بھی دربار میں ہوئی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ بہ سبب شکایت چشم میں نہیں جا سکتا' ورنہ لوگ تو اس عزت اور لطف میں شریک ہونے کے لیے ہزاروں

روپے خرچ کرتے ہیں۔ خدا تم کو جلد لاوے تاکہ تمہارا مردہ اکبر زندہ ہو۔
امید ہے کہ حسب وعدہ تم نے دوسرے ہفتے میں لوگوں کو خط لکھے ہوں۔ میں اس ہفتے میں کچھ روپیہ بھیجتا لیکن انتظام نہ ہو سکا۔ غالباً اگلے ہفتے میں ایک ہزار اور بھیجا جائے۔ در حقیقت سخت مشکل ہے۔ تم بیرسٹری میں پاس ہو جاؤ اور تمہاری واپسی کا ٹھیک حال معلوم ہو تو قرضہ باآسانی کیا جا سکتا ہے۔ بہرکیف فکر کر رہا ہوں۔ لیکن اب تم قرضہ ہرگز نہ کرو۔ حد سے زیادہ صرف ہو گیا۔ تم نادان اور غافل ہو۔ بات نہیں سمجھتے۔

دعاگو

اکبر حسین

(یہ عجیب اتفاق ہے کہ تم نے اس ہفتے میں عربی طغرا کے کاغذ پر خط لکھا)۔

ترجمہ بیلیز ڈائجسٹ امامیہ :

ہندوستان کے مسلمان عموماً سنی حنفی ہیں، لیکن جو مقامات مسلمانوں کے عہد میں شیعہ گورنروں کے تحت میں تھے، وہاں بہت کچھ شیعوں کے طریق مروج ہیں۔ جب شیعہ خاندانوں میں حکومت موروثی ہو گئی اور پایہ تخت دہلی کی حکومت سے شیعہ گورنر آزاد ہو گئے تو شیعہ طریق کا رواج اور زیادہ ہو گیا۔ سلطنت اسلامی جہاں برائے نام رہ گئی اور دور و دراز مقام تھے تو مقامی حکومتوں کا اثر زیادہ ہوا۔ عرب میں مثل ہے : الناس علیٰ دین ملوکھم۔ چنانچہ ۱۴۹۹ء میں صفوی خاندان کے شاہ اسمٰعیل صفوی نے اشتہار دے دیا کہ ایران کا قومی مذہب شیعہ ہے۔ اودھ کے نواب، جو موروثی وزرا تھے، انہوں نے سلطنت کی اطاعت سے انحراف نہیں کیا تھا، لیکن غازی الدین حیدر نے بہ اشارہ برٹش گورنمنٹ خطاب بادشاہی اختیار کر لیا۔ لیکن قانون اہل سنت و جماعت برابر جاری رہا اور مفتی شرع سنی رہے۔ امجد علی شاہ کے وقت میں تبدیلی ہوئی۔ انہوں نے شیعہ مفتی مقرر کیا اور اس وقت عام قانون ملک شیعہ قانون ہو گیا۔ جن مقدمات میں دونون فریق سنی ہوتے تھے یا ایک فریق سنی اور ایک فریق ہندو، ان میں سنی قانون رہا۔ جب اودھ کا الحاق برٹش گورنمنٹ سے ہو گیا تو قوانین وراثت جاری ہوئے۔ ازدواج و وراثت وغیرہ میں شیعہ قانون رہ گیا۔ چونکہ شیعوں کی تعداد بڑھ گئی تھی لہٰذا ان کے قانون کا نفاذ زیادہ تھا۔ شیعہ کے معنی گروہ کے ہیں، لیکن مقصود حضرت علی کے گروہ سے ہے۔ شیعہ کے نزدیک حق خلافت اولین انہی کو تھا، اگرچہ از روئے وقوع کے وہ چوتھے ہوئے۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کی امامت کا حق حضرت علی کو اور ان کی اولاد کو تھا جو حضرت فاطمہ سے پیدا

ہوئی۔ پہلے امام حضرت علی، پھر حضرت امام حسن، پھر حضرت امام حسین، پھر علی عرف حضرت زین العابدین۔ لیکن حضرت زین العابدین کے انتقال پر گروہ میں اختلاف ہو گیا اور ایک جماعت نے حضرت زید ابن حضرت زین العابدین کو امام مانا اور وہ زیدی کہلائے۔ لیکن بڑا گروہ حضرت امام باقر ابن حضرت زین العابدین کے ساتھ ہوا۔ حضرت امام باقر کے قائم مقام صاحبزادے حضرت امام جعفر صادق ہوئے۔ حضرت امام باقر اور حضرت امام جعفر صادق بڑے آئمہ میں ہیں اور ان کا خاص قانون ہے۔ حضرت امام جعفر صادق نے اپنے بڑے صاحبزادے اسماعیل کو اپنا قائم مقام نامزد کیا، لیکن حضرت اسماعیل پہلے ہی انتقال کر گئے۔ تب انہوں نے اپنے دوسرے صاحبزادے حضرت موسیٰ کاظم کو نامزد فرمایا۔ اس دوسری نامزدگی سے شیعوں میں پھر اختلاف ہوا اور اس مرتبہ اختلاف عظیم تھا۔ ایک بڑے گروہ نے قرار دیا کہ حضرت امام جعفر صادق کو دوسری نامزدگی کا اختیار نہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے حضرت اسماعیل کے صاحبزادے کو امام مانا اور اسماعیلیہ کہلائے تاہم بڑا گروہ حضرت موسیٰ کاظم ہی کے ساتھ رہا۔ یہاں تک کہ بارھویں امام حضرت امام مہدی ہیں جو ان کے عقیدے میں ہنوز زندہ ہیں، لیکن مخفی ہو گئے اور بالآخر ظاہر ہوں گے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو شیعہ اثنا عشری کہتے ہیں، لیکن انہوں نے اپنا لقب مومن رکھ لیا ہے، یعنی ہمیں ایمان دار ہیں۔ شیعہ قانون پہلے کا ہے، کیونکہ حضرت امام ابو حنیفہ نے ابتدائی تعلیم فقہ حضرت امام جعفر صادق سے حاصل کی تھی۔ اگرچہ بعد کو ان کا جداگانہ مذہب ہوا، لیکن خاندان حضرت علی سے وہ ملے رہے۔ مگر یہ میل صرف پولٹیکل اور سیاسی تھا، ورنہ مسائل قانونی میں ان کے فتوے شیعہ قانون سے بہت مختلف ہیں۔

من مترجم—— مغربی مصنفوں نے بالاتفاق ہمیشہ یہ قرار دیا ہے کہ شیعہ سنی میں صرف پولیٹیکل اختلاف ہے۔ مذہب کا رنگ دیا گیا ہے واقعات مندرجہ بالا سے یہی امر صاف ظاہر ہے۔ لیکن ہجوم روایات اہل غرض نے مذہبی گروہ بندی کو مستحکم کر دیا۔ اخلاق و عادات میں نہ خلفا کی پیروی ہے نہ ائمہ کی۔ رسم اور بحث میں وقت کٹتا ہے۔ والعاقبتہ للمتقین۔

اکبر

۱۹۱۷- ۹- ۱۵

انگریزی خطوط :

(1)

Jaunpur,
Nover. 19th, 1895.

Dear Syed Ishrat Husain,

I wish to have the pleasure of seeing you. So you must come here on Saturday next by mail. Master Sahab will of-course accompany you.

You may return on Sunday night or afternoon. I am sorry that I cannot come there as there are no holidays and all the dates are filled with important cases. I however intend to come after the Ist, of Decer. Lala piare Lal is gazetted for Allahabad so I think I must have to go to Agra--- a prospect which I hope is not bad to you as you like the place. College is also there and then you will have an opportunity to pay visits to Aligarh as often as you could wish. You said nothing as to your mama's decision about the cow.

Inter ticket will do at least up to Moghal-Serai.It must be a return ticket. Your Ali Hasan dada is staying with me.

Affectionately yours,
S.A. Husain.

(2)
9.2.1905

Dear Ishrat,

Your promise to return "shortly" was made on 16th Decer. Viz nearly 2 months ago. I hope the word meant only a few months. I am afraid you are becoming out of touch with us. You are not very fond of your parents, Your wife and little Hashim. I could hardly ever dream of being so helpless and miserable in the declining age and failing health and light and finding my Ishrat the only consola tion of my life unavailable to support me, to encourage

me and releaving me from the anxities attending this worldly life. I write this with a view that if (God forbid) there be a lack of natural love and affection you may become alive to moral duties.

But the next moment I cherish the hope that Ishrati is as good, as loving, as obedient as ever. He is not losing time in vain. I thought you will go for the final-bar while in London but you say you did nothing of return. How is that?

In your former letter you expressed the hope to be free by Decer. To Khan Sahab you wrote you would be returing to India by the end of October. It is high time Ishrati for you to return to us.

Affectionately,
S. Akbar Husain.

(3)

مندرجہ ذیل انگریزی نظم اکبر نے عشرت کے انگلستان پہنچنے پر لکھ کر بھیجی۔ (ظاہر یوں کیا گیا ہے گویا یہ ہاشم کے جذبات ہیں):

Mirzapur,
Ganges Side,
7/6/1900

Bhai jan, Bhai jan, Dear Bhai jan,
How I wonder, where you'r gone,
My Bhai jan's eye had a tear.
On his separation from Hashim dear.
But in his heart he had no sort of fear
To England he sailed to enrich his brain,
The dignity of Papa's name to maintain.
Whether it was sea or gulf or bay,
Nothing could stand in Bhai jan's way.
And he calmly sailed on 12th of May
Bhai jan, Bhai jan, brave Bhai jan,
How I wonder where you'r gone.
When words are clear and thoughts sublime,
No need of metre, no need of rhyme.

Most affectionately, Obediently yours,

Little Hashim.

حواشی

۱۔ اکبر نے خط چاک کرنے کی ہدایت کی تھی مگر عشرت نے محفوظ رکھا۔
۲۔ کسی مقام کا نام جو پڑھا نہیں جا سکا۔
۳۔ یہ لفظ قیاساً" لکھا گیا ہے خط میں نہیں تھا۔ اس کے بعد کا فقرہ بھی بے ربط لگتا ہے۔
۴۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عام طور پر اکبر کی غلط تاریخ پیدائش ان کے سروس ریکارڈ کی وجہ سے لکھی جاتی ہے۔

ضمیمہ ۴

غیرمدون کلام

اکبر الہ آبادی کے وہ اشعار جو کلیات میں شامل نہ ہو سکے، یقیناً سیکڑوں کی تعداد میں ہوں گے۔ کلیات میں انہوں نے ابتدائی مشق کے دور کا کلام شامل نہیں کیا۔ ان کے مکاتیب میں بھی بیسیوں اشعار ایسے ہیں جو کلیات میں شامل نہیں ہو سکے۔ بہت سے شعر حکومت وقت کے خوف سے طبع نہ کرائے گئے اور سینہ بہ سینہ چلتے رہے۔ کچھ کلام ان کے بعض بزم نشینوں کے غلط یا صحیح مشوروں کی وجہ سے نظر انداز کر دیا گیا۔ کچھ کلام اخباروں یا رسالوں میں شائع ہوا، مگر ترتیب کلیات کے وقت نہ مل سکا۔ غرض اکبر کے کلام کا ایک خاصا حصہ اب بھی ایسا ہے جو کلیات میں شامل نہیں ہوا۔ اس سے باقیات اکبر کا ایک ضخیم مجموعہ تیار ہو سکتا ہے۔

اس کلام کے علاوہ مجھے نیشنل میوزیم کراچی سے اکبر کے متعدد اشعار ملے ہیں جو اب تک کہیں شائع نہیں ہوئے ان میں سے کچھ غیر مطبوعہ اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

ایک غزل کے چند اشعار:

یہ خاکسار وہ سرکش اسی سے خلق ہوئے
سکوں زمیں کے لیے، چکر آسمان کے لیے

تلاش عہدہ و منصب نہیں ہے کامل کو
ستون غیر ضروری ہیں آسماں کے لیے

نہیں ہے حاجت ڈگری و پاس عشرت کو
ستون غیر ضروری ہیں آسماں کے لیے

یہ دونوں عشق طلب ہیں، اسی سبب سے ہے
زمیں کے واسطے اشک، آہ آسماں کے لیے

ہماری عقل تو کوچے میں آن کے گم ہے
خرد حکیم کی ہو سیر آسماں کے لیے

حنا بھی پستی ہے زلفیں بھی بن رہی ہیں حضور
ذرا سنوں تو یہ تیاریاں کہاں کے لیے

متفرق اشعار:

پڑا ہوا ہوں در خانقاہ پر اکبر
خدا ملے نہ ملے روٹیاں تو ملتی ہیں

کیا حال بتاؤں اکبر کا کیا کرتے ہیں کیسے رہتے ہیں
یا باغ میں ٹہلا کرتے ہیں یا سوچ میں بیٹھے رہتے ہیں

کیا طعن؟ شیخ جن کا ٹٹو جو اڑ گیا ہے
حضرت کا بھی تو موٹر آخر بگڑ گیا ہے

کہتے ہیں کہ تم قوم سے قم کیوں نہیں کہتے
کہہ دو یہ مناسب ہے تو تم کیوں نہیں کہتے

جناب اقبال نے یہ پوچھا کہ بے خودی کی یہ مشق کیسی
کہا کسی نے حضور والا سبب جو اس کا ہے مجھ سے سنئے
خودی کو اتنا بڑھا دیا تھا کہ بعض صاحب خدا بنے تھے

اہل مغرب میں بھی دناون ہے
سچ ہے دنیا بڑی فساون ہے

کتاب اللہ کے ان ترجموں سے دین کیا ابھرے
مترجم جب کہ خود اک حاشیہ ہو متن دنیا کا
نہ ہو گا دین کا جب تک کہ زندہ ترجمہ اکبر
عمل سے غیر ممکن ہے کہ ٹپکے شوق عقبیٰ کا

ادبار بے خودی سے جو سازش میں مست ہے
اقبال اب خودی کی سفارش میں مست ہے
کار جہاں خدا کے ارادوں کا ہے مطیع
ہر ایک لیکن اپنی ہی خواہش میں مست ہے
اقبال اپنے بس کا نہیں' کیا کرے کوئی
اکبر فقط دعا و گزارش میں مست ہے

مندرجہ ذیل منظوم دعوتی رقعہ اکبر نے کسی عزیز منیر عالم کی شادی کے لیے لکھا تھا۔ اشعار کارڈ پر چھپے اور گم ہو گئے۔ ایک کارڈ خوش قسمتی سے عشرت کے پاس محفوظ رہا:

الحمد الواہب العطایا
ہنگام نشاط و عیش آیا
فرزند مرا منیر عالم
ہیں جس سے قلوب شاد و خرم
ذی علم و ذکی' سعید و دانا
اس کا مداح ہے زمانا
انشا پرداز و عاشق قوم
پابند صلوٰۃ و طاعت و صوم
صد شکر خوشی کی ساعت آئی
شادی اس کی قرار پائی
تیاری محفل طرب ہے
سامان جو چاہیے وہ سب ہے
آئیں اس جا بجا یہی ہے
احباب سے التجا یہی ہے
شرکت سے بڑھائیں میری عزت
خادم کی طرح کروں میں خدمت
اس بات پر اب ہے ختم کالم
ادنیٰ خادم وحید عالم

عربی سے تم اپنا منہ جو موڑو تو بڑھو
قرآن و نماز کو جو چھوڑو تو بڑھو
بس قوم کے لفظ سے سمجھ لو عزت
جمعیت مذہبی کو توڑو تو بڑھو

زندگی لاکھ کہے میں تمہیں خوش رکھوں گی
مطمئن کیا ہوں یہ جب موت سے ناواقف ہے

بہت جب تقاضا ہوا دوستوں کا — پئے نظم مضمون کمر میں نے باندھی
مگر رہ گیا ہو کے بس ایک مصرع — زہے لاٹ صاحب، زہے بھائی گاندھی

وہ بت خود پوچھتا ہے سچ بتا تیری طلب کیا ہے
بتاتا ہوں تو کہتا ہے خدایا یہ غضب کیا ہے
وہ مجھ سے پوچھتے ہیں سچ بتا تیری طلب کیا ہے
نہیں کھلتا کہ آخر اس تجاہل کا سبب کیا ہے

موت ہے انتظار پیری میں — زندہ در گور ہوں اسیری میں

عالم یاس میں بیٹھا ہوں جھکائے ہوئے سر
کس طرف کیجئے رخ، کوئی تمنا بھی تو ہو

بلینک ورس :

ساز فنا چھڑا ہے، روحیں گزر رہی ہیں
کچھ عمر پا کے گزرے وہ تو ہیں بول پورے
جو سرسری سدھارے وہ ہیں لطیف مینڈیں
معنی کا لطف اٹھائے کھولے جو گوش باطن
اللہ ہی کی جانب سب کا رجوع دیکھو

پہلی جنگ عظیم کے متعلق اشعار:

انگلش کے فلیٹ کو تھا ناحق چھیڑا
بھاگا آخر کو جرمنی کا بیڑا
دشمن رہیں تلخ کام بس ہے یہ دعا
اللہ کھلائے دوستوں کو پیڑا

خلاف مذہب و عقل اس کی یہ لڑائی ہے
کچھ اس میں شک نہیں جرمن کی شامت آئی ہے
وہ ہار جائے گا آخر کو قوم انگلش سے
گھٹا ابھی سے تباہی کی اس پہ چھائی ہے
تجارت اس کی جو تھی بند ہو گئی بالکل
دکاندار ہیں اور ہر طرف دہائی ہے
وہ خرچ کرتا ہے ایروپلین میں چندہ
اڑا رہا ہے غریبوں کی جو کمائی ہے

اکبر نے ذیل کی نظم ہاشم کے لیے اس وقت لکھی جب اس کی عمر تین سال تھی۔ عشرت کو ارسال کی اور ساتھ ہی یہ جملہ لکھا:

"کیوں صاحب! تین سال کے بچے کے لیے یہ عمدہ نہیں ہے؟"

طوطا بولا ٹیں ٹیں ٹیں
بکری بولی میں میں میں
چڑیا بولی چوں چوں چوں
کتا بھونکا بھوں بھوں بھوں
بطخ بولی تیوں تیوں تیوں
بلی بولی میوں میوں میوں
مکھی بولی بھن بھن بھن
پھرکی ناچی گن گن گن

ضمیمہ ۵

اودھ پنچ کے مضامین

جنوری ۱۸۷۷ء میں "اودھ پنچ" کے اجرا کے ساتھ ہی اکبر نے اس میں مضمون لکھنے شروع کر دیے تھے۔ یہ مضامین کیا ہیں؟ انہیں کسی ایک صنف نثر سے متعلق کرنا مشکل ہے۔ کوئی نثر پارہ انشائیہ ہے، کوئی سنجیدہ مضمون، کوئی مکالمہ، کوئی مکتوب--- اور بعض نثر پارے مختلف اصناف کا مجموعہ۔ یہ مضامین تعداد میں بہت زیادہ ہوں گے مگر مجھے اب تک جتنے مضامین دستیاب ہو سکے ہیں ان کی فہرست یہ ہے:

عنوان	تاریخ اشاعت
۱- امتحان امیدواراں مقام الہ آباد	۱۳ فروری ۱۸۷۷ء
۲- نکات موزوں	۱۰ اپریل ۱۸۷۷ء
۳- کارسپانڈنس	۱۷ اپریل ۱۸۷۷ء
۴- ٹیکس کی دم	۸ مئی ۱۸۷۷ء
۵- حدیث از مطرب و مے گو	۲۹ مئی ۱۸۷۷ء
۶- ایک افیونی کی جہالت	۵ جون ۱۸۷۷ء
۷- موافقت زمانہ	۳۱ جولائی ۱۸۷۷ء
۸- موافقت زمانہ (قسط دوم)	۷ اگست ۱۸۷۷ء
۹- عالم بالا کی پولٹیکل باتیں	۴ ستمبر ۱۸۷۷ء
۱۰- قانونی غلط فہمی	۱۱ ستمبر ۱۸۷۷ء
۱۱- سسرال کی گالی کا برا مانے سو بھڑوا	۲۵ ستمبر ۱۸۷۷ء
۱۲- لطیفہ عبرت انگیز و حکمت آمیز	۲۵ ستمبر ۱۸۷۷ء
۱۳- الہ آباد	۱۶ اکتوبر ۱۸۷۷ء

۱۴- لطیفہ	۸ جنوری ۱۸۷۸ء
۱۵- رقعہ ضروری	۸ جنوری ۱۸۷۸ء
۱۶- آزادی	۲۶ مارچ ۱۸۷۸ء
۱۷- کوئی کہتا ہے دیوانہ کوئی کہتا ہے سودائی	۶ اگست ۱۸۷۸ء
۱۸- خلاصہ عہد نامہ برلن	۲۷ اگست ۱۸۷۸ء
۱۹- جناب اودھ پنچ صاحب	۲۷ اگست ۱۸۷۸ء
۲۰- سوال و جواب	۱۲ نومبر ۱۸۷۸ء
۲۱- نیا مقدمہ	۱۷ دسمبر ۱۸۷۸ء
۲۲- تم بھی بر طرف یعنی حضرت خضر	۱۴ اپریل ۱۸۹۶ء
۲۳- چھپا رہے گا نہ احوال آسماں زنہار	۱۰ ستمبر ۱۸۹۶ء
۲۴- خدا غارت کرے ان موذیوں کو	۲۵ جون ۱۸۹۶ء
۲۵- طاعون گلٹی	۱۴ اپریل ۱۸۹۷ء
۲۶- تسلی سے دست برداری	جولائی ۱۸۹۷ء
۲۷- بعض ضروری ریمارکس	اگست ۱۸۹۷ء
۲۸- القاب تعزیری	اگست ۱۸۹۷ء
۲۹- آنسو نہ پئے جائیں گے اے ناصح ناداں	۷ جولائی ۱۸۹۸ء
۳۰- داغ اور ہیرا	اگست ۱۸۹۸ء
۳۱- داغی شعر	دسمبر ۱۸۹۸ء
۳۲- فلسفیانہ اوہام	اگست ۱۸۹۹ء
۳۳- بجز اونٹ کے سب سواریاں موقوف	۱۴ جون ۱۹۰۰ء
۳۴- پردۂ نسواں	جولائی ۱۹۰۳ء
۳۵- پردۂ نسواں	اگست ۱۹۰۳ء
۳۶- مذہب اور مولوی پہ گالی ہولی	جون ۱۹۰۴ء
۳۷- قوم سمجھی کہ بلندی میں بڑھی جاتی ہے	جون ۱۹۰۴ء
۳۸- پرنس کے ساتھ کالج میں شریک ہونے کی عزت	جون ۱۹۰۶ء
۳۹- بنی آدم اور بنی بوزنہ	اپریل ۱۹۰۸ء

ان مضامین کو از سر نو مرتب کر کے شائع کرنے کی ضرورت ہے- ذیل کی سطور میں ان

میں سے ایک مضمون نقل کیا جاتا ہے۔ "کلیات اکبر" جلد اول میں ایک عنوان یوں تحریر کیا گیا ہے: "۱۸۷۸ع کے ایک گم شدہ مضمون کے چند اشعار"(۱) یہ گمشدہ مضمون مجھے مل گیا ہے۔ مندرجہ بالا فہرست میں نمبر ۵ پر اسی مضمون کا عنوان درج کیا گیا ہے۔ سطور ذیل میں یہ مضمون مع اشعار ملاحظہ فرمائیے:

"حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت این معمہ را

ایک بوڑھا پیر فلک کا ساتھی' آفتاب کا ہمزاد' ستاروں کا رفیق حضرت آدم کو گودوں میں کھلائے ہوئے' بڑا قوی ہیکل' نہایت طویل و عریض' عالم کی فضائے لاانتہا کو گھیرے ہوئے شرق سے غرب اور شمال سے جنوب تک ہاتھ پاؤں پھیلائے پڑا ہے۔ خواب خرگوش میں خراٹے لے رہا ہے۔ گروہ گروہ مخلوق خدا اس کے گرد کھڑی ہوئی تماشا دیکھ رہی ہے۔ جب وہ کروٹ بدلتا ہے آندھیاں آتی ہیں' زلزلے محسوس ہوتے ہیں۔ پرانے پہاڑ غرق' نئے کہسار پیدا ہو جاتے ہیں۔ نئے نئے دریا' نئے نئے جزیرے ظاہر ہوتے ہیں۔ عالم تہ و بالا ہو جاتا ہے۔ اور جس طرف کروٹ لی ایک قوم کی قوم بندگان الٰہی کی اس کے نیچے دب جاتی ہے۔ اور جدھر سے کروٹ پھیری ادھر کی دبی ہوئی خلقت پھر از سر نو زندہ ہو کر حواس درست کر کے دوسروں کی مصیبت کی تماشائی بن جاتی ہے۔ یہ بیباک تغافل شعار یونہی کروٹیں لیا کرتا ہے اور ایک نہ ایک حصہ مخلوقات الٰہی کا اس کی ظالم کروٹوں سے ہمیشہ پسا رہتا ہے۔ جدھر ہاتھ پڑ گیا صفائی ہو گئی۔ جدھر خراٹا لیا ہوائے بربادی چل گئی۔ جدھر پاؤں پھیلایا' بیخ زمیں سے اکھاڑ ڈالا۔ اتنی خیریت ہے کہ حضرت ہمیشہ کروٹ لیتے ہیں۔ اس سبب سے بڑا حصہ خلقت خدا کا بچا رہتا ہے۔ اگر کہیں چت ہو جائیں تو قیامت ہی آجائے۔ آپ جانتے ہیں یہ کون صاحب ہیں؟ اے حضت! ان کو زمانہ کہتے ہیں۔ انہی کی کروٹوں کو انقلاب کہتے ہیں۔ جب یہ کروٹ بدلتے ہیں تو ایک قوم بار ادبار سے سبکدوش ہو کر اوج ترقی پر پہنچتی ہے۔ دوسری ترقی یافتہ قوم واقعات طبعی سے' جو بالضرور اور لامحالہ پیدا ہوئی ہیں' بتدریج کمزور ہو کر خفیض منزل دیکھتی ہے۔ گل خوش رنگ جفائے صرصر سہتا ہے۔ غنچہ دل تنگ رونق گلشن بن جاتا ہے۔ ہمتیں اپنے خون میں نہاتی ہیں' ہوسیں رنگ رلیاں مناتی ہیں۔ اے حضت! یہی ہیں کہ جب کروٹ بدلتے ہیں تو:

اک رنگ پہ پھریاں کوئی شے رہ نہیں جاتی
وہ شوکت و شان جم و کے رہ نہیں جاتی

یورپ کی ترقی کا چمکتا ہے ستارہ
توقیر عجم(۲) عظمت رے رہ نہیں جاتی
آہنگ طرب کے لیے چھڑتے ہیں نئے ساز
بلبل کے ترانوں میں وہ لے رہ نہیں جاتی
عالم کو لبھاتی ہیں پیانو کی صدائیں
دمسازی احباب کو نے رہ نہیں جاتی (۳)
رندوں سے بدل جاتی ہیں ساقی کی نگاہیں
وہ گردش پیمانہ و مے رہ نہیں جاتی
دلکش نظر آتا ہے بہت لفظ نومبر
تزئین رخ بہمن و دے رہ نہیں جاتی
گڈبائی کا غل مچتا ہے اطراف جہاں میں
تسلیم نہیں رہتی ہے، جے رہ نہیں جاتی
ہوتی ہے بہت سخت یہ منزل مگر اکبر
ہمت ہو تو پھر ناشدہ طے رہ نہیں جاتی

ان کا کروٹ بدلنا بھی بالکل مرضی الٰہی پر منحصر ہے۔ نہ کوئی وقت مقرر ہے، نہ کسی کے زور و تدبیر میں اثر ہے۔ ان کی دختر نیک اختر بی فصل صاحب تو البتہ ہر سال اوقات مقررہ پر نئے جلوے دکھا کر زمین کو منقلب، نباتات کو رد و بدل کیا کرتی ہیں، مگر یہ حضت تو کہیں سیکڑوں برس بعد ہاتھ پاؤں ہلاتے ہیں۔ ہاں یہ ہوتا ہے کہ جو دبی دبائی خلقت کبھی ان کی کشمکش سے نجات پا کر ابھرتی ہے، وہ بھی خیال کرتی ہے کہ ہماری قوت و تدبیر سے یہ بڑے میاں دوسری طرف لڑھک گئے ہیں۔ مگر یہ محض خیال ہی خیال ہے۔ زمانہ کسی کے ساتھ نہیں، سب زمانے کے ساتھ ہیں۔ ان کا جب جی چاہتا ہے تو پلٹتے ہیں:

دریا بوجود خویش موجے دارد
خس پندارد کہ این کشاکش باماست

راقم الف۔ ح۔ از الہ آباد

حواشی

۱- اکبر نے کلیات میں اس غزل کا سال تخلیق اندازاً ۱۸۷۸ء تحریر کیا تھا مگر اودھ پنچ میں اس کی اشاعت ۲۹ مئی ۱۸۷۷ء کو ہوئی۔

۲- کلیات میں "توقیر عرب" ہے۔

۳- کلیات میں "دمازی احباب گو..." والا مصرع اور "بلبل کے ترانوں میں" والا مصرع باہم تبدیل کر دیے ہیں۔

ماخذ

۱۔ اکبر الہ آبادی : کلیات اکبر، جلد اول، بزم اکبر کراچی، (۱۹۵۱ع)

۲۔ اکبر الہ آبادی : کلیات اکبر، جلد دوم سوم، بزم اکبر کراچی، (۱۹۵۲ع)

۳۔ اکبر الہ آبادی : کلیات اکبر، جلد چہارم، کتابستان الہ آباد، (۱۹۴۸ع)

۴۔ اکبر الہ آبادی : قطعات و رباعیات، جلد اول (مرتبہ احسان الحق بھیا)، بزم اکبر کراچی (۱۹۵۲ع)

۵۔ اکبر الہ آبادی : قطعات و رباعیات، جلد دوم (مرتبہ احسان الحق بھیا)، بزم اکبر کراچی۔ (ایضاً)

۶۔ اکبر الہ آبادی : فیوچر آف اسلام (ترجمہ)، میرٹھ (۱۸۸۴ع)۔

۷۔ اکبر الہ آبادی : گاندھی نامہ، کتابستان الہ آباد (۱۹۴۸ع)۔

۸۔ اکبر الہ آبادی : اکبر اور ریبرن (مرتبہ عشرت حسین)، کراچی (۱۹۶۴ع)۔

۹۔ اکبر الہ آبادی : رقعات اکبر (مرتبہ محمد نصیر ہمایوں) (۱۹۶۹ع)۔

۱۰۔ اکبر الہ آبادی : مکتوبات اکبر (بنام مرزا سلطان احمد)، مرغوب ایجنسی لاہور (س۔ن)۔

۱۱۔ اکبر الہ آبادی : مکتوبات اکبر (بنام مرزا ہادی عزیز) دائرۂ ادبیہ لکھنؤ (۱۹۲۲ع)۔

۱۲۔ اکبر الہ آبادی : مکاتیب اکبر (بنام عبدالماجد دریابادی) ۱۹۲۳ع۔

۱۳۔ اکبر الہ آبادی : حضرت اکبر حسین اور مہاراجہ کشن پرشاد کی خط و کتابت (مرتبہ خواجہ حسن نظامی) (۱۹۵۱ع)۔

۱۴۔ اکبر الہ آبادی : خطوط اکبر (بنام خواجہ حسن نظامی) س۔ن۔

۱۵۔ اکبر الہ آبادی : خطوط اکبر (بنام خواجہ حسن نظامی) س۔ن

۱۶۔ اکبر الہ آبادی : اکبر کے شب و روز (مرتبہ محمد رحیم دہلوی) مکتبہ رضیہ کراچی۔

۱۶۔ اقبال اور حکیم احمد شجاع : اردو کورس ساتویں جماعت کے لیے، لاہور (۱۹۲۴ع)۔

۱۷- اقبال، علامہ محمد : بانگ درا۔
۱۸- آل احمد سرور : نئے اور پرانے چراغ، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی (۱۹۵۷) بار سوم۔
۱۹- آل احمد سرور : تنقید کیا ہے؟ ایضاً (س۔ن۔)
۲۰- آل احمد سرور : تنقیدی اشارے، ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ (۱۹۵۵ء)۔
۲۱- اکرام، شیخ محمد : موج کوثر، فیروز سنز، لاہور (۱۹۶۹ء)۔
۲۲- امداد امام اثر : کاشف الحقائق، جلد دوم، مکتبہ معین الادب لاہور، طبع اول۔
۲۳- اسماعیل میرٹھی : کلیات اسماعیل (مرتبہ محمد اسلم سیفی) طبع اول۔
۲۴- باری : کمپنی کی حکومت، نیا ادارہ لاہور (۱۹۶۹ء)۔
۲۵- حالی : حیات جاوید، اکادمی پنجاب، لاہور (۱۹۵۷ء)۔
۲۶- خواجہ حسن نظامی : اتالیق خطوط نویسی، دہلی (نومبر ۱۹۲۹ء)۔
۲۷- دولت شاہ، سمرقندی : تذکرہ الشعرا۔
۲۸- رام بابو سکسینہ : تاریخ ادب اردو (ترجمہ محمد عسکری) نو لکشور لکھنؤ (۱۹۵۲ء)۔
۲۹- رضی کاظمی : انتخاب اودھ پنچ، لکھنؤ (۱۹۶۳ء)۔
۳۰- سید احمد خان، سر : مسافران لندن (مرتبہ اسماعیل پانی پتی)۔ مجلس ترقی ادب لاہور۔
۳۱- سید احمد خان، سر : مقالات سرسید (مرتبہ اسماعیل پانی پتی) جلد سوم مجلس ترقی ادب لاہور۔
۳۲- سید احمد خان، سر : مقالات سرسید (مرتبہ اسماعیل پانی پتی)، جلد چہارم، مجلس ترقی ادب لاہور۔
۳۳- سید احمد خان، سر : مقالات سرسید (مرتبہ اسماعیل پانی پتی)، جلد نہم، مجلس ترقی ادب لاہور۔
۳۴- سید احمد خان، سر : مقالات سرسید (مرتبہ اسماعیل پانی پتی)، جلد چہاردہم، مجلس ترقی ادب لاہور۔
۳۵- سید احمد خان، سر : اسباب بغاوت ہند۔
۳۶- سید احمد خان، سر : مکتوبات سرسید (مرتبہ اسماعیل پانی پتی)، مجلس ترقی ادب لاہور۔
۳۷- سجاد حسین انجم : نشتر (ناول) مرتبہ عشرت رحمانی، مجلس ترقی ادب لاہور۔
۳۸- سری رام، لالہ : خمخانہ جاوید، جلد اول، لاہور (۱۹۰۸ء)۔
۳۹- سید عبداللہ : بحث و نظر، لاہور (۱۹۵۲ء)۔

۴۰- شمس قیس رازی : المعجم فی معاییر اشعار العجم، لندن (۱۹۰۹ع)-

۴۱- شوکت سبزواری : نئی پرانی قدریں، کراچی (۱۹۶۱ع)-

۴۲- شفق عماد پوری : مجموعہ کلام اکبر (س-ن)-

۴۳- شاہ ولی اللہ : حجتہ اللہ البالغہ (مترجمہ عبدالحق حقانی)، جلد دوم-

۴۴- صفدر مرزا پوری : مشاطہ سخن، لاہور (۱۹۲۸ع)-

۴۵- طالب الہ آبادی : اکبر الہ آبادی، الہ آباد (س-ن)-

۴۶- طفیل احمد منگلوری : مسلمانوں کا روشن مستقبل-

۴۷- عشرت حسین : حیات اکبر، بزم اکبر کراچی، طبع اول (س-ن)-

۴۸- عشرت حسین : مسودہ حیات اکبر، (قلمی) (چند اوراق)، نیشنل میوزیم کراچی-

۴۹- عبدالجلیل : روح اکبر، بنگلور (۱۹۵۰ع)-

۵۰- عبدالحئی : گل رعنا، اعظم گڑھ (۱۳۶۴ھ)، بار سوم-

۵۱- عبدالماجد دریابادی : اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں، لکھنؤ (۱۹۵۴ع)-

۵۲- عبدالماجد دریابادی : خطوط مشاہیر (۱۹۴۴ع)-

۵۳- عبدالغفور نساخ : سخن شعراء-

۵۴- عبدالسلام خورشید : صحافت پاکستان و ہند میں-

۵۵- عبدالقادر سروری : جدید اردو شاعری، لاہور (۱۹۴۵ع)، بار سوم-

۵۶- علی حسنین زیبا : انتخاب وحید، انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی، (۱۹۳۹ع)-

۵۷- عابد علی عابد : اصول انتقاد ادبیات، مجلس ترقی ادب لاہور، (۱۹۶۱ع)-

۵۸- عبدالحق، مولوی : اردو زبان کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے اکرام کا حصہ-

۵۹- غلام حسین ذوالفقار : اردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر، لاہور (۱۹۶۶ع)-

۶۰- فیاض محمود : تاریخ ادبیات مسلمانان ہند و پاک، جلد چہارم، (اردو ادب) ۱۹۷۲ع-

۶۱- قمرالدین بدایونی : بزم اکبر، انجمن ترقی اردو ہند (دہلی) (س ن)-

۶۲- قرآن مجید-

۶۳- کلیم الدین احمد : سخن ہائے گفتنی، اشاعت دوم-

۶۴- محمود شیرانی، حافظ : تنقید شعرا لعجم-

۶۵- محمد حسنین جونپوری : گنج پنہاں، لاہور (۱۹۴۱ع)-

۶۶- محمد حسین آزاد : نیرنگ خیال، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور (۱۹۷۲ع)-
۶۷- محمد یحییٰ تنہا : مراۃ الشعرا، جلد دوم، لاہور (۱۹۵۰ع)-
۶۸- محمد نصیر الدین : معاشی تاریخ ہند، جلد دوم، حیدر آباد دکن، (۱۹۳۶ع)-
۶۹- محمد نجم الغنی : بحرالفصاحت، نو لکشور لکھنؤ (۱۹۲۴ع)-
۷۰- نظیر لدھیانوی (اصغر حسین خاں) : لسان العصر اکبر الہ آبادی، مکتبہ کارواں، لاہور-
۷۱- وزیر آغا، ڈاکٹر : اردو ادب میں طنز و مزاح، لاہور (۱۹۶۶ع)-
۷۲- ہادی رسوا، مرزا : امراؤ جان ادا، نیا ادارہ لاہور، اشاعت اول، (۱۹۵۶ع)-

لغت :

۷۳- فرہنگ اندراج-
۷۴- نور اللغات-
۷۵- فرہنگ عامرہ-

رسائل :

۷۶- علی گڑھ میگزین، اکبر نمبر-
۷۷- نگار پاکستان، اکبر نمبر، ۱۹۶۹ع-
۷۸- زمانہ، کانپور، ستمبر ۱۹۲۱ع-
۷۹- اودھ پنچ، لکھنؤ، مختلف شمارے-
۸۰- رسالہ اردو، کراچی (۱۹۵۲ع)-
۸۱- نگار، لکھنؤ، اصناف سخن نمبر-
۸۲- سوغات، کراچی، جدید شاعری نمبر-
۸۳- نقوش، لاہور، مکتوبات نمبر-
۸۴- نقوش، لاہور-
۸۵- نظام المشائخ، کراچی-
۸۶- قومی زبان، کراچی-
۸۷- مخزن، لاہور، مختلف شمارے-

مجموعے

مجموعہ مرزا ہادی حسن رسوا	مرزا ہادی حسن رسوا
مجموعہ مولانا راشد الخیری	مولانا راشد الخیری
ناول افسانے (تحفۂ شیطانی - ماہِ عجم - عروسِ کربلا - شاہین و دراج - دُرِ شہوار آفتابِ دمشق - مسلی ہوئی پتیاں - گوہرِ مقصود - بیلہ میں میلہ)	مولانا راشد الخیری
مجموعہ منشی پریم چند - گئودان، غبن، میدانِ عمل (ناول)	منشی پریم چند
مجموعہ منشی پریم چند (افسانے)	منشی پریم چند
مجموعہ عظیم بیگ چغتائی (افسانے)	تدوین صلاح الدین محمود
مجموعہ عظیم بیگ چغتائی (ناول)	تدوین صلاح الدین محمود
مجموعہ عظیم بیگ چغتائی (ناولٹ)	تدوین صلاح الدین محمود
مجموعہ عظیم بیگ چغتائی (داستان، مضامین، ڈرامے)	تدوین صلاح الدین محمود
مجموعہ راجندر سنگھ بیدی (افسانے، ناول، ڈرامے، مضامین)	تدوین صلاح الدین محمود
مجموعہ محمد حسن عسکری	محمد حسن عسکری
عسکری نامہ (افسانے - مضامین)	محمد حسن عسکری
مجموعہ عاشق حسین بٹالوی (تاریخ اور افسانہ)	عاشق حسین بٹالوی
مجموعہ ڈپٹی نذیر احمد	ڈپٹی نذیر احمد

Rs. 300.00

www.sang-e-meel.com

ISBN 969-35-0512-3
9 799693 505121